Riyasat Jammu O Kashmir Mein Urdu Novel
1947 ke Baad.

A Thesis Submitted to the University of Hyderabad in Partial Fulfillment of the

Requirements for the Degree Of

DOCTOR OF PHILOSOPHY IN URDU

By

Rahmatullah Mir

Reg. No. 12HUPH01

Supervisor

Dr. Arshia Jabeen

Department of Urdu
School of Humanities
University of Hyderabad
Hyderabad-500046
INDIA

June, 2017

DEPARTMENT OF URDU

UNIVERSITY OF HYDERABAD

DECLARATION

I hereby, declare that the research work presented in this thesis entitled **"Riysat Jammu O Kashmir Mein Urdu Novel: 1947 ke Baad" (Urdu Novel in Jammu and Kashmir: Post 1947)** has been carried out by me at Department of Urdu, School of Humanities, University of Hyderabad, Hyderabad, under the supervision of **Dr. Arshia Jabeen.**

I hereby, also declare to the best of my knowledge, that no part of this dissertation is earlier submitted, for the award of any research degree or diploma in full, or partial fulfilment in any other university. I hereby agree that my thesis can be deposited in Shodganga/INFLIBNET.

Date: **Signature**

Rahmatullah Mir
Reg. No. 12HUPH01

University of Hyderabad

(A Central University by an Act of Parliament)

Department of Urdu

School of Humanities

P.O. Central University, Gachibowli, Hyderabad-500046

CERTIFICATE

This is to certify that Mr. **Rahmatullah Mir** (Reg. No. 12HUPH01) has carried out the research work embodied in the present thesis under the supervision of **Dr. Arshia Jabeen**, for a full period prescribed under the Ph.D. ordinance of this university and also adhered to the UGC 2009 Ph.D. regulations. We recommended this thesis entitled **"Riyasat Jammu O Kashmir Main Urdu Novel: 1947 ke Baad" (Development of Urdu Novel in Jammu and Kashmir: Post 1947)** for the submission for the degree of Doctor of Philosophy in this University. The work is original and has not been submitted in part or full for any other degree or diploma of any other university.

Supervisor

Dr. Arshia Jabeen
Assistant Professor
Department of Urdu
School of Humanities, University of Hyderabad

Head

Department of Urdu
University of Hyderabad

Dean

School of Humanities
University of Hyderabad

This is to certify that the thesis entitled "**Riyasat Jammu O Kashmir Main Urdu Novel: 1947 ke Baad. (Development of Urdu Novel in Jammu and Kashmir: Post 1947**" Submitted by **Rahmatullah Mir** bearing registration number **12HUPH01** in partial fulfillment of the requirements for the award of Doctor of Philosophy in the **School of Humanities** is a bonafide work carried out by him under my supervision and guidance.

This thesis is free from plagiarism and has not been submitted previously in part or full to this or any other University or Institution for award of any degree or diploma.

Parts of this thesis have been:

A) Published in the following publications:

1) **Urdu Tehqeeq Mein Mawaad Ki Farhami: Masayil Aur Hal** (ISSN Number **2249-0639**), Journal: **Urdu Dunya Monthly, NCPUl, Issue, January 2014, p22.**

And,

B) Presented in the following conferences:

1) Presented research paper entitled "Mawaad Ki Farhami" in one day **National Seminar "Kawish"** in the Department of Urdu University of Hyderabad on 3rd July 2013.

2) Presented paper entitled "Sahir Ki Nazam Nighari" two day **National Seminar** in the Department of Urdu S.V University Tirupati on 27th February 2014.

Further the student has passed the following courses towards fulfillment of coursework requirement for PhD/was exempted from doing course work (recommended by Doctoral Committee) on the basis of the following courses passed during M.Phil. Program and the M. Phil. degree was awarded

Course Code	Name	Credits	Pass/Fail
1) HU701	Research Methodology	4.00	Pass
2) HU702	Practical Criticism	4.00	Pass
3) HU703	Textual Criticism	4.00	Pass
4) HU708	Dissertation	12.00	Pass

Supervisor **Head** **Dean**

Dr. Arshia Jabeen

Prof. Panchanan Mohanty

ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول: ۱۹۴۷ کے بعد

مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی

جون/۲۰۱۷

مقالہ نگار

رحمت اللہ میر

نگراں

ڈاکٹر عرشیہ جبین

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد

شعبۂ اردو، اسکول آف ہیومانٹیز

یونیورسٹی آف حیدرآباد

پیش لفظ ۴

باب اول: ریاست جموں وکشمیر کا سیاسی، سماجی وتاریخی پس منظر ۹

(الف) جغرافیائی پس منظر

صوبہ جموں

صوبہ کشمیر

صوبہ لداخ

(ب) سیاسی وتاریخی پس منظر

ماقبل اسلامی دور

سلاطین کشمیر کا دور

مغل دورِ حکومت

افغان عہد

سکھ شاہی دور

ڈوگرہ شاہی دور

باب دوم: ریاست جموں وکشمیر میں اردو اور ناول کی روایت ۴۶

(الف) جموں وکشمیر کا ادبی پس منظر ۴۷

اردو شاعری

اردو افسانہ

اردو ڈراما

تحقیق وتنقید

اردو صحافت

(ب) جموں وکشمیر میں اردو ناول کی روایت ۷۸

باب سوم: ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول: ۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۰ء ۸۸

راما نند ساغر

ٹھاکر پونچھی

حامدی کاشمیری

باب چہارم: ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول: ۱۹۶۰ء تا ۱۹۸۰ء ۱۵۰

علی محمد لون

وجے سوری

غلام رسول سنتوش

جان محمد آزاد

عبدالغنی شیخ

شبنم قیوم

نور شاہ

زینت فردوس

عمر مجید

باب پنجم: ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول: ۱۹۸۰ء تا حال ۲۳۰

جیوتیشور پتھک

ترنم ریاض

نعیمہ احمد مہجور

شبنم قیوم

فاروق رینز

اختتامیہ ۲۸۰

کتابیات ۲۸۶

پیش لفظ

ریاست جموں وکشمیر میں اردو سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ زبان یہاں کے تینوں خطوں: جموں، کشمیر اور لداخ میں یکساں طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔اس زبان کی لطافت وچاشنی سے جہاں ہر خاص و عام مانوس ومتاثر ہے وہیں اس کی ترویج واشاعت کی طرف بھی خاص توجہ دی جارہی ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو کی تقریباً تمام اصناف میں ادبی تخلیقات موجود ہیں۔ جہاں تک فکشن کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں ناول میں بھی یہاں کے فن کاردوں نے اچھے نمونے پیش کئے ہیں۔ آزادی کے بعد یہاں لکھے جانے والے ناول کافی اہمیت کے حامل ہے۔اس پس منظر میں ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول نگاری کی تاریخ کا جائزہ کافی دلچسپ موضوع ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں اگر چہ اردو ناول کی روایت زیادہ پرانی نہیں ہے لیکن یہاں پر کئی ایک اہم ناول لکھے گئے ہیں۔ یہاں کے ناول نگار مولوی نذیر احمد اور منشی پریم چند کے ناولوں سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ناول سے پہلے یہاں کی ادبی فضا میں افسانے کا راج تھا۔لیکن آزادی سے کچھ مدت قبل یہاں ناول کی روایت شروع ہوئی۔ اگر چہ یہاں کے ناول منشی پریم چند، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی کے ناولوں کے مقابلے میں مقبول نہیں ہیں لیکن پھر بھی یہاں لکھے جانے والے ناول اپنی ایک پہچان اور شناخت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ علاقائی ادب میں وہاں کے ادب کو اس لیے بھی اہمیت حاصل

ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف ادبی تاریخ کا حصہ ہوتے ہیں بلکہ اس ادبی روایت کو مضبوط اور مستحکم کرنے میں بھی اس صنفِ ادب کا اہم رول ہوتا ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اردو ناول کی تاریخ میں ریاست جموں وکشمیر میں لکھے جانے والے ناولوں کی بھی اہمیت ہے اور وہ اردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔

پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ لینے کے بعد میں نے ناول سے اپنی دلچسپی کا اظہار اپنی نگراں سے کیا تو انھوں نے ریاست جموں وکشمیر میں لکھے جانے والے ناولوں پر کام کرنے پر اپنی رضا مندی ظاہر کی۔ چونکہ ایم۔فل میں راقم نے ''غلام رسول سنتوش کی ناول نگاری'' پر کام کیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس موضوع سے میری دلچسپی قائم ہوئی۔ ریاست میں اردو ناول پر ابھی تک کوئی جامع کام نہیں ہوا ہے۔ اسی لیے میں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے اس موضوع کو **Selection Committee** کے سامنے رکھا۔ اس طرح میری نگراں اور دیگر اساتذہ کی منظوری سے میرے پی۔ ایچ۔ ڈی کا موضوع **''ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول: ۱۹۴۷ء کے بعد''** طئے پایا۔ اس سلسلے میں راقم نے حت المقدور کوشش کی ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں لکھے جانے والے تمام اہم ناولوں کے جائزے کے ساتھ ساتھ ناول نگاروں کے سوانحی حالات بھی معلوم ہوں۔

تحقیق کے اس کام کو احسن طریقے سے انجام دینے کے لیے مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ابواب کی تقسیم تاریخی اعتبار سے کی گئی ہے۔ مقالے کا پہلا باب **''ریاست جموں وکشمیر کا سیاسی، سماجی اور تاریخی پس منظر''** کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں ریاست کے تینوں خطوں: جموں، کشمیر اور لداخ کا تاریخی، سیاسی وسماجی پس منظر مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس باب میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح ریاست جموں وکشمیر مختلف ادوار میں بیرونی طاقتوں اور

بادشاہوں کے تسلط میں رہا جس نے یہاں کی لسانی وادبی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔

مقالے کا دوسرا باب **''ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب اور ناول کی روایت''** کے عنوان سے ہے۔اس باب میں مختلف ادوار میں ریاست جموں وکشمیر میں زبان وادب کی صورتِ حال کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس باب میں اردو زبان وادب کی ابتدااورارتقا کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔اس کے ساتھ ہی ریاست میں اردو ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرنے والے فنکاروں کا ایک سرسری جائزہ بھی لیا گیا ہے۔اس باب کے آخر میں ریاست میں اردو ناول نگاری کی روایت کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

مقالے کا تیسرا باب **''ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول: ۱۹۴۷ءتا ۱۹۶۰ء''** کے عنوان سے ہے۔اس باب میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء سے وابستہ ناول نگاروں کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے بعض اہم ناولوں کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

مقالے کا چوتھا باب **''ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول: ۱۹۶۰ءتا ۱۹۸۰ء''** کے عنوان کے تحت ہے۔اس باب میں ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء تک کے عہد سے وابستہ ناول نگاروں کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے اس عہد میں لکھے گئے اہم ناولوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مقالے کا پانچواں باب **''ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول: ۱۹۸۰ءتا حال''** کے عنوان سے رکھا گیا ہے۔اس باب میں اس دور کے چند اہم ناولوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

آخر میں مقالے کا ماحصل **''مجموعی جائزہ''** کے عنوان سے رکھا گیا ہے۔اس میں تمام ابواب کا محاکمہ پیش کرنے کی کوشش کی گی ہے۔

کوئی بھی اسکالر مقالے کی تکمیل کو صرف ذاتی محنت کا ثمرہ قرار نہیں دے سکتا۔اس کے نگراں

کی رہنمائی و تعاون کے بغیر کسی بھی مقالے کی تکمیل ممکن نہیں۔ اس لیے پہلے میں اپنی نگراں اور استاذی محترمہ ڈاکٹر عرشیہ جبین صاحبہ کا بے حد مشکور و ممنون ہوں کہ مجھے اپنی رہنمائی میں کام کرنے کا موقع دیا۔ انہوں نے بڑی فراخ دلی اور نہایت مخلصانہ و مشفقانہ رویہ کے ساتھ مقالے کی تکمیل میں میری رہنمائی فرمائی۔ ان کے مفید مشوروں کے بغیر اس کام کو تکمیل تک پہنچانا میرے لیے ناممکن تھا۔

میں سابق صدر شعبۂ اردو اور استاد محترم پروفیسر مظفر علی شہہ میری صاحب کا بھی سپاس گذار ہوں کہ انہوں اس مقالے کی تیاری کے دوران مجھے اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازا۔

اس کے ساتھ میں شعبے کے دیگر تمام اساتذہ کرام پروفیسر حبیب نثار، ڈاکٹر عبدالرب منظر، ڈاکٹر محمد کاشف، ڈاکٹر نشاط احمد، ڈاکٹر محمد زاہد الحق اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے وقتاً فوقتاً مجھے اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔

میں سابق صدر شعبہ اردو اور ایم۔فل کے نگراں پروفیسر بیگ احساس کا بھی سپاس گذار ہوں کہ انہوں نے دورانِ تحقیق میری رہنمائی کی۔ ان کی رہنمائی میرے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئی۔

اس کے علاوہ سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر محمد انور الدین کا بھی ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے جموں و کشمیر کے ناولوں پر تحقیقی و تنقیدی کام کرنے پر حوصلہ افزائی کی اور تحقیق کے ہر مرحلے پر رہنمائی کی۔

اس کے ساتھ ہی پروفیسر مجتبیٰ حسین صاحب کا بھی ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے دوران تحقیق مجھے اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔

اس کے علاوہ میں ان تمام اداروں اور لائبریریوں کے ذمہ داران کا بے حد مشکور و ممنوں ہوں جنھوں نے بنیادی و ثانوی ماخذوں کی فراہمی میں میری مدد کی۔ میں اپنے تمام دوست واحباب کا بے

حد شکرگزار ہوں کہ جنھوں نے دورانِ تحقیق میری مدد و رہنمائی کی۔ میں اپنے افرادِ خانہ خاص کر والدہ کا سپاس گذار ہوں کہ ان کی دعاؤں سے مجھ میں آگے بڑھنے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ یہ مقالہ ریاست جموں و کشمیر میں اردو ناول کی تاریخ اور روایت کو سمجھنے کی ایک ادنی سی کوشش ہے۔

رحمت اللہ میر

باب اول:

ریاست جموں و کشمیر کا سیاسی، سماجی اور تاریخی پس منظر

مشہور تاریخ داں ابنِ خلدون نے اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہر انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ ابن خلدون کے صدیوں بعد جرمنی کے ایک مشہور و معروف مفکر کارل مارکس نے انیسویں صدی عیسوی میں اس بات کو کچھ اس انداز سے پیش کیا:

> "It is not the consciousness of men that determines their social existance, but it is their social existence that determines their consciousness"

> ترجمہ: ''یہ انسانوں کا شعور نہیں ہے جو ان کے سماجی وجود کو متعین کرتا ہے بلکہ یہ ان کا سماجی وجود ہے جو ان کے شعور کو متعین کرتا ہے۔'' [1]

مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادیب بھی چونکہ اسی سماج کا فرد ہوتا ہے لہذا وہ جو ادب تخلیق کرتا ہے اس میں شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے سماج اور سماجی تاریخ کو جگہ دیتا ہے بلکہ نئی تاریخیت نے تو ادبی متن کو تاریخی اعتبار سے کافی بلند مقام عطا کیا ہے۔ کسی بھی ادبی تحریر کو ہم اس کے مخصوص علاقے کی جانکاری کے بغیر نہیں سمجھ سکتے۔ اس لیے ہم کشمیر میں لکھے گیے ناولوں کو تب تک نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ ہم وہاں کی جغرافیائی، تاریخی، سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ادبی تاریخ کو نہ

سمجھیں۔اس لیے آئندہ صفحات میں کشمیر کے ان ہی پہلوؤں کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے تا کہ ہمیں ان حالات و واقعات سے بخوبی آ گہی ہو جائے جن سے یہاں کے ناول نگار دوچار ہوئے۔

جغرافیائی پس منظر

کرہِ ارض کے کسی بھی خطے میں رہنے والے لوگوں پر وہاں کے تہذیبی وثقافتی حالات کے علاوہ جغرافیائی حالات کا اہم رول ہوتا ہے۔ یہی جغرافیائی حالات ان کا لباس، غذا، رہن سہن وغیرہ کو متعین کرتے ہیں۔اس لیے کشمیر کے تاریخی وسیاسی اور تہذیبی وثقافتی پہلوؤں کو سمجھنے سے پہلے یہاں کے جغرافیائی حالات کا مختصر جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ریاست جموں وکشمیر ہندوستان کے شمال میں واقع ہے۔اس ریاست کا جو رقبہ ۱۹۴۷ء میں مہاراجہ ہری سنگھ کے زیرِ تسلط تھا۔اس حساب سے اور ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے وقت ریاست کا کل رقبہ ۸۴۴۷۱ مربع میل تھا۔ [۲]

اس کی سرحدیں کئی ممالک سے میل کھاتی ہیں۔ریاست کی جنوبی سرحد پنجاب کی سرحدوں سے میل کھاتی ہیں اور شمال میں اس کی سرحدیں قراقرم سلسلے تک پھیلی ہوئی ہیں۔اس کے علاوہ ریاست کی سرحدیں ایک طرف روس اور چین سے جڑی ہوئی ہیں اور دوسری طرف پاکستان اور افغانستان سے۔ ان سرحدوں کو عبور کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ یہ سرحدیں سال بھر برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ زمانہ قدیم سے ہی یہ سرحدیں کشمیر کے لوگوں کے لئے محافظ رہی ہیں کیوں کہ بہت سے حملہ آوران سرحدوں کو عبور نہ کر سکے۔کہا جاتا ہے کہ سکندرِ اعظم نے ہندوستان پر جب حملہ کیا تو واپسی پر کشمیر سے

جاتے ہوئے اس کی فوج کا بڑا حصہ یہاں کی سرحدوں میں ہلاک ہوا کیوں کہ وہ یہاں کی سردی اور برف کا مقابلہ نہیں کر سکے۔

ریاست کا پورا نام اگرچہ جموں وکشمیر ہے لیکن اکثر اوقات اسے محض کشمیر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جب کہ کشمیر اصل میں اس ریاست کا ایک خطہ ہے۔ اس میں کئی اور خطے بھی شامل ہیں جیسے جموں، لداخ، بلتستان، گلگت، اور ہنزا۔ ریاست جموں وکشمیر کا ہر حصہ ہر اعتبار سے اپنی ایک الگ شناخت رکھتا ہے۔ ایک ہی ریاست کے حصے ہوتے ہوئے بھی ان میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ موسمی اعتبار سے، سماجی اعتبار یا پھر مذہبی اعتبار سے ان میں فرق نظر آتا ہے۔ یہاں پر مختصر طور پر ان تین خطوں کے بارے میں ذکر کرنا بہتر معلوم ہوتا ہے۔

صوبہ جموں

صوبہ جموں کا کل رقبہ ۱۲,۳۷۸ مربع میل ہے۔ اس صوبے کا ۲,۴۹۸ مربع میل پاکستان اور ۹,۸۸۰ مربع میل ہندوستان کے پاس ہے۔ اس وقت ہندوستان کے پاس جموں، ادھم پور، ریاسی، کٹھوعہ، راجوری، پونچھ اور ڈوڈہ ہیں جبکہ پاکستان کے قبضے میں میر پور اور کوٹلی کا علاقہ ہے۔[۳]

جموں ریاست کا اہم ترین خطہ ہے۔ یہ ریاست کی سرمائی راجدھانی بھی ہے۔ جموں کا علاقہ زیادہ دریائے توی سے متصل چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر واقع ہے۔ جموں شہر اپنے مندورں کی وجہ سے دنیا بھر میں مشور ہے۔ ڈوگرہ حکمران مہاراجہ رنبیر سنگھ کا بنایا ہوا 'رگھوناتھ مندر' اپنی خوبصورتی اور کارگری کی عمدہ مثال ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے حکم کے مطابق اس کا گنبد اور کلس سونے کا بنایا گیا ہے۔ جموں شہر میں اس کے علاوہ اور بھی کئی اہم مندر ہیں۔ اسی لیے اس شہر کو مندروں کا شہر (City of

Temples) بھی کہا جاتا ہے۔

جموں اگر چہ ایک خوبصورت شہر کا نام ہے لیکن کئی اور علاقے بھی اس کے دائرے میں آتے ہیں۔ دراصل جموں شہر کے علاوہ آس پاس کے تمام علاقے اسی شہر سے منسلک ہیں۔ ان علاقوں میں بسوہلی، رام کوٹ، رام نگر، ادھمپور، اکھنور اور بھمبر خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ تمام علاقے اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ اگر چہ یہاں پر اکثر لوگ ڈوگری زبان بولتے ہیں لیکن ایک اچھی تعداد گوجری اور پہاڑی بولنے والوں کی بھی ہے۔ یہ زبانیں کشمیری اور ڈوگری کی مرکب شکلیں ہیں۔

جموں کا علاقہ موسمی اعتبار سے اپنی منفرد شناخت رکھتا ہے۔ یہاں وادئ کشمیر کی طرح برف باری ہوتی ہے اور نہ ہی لداخ کی طرح جان نکال دینے والی سردی پڑتی ہے بلکہ اس علاقے کا موسم شمالی ہندوستان کی ریاستوں جیسے دہلی، پنجاب کی طرح ہوتا ہے۔ اپریل سے جون تک یہاں کافی گرمی پڑتی ہے اور جولائی سے ستمبر تک بارش ہوتی رہتی ہے۔ اکتوبر سے مارچ تک موسم کسی حد تک خوشگوار رہتا ہے۔ ان مہینوں کے دوران کشمیر سے لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد یہاں رہنے کے لیے آتی ہے۔

جموں کا علاقہ ڈوگرہ قوم کا مسکن ہے۔ اس خطے کو ڈوگرہ دیس بھی کہا جاتا ہے۔ ڈوگرہ عام طور پر میانہ قد و قامت کے لوگ ہوتے ہیں اور ان کا رنگ عموماً سانولا ہوتا ہے۔ لیکن عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ کھلے رنگ کی ہوتی ہیں۔ ڈوگروں میں راجپوتوں کی شکل وصورت اچھی ہوتی ہے اور یہ لوگ بہادر ہوتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا عام لباس شیروانی، کرتہ پائجامہ اور عمامہ لیکن آج کل اس کا رواج زیادہ نہیں ہے۔ البتہ دیہاتوں میں اب بھی پرانی تہذیب دیکھنے کو ملتی ہے۔ عورتوں کے لباس میں جمپر، چوڑی دار پائجامہ اور دوپٹہ ہوتا ہے۔ آج کل فراک، شلوار اور دوپٹے کا رواج عام

ہے۔

چونکہ ذات پات کی بنیاد پر سماج کی تقسیم کا رواج سالہا سال سے چلا آ رہا ہے جس کی وجہ سے نچلی ذات کے لوگ سماجی اور مذہبی ناروا داری کا شکار ہوتے آ رہے ہیں۔ لیکن اب چونکہ سماج میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں ان کے ساتھ بھی تعصب میں کافی کمی آئی ہے لیکن دیہاتوں میں یہ روایت اب بھی جاری ہے۔ دیہاتی لوگوں کا ذریعے معاش عام طور پر زراعت ہے۔

ڈوگرہ لوگ عام طور پر سبزی خور ہوتے ہیں۔ ہندو تو اس کی سختی سے پابندی کرتے ہیں لیکن مسلمان گوشت کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔ یہاں کی عام غذا میں روٹی، دال، سبزی اور چاول شامل ہے۔ شادیوں میں بھی قریب قریب ان ہی چیزوں کا استعمال ہوتا ہے۔ شادی بیاہ کی تقریبات خاصی دلچسپ ہوتی ہیں۔ دولہا جب دلہن کے گھر جاتا ہے تو ایک عجیب سماں بند جاتا ہے۔ رخصتی کے وقت دلہن کی سہیلیاں اور رشتہ دار عورتیں مختلف ڈوگری لوک گیت گاتی ہیں۔

صوبہ کشمیر

صوبہ کشمیر کا کل رقبہ ۸۵۳۹ مربع میل ہے۔ اس صوبے کا ۲۴۰۹ مربع میل علاقہ پاکستان کے اور باقی ۶۱۳۱ مربع میل ہندوستان کے قبضے میں ہے۔[۱۴] اگر چہ یہ علاقہ بقیہ دونوں صوبوں جموں اور لداخ سے کم ہے مگر اپنی قدرتی خوبصورتی کے باعث دنیا بھر میں مشہور ہے۔ حبیب کیفیوی وادیٔ کشمیر کی خوبصورتی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس حسین وجمیل وادی کی آغوش میں گنگناتی ہوئی ندیاں محوخرام ہیں۔ اس کی فضائیں نکہتوں سے معمور ہیں۔ یہاں پھولوں کے قافلے خیمہ زن رہتے ہیں۔ سنبلستانوں کی لطافتیں دعوتِ نظارہ دیتی ہیں۔ اس کے اونچے صنوبر، چنار اور

دیوداراس کی عظمت کے پرچم ہیں۔اس کے آبشار نغمہ باررہتے ہیں۔اس کے چشموں کا خنک اور شیریں پانی بمنزلہ آبِ حیات ہے۔'' [۴]

جموں سے شمال کی جانب پہاڑوں کا وسیع سلسلہ ہے اور ان ہی پہاڑوں کے وسیع وعریض سلسلوں کے درمیان وادیٔ کشمیر ہے۔ پیر پنچال سلسلے سے اس دلکش وادی کا حصہ شروع ہوتا ہے اور اس کی بلندی سطح سمندر سے کوئی چھ ہزار فٹ ہے۔وادیٔ کشمیر ریاست کے باقی تمام خطوں اور علاقوں سے الگ ہے۔اس کی اپنی ایک شناخت اور پہچان ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ ریاست کے باقی علاقے اس وادی سے دنیا میں مشہور ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

وادیٔ کشمیر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ماقبل تاریخ میں یہ خطہ ارض ایک بہت بڑی جھیل تھی۔جس کا نام 'ستی سر' تھا اور اس جھیل کے کناروں پر پشاچ اور ناگ قبائل کے لوگ آباد تھے۔ان کا سردار کشپ ریشی تھا۔جھیل کے وادی میں تبدیل ہونے کے متعلق کئی روایتیں ملتی ہیں۔ایک روایت یہ ہے کہ کشپ ریشی نے اس جھیل میں عبادت کی خاطر ایشور سے زمین مانگی اور ایشور نے دیوتاؤں کو بھیج کر پہاڑوں میں رخنے پیدا کئے۔ایک اور روایت یہ بھی ہے کہ کشپ کی التجا پر وشنو کے بھائی بلبھدر نے اپنے ہل کو پہاڑوں میں چلا کر پانی کی نکاسی کے لیے راستہ بنالیا اور بعد میں وشنو نے راکشس جل دیو کو مار ڈالا۔ چنانچہ جس جگہ پر پانی کی نکاسی ہوئی۔اس جگہ کو ورمول (بارہ مولہ) پڑ گیا اور کشپ ریشی کے نام کی مناسبت سے اس سرزمین کو 'کشپ مار' کہا جانے لگا اور یہی لفظ بگڑتے بگڑتے پھر کشمیر بن گیا۔بعض مصنفین کے نزدیک کشمیر نام نوحؑ کے بیٹے کش کی مناسبت کی وجہ سے ہے۔ چونکہ کش کی اولاد جہاں جہاں آباد ہوئیں انہوں نے اس جگہ کو اپنے جد کے نام سے منسوب کیا۔مثلاً 'کش' 'کشاں' کاشغر اور اسی طرح کشمیر۔کشمیر میں آباد ہانجی طبقہ خود کو نوحؑ کی اولاد سے منسوب کرتا ہے۔

مذکورہ بالا روایات اور بیانات کے علاوہ ماہرینِ ارضیات کے مطابق یہ خطۂ ارض سالہا سال زیرِ آب رہا ہے۔ان کے مطابق کرہ ارض کے گرد کچھ آتش فشاں پہاڑ تھے جن کی وجہ سے یہاں اکثر زلزلے آتے رہتے تھے۔ چنانچہ بعد میں ان زلزلوں کا آنا کم ہو گیا اور قریب بیس ہزار سال بعد جب جھیل سوکھ گئی تو وادی میں Karwas (وڈر) کریوے نمودار ہوئے جو پہاڑوں کی مٹی جھیل میں تہہ بہ تہہ بہنے سے بنتے رہے۔ یہ کریوے وادی کے حسن میں چار چاند لگاتے ہیں۔ابتدائی ایام میں یہاں کا موسم شدید سرد تھا اور سرما میں اتنی برف باری ہوتی تھی جو کافی مدت تک باقی رہتی تھی۔اس وجہ سے یہاں صرف خانہ بدوش Nomads گرما کے دوران آتے تھے اور سرما آنے سے پہلے ہی جنوبی علاقوں کی طرف ہجرت کرتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہاں کے موسم میں تبدیلی آتی رہی اور کشمیر ایک مستقل مسکن کے طور پر ابھرا۔

ستی سر جھیل کا پانی نکلنے کے بعد یہاں پر کئی چھوٹی چھوٹی جھیلیں وجود میں آئیں اور ان ہی جھیلوں کے آس پاس پہلے پہل بستیاں آباد ہوئیں۔کشمیر کے ابتدائی باشندوں میں ناگ اور پشاچ کا ذکر متعدد کتابوں میں ملتا ہے۔۔ وادی کے شمال میں ننگا پربت' مشرق میں ہرمکھ' جنوب میں پیر پنچال اور ان کے علاوہ یہاں کی جھیلیں اور دریا بے انتہا خوبصورت ہیں۔ وادی کشمیر کے ایک علاقے لولاب کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے کہا ہے:

پانی تیرے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب
مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بیتاب
اے وادیٔ لولاب ۵

وادیٔ کشمیر کے جنوب اور جنوب مغربی پہاڑی علاقوں کے باشندے پہاڑی کہلاتے ہیں اور

ان کی زبان پہاڑی ہے۔ان کے رسم ورواج میں کچھ پنجابی اور کچھ کشمیری عناصر شامل ہیں۔ یہ لوگ عموماً زراعت میں مشغول رہتے ہیں۔ یہ لوگ آریائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اوران کی زیادہ تعداد پونچھ، رجوری، کشتواڑ، بھدرواہ اور مظفرآباد میں آباد ہے۔ان کی اکثریت مسلمان ہے۔مردوں کے لباس میں چوڑا پاجامہ، کھلی کالروں والی قمیض، صدری، عمامہ اور عورتیں قمیض، شلواراور موٹا دوپٹہ استعمال کرتی ہیں۔کشمیر کے لوگوں سے قربت کی وجہ سے ان کے لباس میں فرن بھی شامل ہو چکا ہے۔ کھانے پینے میں بھی ان کی عادات کچھ کشمیریوں سے اور کچھ پنجابیوں سے ملتی ہیں۔

کشمیر کے پہاڑی علاقوں میں رہنے والوں کا ایک بہت بڑا طبقہ گوجر کا بھی ہے۔ یہ موسمِ گرما میں کشمیر کے پہاڑی علاقوں میں اپنے ریوڑ، گھوڑوں وغیرہ کو چراتے ہیں اور سردیوں کے ایام میں جموں کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ ان کی زبان گوجری ہے۔گوجروں میں ایک قبیلے خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے ہیں انہیں بکروال کہتے ہیں۔ڈاکٹر صابر آفاقی اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''گوجر قبائل شروع شروع میں ریوڑ پالتے تھے۔ پھر صدیوں کے بعد انہوں نے زراعت کا پیشہ اختیار کیا۔آج بھی گوجروں کا ایک طبقہ پاکستان اور کشمیر میں خانہ بدوشی کی زندگی گزارتا ہے اور بکروال کہلاتا ہے۔'' ۶

گوجر لوگ درازقد اور چھریرے بدن کے ہوتے ہیں۔ یہ بہت محنتی اور ایماندار ہوتے ہیں۔ گجر لوگ مذہبی ہوتے ہیں اوران کی زیادہ تعداد مسلمان ہیں۔تقریباً ہر کوئی داڑھی رکھتا ہے اور عورتوں کا لباس بھی کشمیر کے دوسرے حصے کے لوگوں سے قدرے مختلف ہے۔ ان لوگوں کی شادی بیاہ کی تقریبات سادہ ہوتی ہیں اور جہیز کی لعنت سے یہ لوگ دور ہیں۔

کشمیر کے وہ باشندے جن کی زبان کشمیری ہے کشمیر کے تینوں خطوں میں آباد ہیں لیکن اکثریت

کشمیر میں آباد ہے۔ یہاں کے لوگوں کی نسلی شناخت کو لے کر محققین نے کئی ایک آرا پیش کی ہیں۔ نیل مت پران اور راج ترنگنی کے مطابق یہاں پہلے پہل ناگ اور پشاچ آباد تھے۔ آریا قوم کی آمد کے ساتھ ہی وہ یہاں کی ناگ قوم سے برسرِ پیکار رہے۔ آریاؤں نے پوری کوشش کی کہ وہ ناگ قوم کی شناخت کو ختم کریں لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے بلکہ وہ الٹے ناگ قوم کے زیرِ اثر آ گئے۔ اس بارے میں ڈاکٹر ریاض پنجابی اپنے ایک مضمون "Kashmiriyat" میں رقمطراز ہیں:

> "The advent of the Aryans in Kashmir led to conflict and tension between them and Nagas. Initially, the Aryans made attempts to absorb the Nagas culturally; but having failed to do so , they started making compromises with Nagas by making adjustments with their culture, beliefs, traditions and customs." ے

بعض محققین اور مصنفین جن میں سر والٹر لارینس اور فرانس ینگ ہسبنڈ جو کہ کشمیر میں سرکاری کام کی وجہ سے کافی عرصہ تک رہے، کشمیر کے باشندوں کی شکل وشباہت، رنگ اور عادات و اطوار کی بنیاد پر ان کا بنی اسرائیل کے گم شدہ قبیلے سے بتاتے ہیں۔ اسی طرح ۱۹۵۲ء میں خواجہ نذیر احمد نے لاہور میں Jesus in Heaven on Earth نام کی کتاب میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تین ہزار دو سو سال قبل حضرت موسیٰ یہودیوں کے آخری گروہ کے ساتھ مصر سے کشمیر آئے تھے۔ انہوں نے کئی ایک اہم حوالوں سے اپنی بات مستند بنانے کی کوشش کی ہے۔

کشمیر میں شادی کے معاملے میں ذات، خاندان، کسب اور معاش کا حد سے زیادہ خیال رکھا

جاتا ہے۔کشمیر میں شادی بیاہ کی تقریبات اپنی ایک الگ پہچان اور شناخت رکھتی ہیں۔لذیذ پکوان تو ان تقریبات میں خاص اہتمام سے پکتے ہیں۔ یہاں پر جہیز کی بدعت کا نام ونشان نہیں تھا لیکن اب دھیرے دھیرے یہ کشمیری سماج میں پروان چڑھ رہا ہے اور ایک سنگین صورتِ اختیار کرر ہا ہے۔لیکن جہیز کے لیے لڑکے والوں کی طرف سے فرمائش نہیں کی جاتی۔ دوسری اہم بات کہ طلاق اور ایک سے زیادہ ازواج رکھنے کا رجحان کشمیر میں نہیں کے برابر ہے۔

مسلمانوں کے علاوہ پنڈتوں کی شادی کی رسومات ان کے دھرم کے مطابق ہی ہوتی ہیں۔ ذات، خاندان وکسب کا خیال رکھا جاتا ہے۔مسلمان اور ہندو شادی کے موقعوں پر ایک دوسرے کو دعوت دیتے ہیں۔ پرانے زمانے میں جب بھید بھاؤ نہ تھا تب مذہبی مقامات اور عبادت گاہیں قریب قریب ہوتی تھیں۔ یہ کشمیر کی مشترکہ تہذیب کی علامتیں ہیں۔ دراصل یہاں کے بزرگوں نے کافی دانشمندی سے لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ میل میلاپ سے رہنے کی تربیت کی تھی اور یہی وجہ ہے کہ یہاں کے آستانوں اور بزرگوں کی قبروں پر مختلف مذاہب کے لوگ آتے ہیں اور یہی چیزیں کشمیر کی ثقافتی پہچان کے طور پر جانی جاتی ہیں۔

کشمیر کے لوگوں کی خوبصورتی اور بناوٹ پر بھی بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ جی۔ایم۔ڈی ۔صوفی، کرنل الیکزنڈر ڈیو کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"The inhabitants are astonishingly
handsome and the women especialy
enchantingly beautiful." ۸

فارسی شعرانے بھی کشمیر کے لوگوں کی خوبصورتی، خاص کر حسنِ نسواں کو اپنے اشعار میں بڑی

خوبصورتی سے ڈھالا ہے۔خواجہ حافظ شیرازی نے اپنے دیوان میں صرف ترک وار کشمیری خواتین کی کھل کر تعریف کی ہے مثلاً:

ز شعر حافظ شیرازی گو یندوی قصد
سیہ چشمان کشمیری و ترکانِ سمرقندی

ایک انگریز جارج فارسٹر جو۱۷۸۳ء میں کشمیر بغرض تفریح آئے تھے۔ انھوں نے کشمیر کی خواتین کے حسن کو جنوبی فرانس یا اسپین کی خواتین کے حسن سے مشابہت دی ہے۔کشمیری حسن کا ذکر نہ صرف کشمیری شاعری کا حصہ رہا بلکہ اردو شعر وادب میں بھی اس نے جگہ بنائی ہے۔غرض کہ یہاں کے لوگ مرد ہو یا عورتیں اپنی خوبصورتی کے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔جس طرح یہاں کے قدرتی مناظر انسان کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں اسی طرح ان مناظر میں بسا حسن بھی قدرتی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔اسی لیے جب بھی کشمیر یا کشمیری لوگوں کا ذکر آتا ہے تو ساتھ ساتھ ذہن میں حسن کی نیرنگیاں انگڑائی لینے لگتی ہیں۔

کشمیری تہذیب میں یہاں کی غذا، پکوان اور لباس کا پہلے ہی ذکر ہو چکا ہے لیکن کشمیر کی مشروبات میں جو چیز قابلِ ذکر ہے وہ نون چائے اور کشمیری قہوہ ہے۔ دونوں کو سماوار میں رکھ کر پیالوں میں ڈالا جاتا ہے۔قہوہ اور وازوان میں زعفران کا بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ زعفران کا استعمال پنڈت خواتین سندور میں بھی کرتی ہیں۔

کشمیر کی ثقافت میں یہاں کی کاری گری کافی اہمیت کی حامل ہے۔ یہاں کے شال دوشالے اور قالین وغیرہ کے علاوہ پیپر ماشی، گل کاری، لکڑی پر نقش ونگاری عالمی سطح پر جانی جاتی ہے۔اس کے علاوہ کشمیر کی موسیقی بھی یہاں کی ثقافت کا ایک اہم جز ہے۔موسیقی کا چلن کشمیر میں زمانہ قدیم سے رہا

ہے۔ کشمیر میں موسیقی کے فن کو ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں عروج ملا اور اس فن پر کئی بہترین کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ اگر چہ اسلام میں موسیقی پر ممانیت ہے لیکن شہمیری دور میں یہاں موسیقی کو خوب ترقی ملی۔ کشمیر کے کئی سلاطین موسیقی پر کافی دسترس رکھتے تھے اور ان میں اہم نام کشمیر کے بد نصیب سلطان یوسف شاہ چک کا ہے۔ ان کی موسیقی سے محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی ملکہ حبہ خاتون نے ایک راگ 'راست کشمیری' ایجاد کیا۔

اس ماحول سے نہ صرف بڑے بڑے فنکار اور شعرا بلکہ کئی صوفی، ریشی، منی بھی پیدا ہوئے۔ شہمیری دور میں لل دید نے شیومت کا فلسفہ اپنی شاعری کے ذریعے بیان کیا اور دوسری طرف اسی دور میں شیخ العالم حضرت نورالدینؒ نے مذہب اسلام کی تبلیغ کی۔ شیخ العالم سے کشمیر میں ریشی سلسلے کی بنیاد پڑی۔ اس کے علاوہ انہوں نے کشمیری زبان میں شاعری بھی کی ہے۔ اسے شیخہ شرق کہتے ہیں۔ ان شرقی یا اشلوک میں آپ نے فلسفہ اسلام بیان کیا ہے۔ ان دونوں شخصیتوں نے کشمیری عوام کی سماجی اور ثقافتی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔

اس سماج میں زمانہ قدیم سے ایک تاریک پہلو بھی پایا جاتا ہے اور وہ ہے ان کی توہم پرستی۔ پنڈتوں اور پیروں نے اس چیز کو کافی ہوا دی۔ یہ اعمال اسلامی تعلیمات کے بالکل برعکس ہیں لیکن کشمیر میں ان کا خاصا چلن رہا ہے۔ ایسے میں ان فقیروں اور ملنگوں کی بھی کافی تعداد رہی ہے۔ صوفیوں اور پیروں کے کرتوں کے بارے میں ڈاکٹر جی۔ ایم۔ ڈی صوفی مرزا حیدر دغلت کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

" .... forever interpreting dreams displaying miracles and obtaining from unseen,

future or information, regarding either the

the past." ؏

کشمیر ہندو دورِ حکومت میں مجسمہ سازی کے فن میں عروج پر تھا۔ ماوتند، اونتی پورہ، پٹن، پری ہاس پورہ، وغیرہ کے آثار سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے۔لیکن اسلامی دور میں اس فن نے ایک الگ روپ اختیار کیا۔ اس دور میں محلات، مدرسے، مساجد، مقبرے اور خانقاہیں تعمیر ہوئیں اور جن میں اب بھی کئی باقی ہیں۔ یہ اور ان جیسی دوسری عمارتیں اپنے تقدس اور قدامت کے علاوہ فنِ تعمیر کا عمدہ نمونہ ہے۔

لداخ

ریاست کا تیسرا اہم جغرافیائی حصہ لداخ ہے۔ لداخ کے لغوی معنی 'چوٹیوں کا شہر'' ہے۔ انگریزی زبان میں Land of Passes کہا جاتا ہے۔لداخ کا پرانہ نام 'لگخ' La-Gakh تھا۔ 'لا' سے مراد چوٹی اور گخ سے مراد 'بہت ساری'۔ یہ نام بگڑتے بگڑتے لداخ ہوگیا۔قدیم زمانے میں یہاں پرلہا چھن Parhachan راجگان کا راج ۱۰۲۰ء سے لے کر ۱۵۳۲ءتک رہا۔۱۵۳۲ء سے ۱۸۲۰ءتک نمگیال Namgiyal راجاؤں کا راج رہا۔۱۸۳۳ء میں مہاراجہ گلاب سنگھ کی ڈوگرہ فوج نے اس پر قبضہ کرلیا۔۱۹۴۷ء میں یہ حصہ بھی آزاد ہوا اور ریاست جموں وکشمیر کا ایک اہم خطہ بن گیا۔لداخ ایک وسیع وعریض پہاڑی علاقہ ہے۔ اس کے شمال میں قراقرم، جنوب میں ہماچل پردیش، مغرب میں گلگت اور کشمیر جبکہ مشرق میں تبت اور چین کے ساتھ اس کی سرحدیں ملتی ہیں۔ اس طرح سے لداخ شمال میں کوہِ قراقرم اور جنوب میں ہمالیائی سلسلے کے درمیان بسا ہوا ہے۔ چونکہ لداخ کا چین، تبت، بلتستان، کشمیر، پاکستان، ہماچل پردیش اور ترکستان کے ساتھ تعلق رہا ہے اس

لیے یہاں پر ان ممالک کے اثرات پائے جاتے ہیں۔لداخیوں کا رہن سہن تبتیوں کا سا ہے۔لداخ کا کل رقبہ ۴۵۵, ۶۳ مربع میل ہے۔اس کا پورا علاقہ ہندوستان کے قبضے میں ہے۔گلگت اور بلتستان کا علاقہ پاکستان کے قبضے میں ہے۔ ۱۰

پرانے زمانے میں چونکہ سفر پیدل ہوتا تھا۔کہتے ہیں کہ سری نگر سے لداخ پہنچنے میں کم سے کم چالیس دن لگتے تھے۔سڑک کی تعمیر کے بعد سفر بہت آسان ہو گیا اور اسی سفر کو اب ایک یا دو دن میں گاڑی کے ذریعے پورا کیا جا سکتا ہے۔ پہلے سارا لداخ ایک ہی علاقہ تھا لیکن ۱۹۷۹ء میں اسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا، کرگل اور لہیہ۔لداخ کی کل آبادی دو لاکھ پانچ ہزار کے قریب ہے۔

لداخ ہر اعتبار سے ریاست کے بقیہ دونوں حصوں یعنی جموں اور کشمیر سے مختلف ہے۔موسمی اعتبار سے لداخ رہنے کے لیے اچھی جگہ نہیں ہے کیونکہ یہاں کے موسم تکلیف دہ ہوتے ہیں۔اکثر علاقے چھ مہینوں تک سردی اور برف کی شدید لپیٹ میں رہتے ہیں۔سرما میں لداخ سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنتا ہے۔بہر حال حقیقت جو بھی ہو لیکن یہ بات مسلم ہے کہ یہ علاقہ اپنی خوبصورتی کے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔

لداخ کے اکثر لوگ بدھ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں لیکن آبادی کا ایک اچھا خاصا حصہ مسلمانوں کا بھی ہے۔ یہاں پر بدھ مت کے کئی اہم گمپاGumpa موجود ہیں جیسے ہیمس گمپا(Hemus Gumpa) یہاں پر ایک الگ زبان ہے جس پر تبّتی زبان کے زیادہ اثرات ہیں۔اسے لداخی زبان کہتے ہیں۔گلگت میں لیکن زیادہ تر لوگ شینا زبان بولتے ہیں۔

لداخ کے کئی ایک علاقے ہیں جن میں بلتستان، دردستان، ہنزا، نگر، چلاس، یاسین اور گلگت شامل ہیں۔ان علاقوں میں رہنے والے لوگ تورانی نسل سے ہیں۔پست قد، چھوٹی ناک اور گال کی

ہڈی ابھری ہوئی ہوتی ہے۔سردی زیادہ ہونے کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کا لباس اونی ہوتا ہے۔ یہاں بھی مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی ہے پر یہاں شیعہ فرقے کے لوگ زیادہ پائے جاتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ بودھ مت دھرم سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں کے بودھ گوشت خور ہوتے ہیں۔ یہاں ہر جگہ گمپا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بودھوں کی شادی بیاہ کی تقریبات بالکل مختلف ہوتی ہیں۔

سیاسی وتاریخی پس منظر

کشمیری بحیثیت قوم ایک درخشاں تاریخ کے مالک ہیں۔مگر فطرتِ قانون کے تحت ایک طویل عرصے سے محکومی کا شکار چلے آرہے ہیں۔ ہماری محکومی کی بنیادی وجہ تاریخ کا مسخ ہوجانا ہے۔دنیا کے مفکرین بھی اس بات پر متفق ہے کہ اگر کسی قوم کو صفِ ہستی سے مٹانا ہو تو اس سے اس کی تاریخ چھین لو۔۱۹۴۷ء کے بعد سے ہماری تباہی اور بربادی کے لیے ہندوستان اور پاکستان نے کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔

کشمیر کی تاریخ کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ کیا کشمیر کی کوئی تاریخ ہڑپہ تہذیب Harrapan Civilization جیسی قدیم ہے؟ یہ کچھ ایسے سوالات ہیں جن پر ماہرین غور کررہے ہیں۔ریاست جموں و کشمیر تاریخی اعتبار سے کافی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔لیکن ریاست کے صیح تاریخی حالات بدھ مت کے عروج سے ہی ملنے لگتے ہیں اور یہ ساری معلومات ہمیں کلہن کی راج ترنگنی سے ہی ملتی ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ’’تیسری صدی قبل مسیح میں کشمیر گاندھرا دیس کا حصہ تھا جس کا صدر مقام ٹیکسیلا Taxila تھا اور جو سنسکرت علم وفن کا بڑا اہم مرکز رہا۔‘‘ [۱۱]

برزہامہ اور گوپھ کرال کے آثار کے بعد کشمیر کے تاریخی حالات بدھ مت کے عروج کے زمانے ملتے ہیں۔ چنانچہ پہلی صدی عیسوی میں بودھ مت کی چوتھی مجلس کشمیر میں ہارون کے مقام پر ہوئی تھی۔ جہاں اس کے کھنڈرات آج تک موجود ہیں۔اس مجلس میں بدھ مت کی نئی شاخ مہایان کی بنیاد پڑی۔ کشمیر میں بدھ مت کا زوال سہن راجہ مہرکل کے زمانے سے شروع ہوا۔ یہ بادشاہ خود شیومت کا پیروکار تھا اور بدھ مت سے سخت نفرت کرتا تھا۔اس نے بدھ مت کے ماننے والوں کو لاکھوں کی تعداد میں قتل کیا اور وہاروں کو مسمار بھی کیا۔

آٹھویں صدی عیسوی میں محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کیا۔اس وقت سے ہی کشمیر میں مسلمانوں کی آمد کا آغاز ہوتا ہے اور یوں آہستہ آہستہ ایک نئی تہذیب جنم لینے لگتی ہے۔ کشمیر کی تاریخ کو بہتر انداز سے سمجھنے کے لیے اس کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ ماقبل اسلامی تاریخ

۲۔عہدِ سلاطین

۳۔سلاطین کے بعد

۱. ماقبل اسلامی دور

اس دور میں یہاں ہندو اور بدھ مت کے ماننے والے راجاؤں نے حکومت کی۔نیل مت پران اور راج ترنگنی میں ہمیں سب سے پہلے جس حکمران کا ذکر ملتا ہے۔ وہ گونند اول ہے۔ پنڈت کلہن کے مطابق اس خاندان کا پہلا حکمران ۶۵۳ کالی میں تخت نشین ہوا۔ان کا دورِ حکومت ۲۰ سال پر محیط ہے۔گونند اول نے مگدھ کے راجا جراسندھ کی مدد کی اور واسودیو(کرشن) سے جنگ لڑی اور

اس لڑائی میں گونند مارا گیا۔ پھر اس کے بیٹے دامودر نے تخت سنبھالا۔ باپ کا بدلہ لینے کے لیے اس نے بھی کرشن سے جنگ لڑی لیکن وہ بھی مارا گیا۔ اس کے بعد اس کی رانی یشومتی تخت پر بیٹھی اور تب تک حکومت کا نظم ونسق چلاتی رہی جب تک اس کا بیٹا آدگونند جوان ہوا۔

بہرحال راجا گونند کے بعد کشمیر میں کس نے حکومت کی اس بارے میں وثوق سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ راج ترنگنی میں جن پینتیس ۳۵ راجاؤں کا ذکر آیا ہے ان کو اکثر محققین پانڈو مانتے ہیں۔ ان ۳۵ راجاؤں میں ۲۲ کے بارے میں تفصیلات پیر غلام حسن نے اپنی کتاب 'تاریخ شیخ حسن' میں جمع کی ہے۔ اس خاندان کے راجاؤں میں راجا رام دیو اور راجا سندسینا کافی مشہور ہیں۔ اس خاندان کے آخری راجا دامودر کے وقت ملکِ مغرب سے یہاں ایک شخص آیا جس کا نام سندیمان تھا۔ پیرزادہ حسن شاہ تاریخِ حسن میں ملا احمد کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں:

> ''دامودر راجا کی صورت مسخ ہونے کے بعد اس کا بیٹا نریندر ۱۸۱۸ کل یگ میں تخت نشین ہوا۔ چند روز گزرنے کے بعد سندیمان نام کا ایک شخص ملکِ مغرب سے کشمیر میں وارد ہوا جو بڑے ریشیوں میں سے تھا۔ از حد ریاضت کرنے کی وجہ سے اسے دربارِ خداوندی میں بڑا رتبہ حاصل تھا جس سے اس کا تخت ہوا میں اڑتا تھا اور جن اور جانوران کے تابع تھے اور وہ بھی ان کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ [۱۲]

غالب گماں ہے کہ یہ حضرت سلیمان علیہ تھے۔ کشمیر میں ان کے نام سے ایک پہاڑی بھی ہے جس کا نام سلیمان ٹینگ ہے۔

اس کے بعد گونند خاندان نے تقریباً ۱۸۶۲ کل یگ سے ۲۱۷ ق۔م تک لگ بھگ ایک ہزار سال سے زائد عرصے تک حکومت کی۔ اس دور میں ایک راجا مہر کل گذرا ہے جو شیومت کا پیروکار تھا اور بدھ مت کا مخالف۔ چنانچہ اس نے لاکھوں کی تعداد میں بدھ مت کے پیروکاروں کا قتل کر ڈالا اور

وہاروں کومسمار کیا۔کلہن نے اسے ایک جابر اور ظالم راجا کے روپ میں پیش کیا ہے۔ ١٣

گونندا خاندان کے راجا جب کمزور ہو گئے تو ابھیومنیو نام کا راجا تخت نشین ہوا۔اس خاندان کے ۲۸ راجاؤں نے کشمیر پر حکومت کی۔یہ خاندان اپنے آخری راجا کی وجہ سے انتظامی امور میں کمزور ہو گیا تو میگوان نامی خاندان نے حکومت پر قبضہ کرلیا۔اس خاندان کا سب سے اہم اور قابل بادشاہ بکر ماجیت تھا۔کشمیری کلینڈر بکرمی کا آغاز اسی راجا کے تخت نشین ہونے کے بعد ہوتا ہے۔اس سلسلے کا آخری بادشاہ درلب وردھن تھا۔درلب وردھن کارکوٹ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔اس طرح کشمیر میں کارکوٹ خاندان کی حکومت کا آغاز ہوا۔

درلب وردھن ۶۲۷ء میں کشمیر کا راجا بنا۔اس خاندان کے تقریباً ١٦ راجاؤں نے کشمیر پر حکومت کی۔جن میں سب سے مشہور و معروف للتادت مکتا پیڑ تھا۔کلہن نے اسے جگت راجا کے نام سے تحریر کیا ہے۔اسی طرح تاریخ حسن میں بھی اس کے بارے میں یوں درج ہے:

> ''.......بھائی کی حکومت کے دوران جو علاقے اس نے کھوئے ان پر پھر سے قبضہ جما لیا۔ملکی معاملات درست کرنے کے بعد اپنے ارادے کا جھنڈا لہراتے ہوئے بھاری فوجی تعداد اور سامان کے ساتھ چل نکلے اور پنجاب اور دلی فتح کیے۔ ١٤

للتادت مکتا پیڑ کے متعلق لکھا گیا ہے کہ اس نے قنوج، کلنگ، کرناٹک، بنگال کے علاوہ بہار پر بھی اپنی فتح مندی کے جھنڈے گاڑے۔للتادت مکتا پیڑ نے ہندوستان کے دیگر علاقوں کو بھی فتح کیا اور ان سے بیاج وصول کیا۔یہ وہ زمانہ تھا جب محمد بن قاسم نے سندھ پر چڑھائی کی تھی۔کارکوٹ خاندان کے بعد کشمیر کی حکومت خمار خاندان کے ہاتھ میں آئی۔اس خاندان میں راجا اونتی ورمن بڑے مدبر اور علم دوست شخص گذرے ہیں۔انہوں نے اونتی پور نام سے ایک شہر بھی بسایا جو آج بھی

اسی نام سے کشمیر میں رائج ہے۔اونتی ورمن کے زمانے میں کشمیر کافی خوشحال مملکت تھی،علم وادب میں بھی کافی آگے تھی۔علم وادب میں بھی کافی آگے تھا۔کئی اہم تاریخی کتابیں بھی لکھی گئیں۔ان تاریخی کتابوں کا تذکرہ کرتے ہوئے عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''رتنا گر پران کا مصنف رتنا گر اسی راجا کے عہد میں ہوا۔ایک اور اہم تصنیف جو اس زمانے میں لکھی گئی پنڈت کلٹ کی 'شیو پران' ہے جو کشمیری پنڈتوں کے لیے انجیل کا حکم رکھتی ہے'' ۱۵؎

اس خاندان کا آخری راجا شیر ورما تھا جس کو معزول کر کے یوشنکر کو تخت پر بٹھایا گیا اور یوں یوشنکر خاندان کی بنیاد پڑی لیکن اس خاندان کی حکومت صرف انیس یا بیس سال رہی اور سنگرام خاندان نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔اس خاندان کے ۲۲ راجاؤں نے کشمیر پر حکومت کی۔اسی دور میں محمود غزنوی نے کشمیر پر حملہ کیا۔مورخین کے مطابق یہ ۱۰۱۵ء کا واقعہ تھا۔سنگرام نے اپنی چالاکی سے محمود غزنوی کو تحائف دے کر واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا اور اس طرح یہاں کی عوام ایک بڑے حملے سے محفوظ رہی۔

اس خاندان کا آخری راجا سہہ دیو تھا۔راجا سہہ دیو کے دورِ حکومت کو کشمیر کی تاریخ میں کافی اہمیت حاصل ہے کیونکہ ان کے دور میں تین اہم شخصیتیں کشمیر میں وارد ہوئیں۔جن میں شاہ مرزا،والی تبت کا بیٹا رنچن شاہ اور دردستان کا ایک سردار شنکر چک۔ان تینوں نے راجا کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھا کر حکومتی نظام میں دخل اندازی کی۔

مورخین کے مطابق ۱۳۲۰ء یا ۱۳۳۲ء میں ذوالقدر خان، جسے عرفِ عام میں 'ذولجو' کے نام سے جانا جاتا ہے، نے کشمیر پر حملہ کر دیا۔سہہ دیو اپنی جان بچا کر بھاگ گیا اور رعایا کو ذولجو کے رحم وکرم پر

چھوڑ دیا۔ افراتفری کا ماحول پیدا ہوا۔ کئی کوہستانی قبیلوں کے لوگوں نے بھی کشمیر میں لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ لیکن رنچن شاہ اور شاہ میر نے نہایت دانائی سے اس فتنے کو رفو کیا۔ اس دوران رنچن نے حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور سہہ دیو کے وزیر رامچند ر کی بیٹی کوٹا رانی سے شادی کی۔ رنچن شاہ بدھ مذہب کا پیروکار تھا۔ اسے اپنے مذہبی عقائد کے بارے میں تذبذب پیدا ہوا۔ عبدالقادر سروری اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''رنچن شاہ بدھ مت کا پیروکار تھا لیکن کشمیر میں اسے اسلامی علماء اور زاہدوں کے ساتھ ربط کا موقع ملا تھا.......کوٹا رانی اسے ہندو عقائد قبول کرانا چاہتی تھی لیکن رنچن ہندو مذہب کا قبول کرنے پر تیار نہیں تھا۔'' ۱۶

چنانچہ مختلف مذاہب کے عالموں کو بلایا گیا تا کہ رنچن شاہ کو قائل کر سکیں۔ لیکن رنچن شاہ ان سب سے مطمئن نہ ہو سکا۔ آخر ان کو خبر ملی کہ یہاں ایک نیا مذہب بھی پھل پھول رہا ہے۔ رنچن نے اس مذہب کے ایک عالم جناب سید شرف الدین المعروف بلبل شاہ سے ملاقات کی۔ رنچن بلبل شاہ سے کافی متاثر ہوا۔ ان کے ہاتھوں پر اسلام قبول کیا اور سارے اہل وعیال کو بھی اسلام قبول کرنے کی تلقین کی۔ بلبل شاہ نے ان کا نیا نام سلطان صدرالدین رکھا اور یوں کشمیر میں سلاطین دورِ حکومت کا آغاز ہوا۔

۲.سلاطینِ کشمیر کا دور

سلطان صدرِالدین نے تین سال سے کم عرصہ تک حکومت کی۔ ان کے بعد سہہ دیو کے بھائی ادون دیو نے ۱۳۲۳ء سے ۱۳۳۸ء تک کشمیر میں حکومت کی۔ اس کی موت کے بعد کوٹا رانی نے تین ماہ تک حکومت کی۔ اسی دوران شاہ میر نے اپنی بادشاہی کا اعلان کیا اور سلطان شمس الدین کے نام سے

کشمیر کی باگ دوڑ سنبھالی۔ یہیں سے شہہ میری دور کا آغاز ہوتا ہے جسے ہم عہدِ سلاطین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس خاندان کے کل ۲۵ بادشاہ ہوئے اور تقریباً سوا دو سو برس کشمیر پر حکومت کی۔ شہہ میری سلاطین کے دورِ حکومت میں کشمیر میں ایرانی تہذیب کی نشو ونما ہوئی۔ اس دور میں یہاں کی علمی و ادبی زبان فارسی تھی اور حکومت کا کام کاج بھی اسی زبان میں ہوتا تھا۔ اس دور میں ایک طرف لوگ فارسی سے قریب ہوتے گئے اور دوسری طرف کشمیری زبان میں شیخ نورالدین نورانی (کشمیری زبان کا مشہور شاعر) اور لل دید (کشمیری زبان کی مشہور شاعرہ) نے شعر وشاعری کی ابتدا کی۔

شہہ میری سلاطین میں ایک نام ایسا بھی ہے جس نے نہ صرف شہہ میری سلطنت کو وقار بخشا بلکہ کشمیر کی تاریخ میں ایک سنہرا باب رقم کیا۔ ان کا نام سلطان شہاب الدین تھا اور کشمیر پر ۱۴۲۰ء سے ۱۴۷۰ء تک تقریباً ۵۰ برس حکومت کی۔ اس دوران انھوں نے کشمیر کو ہر اعتبار سے ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ زین العابدین کو کشمیر کے لوگ عرفِ عام میں 'بڈ شاہ' کہتے ہیں۔ اس کے عہد کو کشمیر کی تاریخ کا زریں دور سمجھا جاتا ہے۔ وہ لوگ جو سلطان سکندر بت شکن کے دور میں کشمیر سے بھاگ گئے تھے، انہیں واپس بلا لیا گیا۔ جن لوگوں کے مذہب زبردستی تبدیل کئے گئے تھے، انہیں بھی اپنے اپنے مذاہب دوبارہ اپنانے کی اجازت دے دی۔ ڈاکٹر جی۔ ایم۔ ڈی صوفی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "Shihab-ud Din's reign represents the most glorious period of the sovereingnty of the sultans of Kashmir.......Deer eyed women attracted not his mind nor the pleasures of drinking nor the light of moon "

ترجمہ: ''شہاب الدین کا دورِ اقتدار کشمیر کے سلاطین کے اقتدارِ اعلیٰ کے سب

سے تابناک عہد کی نمائندگی کرتا ہے۔۔۔۔۔۔۔غزال نما آنکھوں والی عورتیں، مئے نوشی کی لذتوں اور نہ ہی چاند کے نور نے ان کے ذہن کو اپنی طرف منعطف کیا'' ۱۷

عبدالقادر سروری ذین العابدین کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سلطان ذین العابدین بڈ شاہ شہہ میری خاندان کا گلِ سرسبد مانا جاتا ہے۔ وہ اچھا جنرل تھا۔ اور اسے اچھا ماہرِ نظم ونسق اور سب سے بڑھ کر وہ علم وفن کا سرپرست تھا۔ وہ عربی اور فارسی میں شعر کہتا تھا۔'' ۱۸

شہہ میری سلاطین کے دور حکومت کا سب سے اہم واقعہ حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کی تشریف آوری ہے۔ آپؒ سلطان شہاب الدین کے دورِ حکومت (۱۳۵۴ء-۱۳۷۳ء) میں یہاں تشریف لائے اور اسلام کی تبلیغ کا کام شروع کیا۔ آپ کی تبلیغ، کردار، عمل اور سادگی کو دیکھ کر لوگ بڑی تعداد میں اسلام کے دائرے میں داخل ہوتے گئے۔ حضرت امیر کبیرؒ سات سو (۷۰۰) اسلامی مبلغین کو لے کر کشمیر آئے تھے۔ انھوں نے کشمیر کے کونے کونے میں اسلامی تعلیمات کو عام کیا۔

حضرت امیر کبیرؒ کی مدح علامہ اقبالؒ بہترین انداز میں یوں کرتے ہیں:

سید السادات سالارِ عجم
دست او معمار تقدیر امم
خط را آں شاہ دریا آستین
داد علم و صنعت و تہذیب و دین
آ فرید آں مردِ ایرانِ صغیر
با ہنر ہائے غریب و دل پذیر

حامدی کاشمیری ایک جگہ اس مردانِ خدا کے بارے میں لکھتے ہیں:

''تواریخِ کشمیر کا ایک اہم ترین واقعہ آٹھویں صدی ہجری میں وادیٔ کشمیر میں شاہِ ہمدان امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کا ورود مسعود ہے۔ ان کے اور دیگر سادات کے مذہبی اور روحانی مشن کی تبلیغ کے نتیجے میں اہلِ کشمیر کی سیاسی، مذہبی اور روحانی مشن کی تبلیغ کے نتیجے میں اہلِ کشمیر کی سیاسی، مذہبی اور سماجی زندگی میں تاریخ ساز انقلاب پیدا ہوا۔ لوگ روشن خیالی، آزادی، ترقی اور ذہنی کشادگی کی نعمتوں سے آشنا ہوئے۔'' ۱۹

شہہ میری خاندان کے آخری بادشاہ نہایت ہی کمزور ثابت ہوئے۔ حکومتی نظم و نسق اور وارثوں کی آپسی رسا کشی کی وجہ سے حکومت کمزور سے کمزور تر ہوتی گئی۔ مورخین کا ماننا ہے کہ ۱۵۵۲ء میں دولت چک نامی شخص نے نازک شاہ کو تخت سے بے دخل کر کے خود حکومت کی عنان اپنے ہاتھوں میں لے لی اور یوں کشمیر میں شہہ میری سلاطین کا دورِ حکومت ختم ہوا اور چک خاندان نے حکومت کی عنان سنبھالی۔ یہ دور بھی افراتفری کا تھا۔ حکومت کی آپسی خانہ جنگی کی وجہ سے عوام تنگ آ چکی تھی۔ نیز چک حکمران عقیدے کے لحاظ سے شعیہ تھے۔ انہوں نے فرقہ پرستی سے کام لے کر سنیوں کو مختلف

طریقوں سے ہراساں کیا۔ نتیجے کے طور پر کشمیر کے اہلِ علم حضرات جن میں شیخ یعقوب صرفیؒ اور بابا داؤد خاکیؒ بھی شامل تھے۔ انھوں نے دہلی کی طرف رُخ کیا اور اکبر کو کشمیر پر چڑھائی کرنے کی دعوت دی۔ ۲۱

چک شاہی دور کا آخری خود مختار بادشاہ یوسف شاہ چک تھا۔ وہ رومانی طبیعت کا بادشاہ تھا۔ کشمیر میں لوگ انہیں بادشاہ کے نام سے کم اور عاشق کے نام سے زیادہ جانتے ہیں۔ انہوں نے ایک دیہاتی لڑکی حبہ خاتون سے شادی کر کے اپنی محبت کے قصے کو امر بنا دیا۔ بہر حال کشمیر کو مغلوں نے اپنے قبضے میں کیا اور یوسف شاہ کو بے دخل کر بہار میں کسی جگہ پر قید کیا۔ مورخین کے مطابق یہ ۱۵۸۶ء

کا واقعہ تھا۔ یوں کشمیر غلامی کے ایسے چنگل میں پھنس گئے کہ یہ سلسلہ ہنوز جاری و ساری ہے۔

مغل دورِ حکومت (۱۵۸۶ءتا۱۷۵۲ء)

کشمیر پر مغلوں نے چھ سات بار حملے کئے تھے مگر ہر بار نا کام رہے۔ ۱۵۸۵ء میں چک خاندان کا آخری حکمران یوسف چک فرقہ پرستی کی رو میں بہہ کر اپنے ہی ہم وطنوں پر ظلم و ستم جاری رکھے ہوئے تھا۔ چنانچہ ان سختیوں سے تنگ آ کر دو بزرگ مغل بادشاہ کے دربار میں گئے تا کہ عوام کو کچھ راحت مل سکے۔[۲۲] لیکن اکبر نے ملک گیری کے لیے اس موقعے کا فائدہ اٹھا کر کشمیر کی عوام کو راحت کے بدلے اور بھی مصیبتوں میں مبتلا کر دیا۔ اس نے بڑی چالاکی سے یوسف شاہ چک کو دہلی بلایا اور انہیں واپس لوٹنے کی اجازت نہیں دی۔ اس طرح اکبر کی چالاکی اور دھوکہ دہی سے کشمیر پہلی بار ہندوستان کا حصہ بن گیا۔ کشمیر پر مغلوں کے قبضے کے بعد کشمیر کی ایک آزاد خودمختار مملکت کی حیثیت ختم ہو گئی۔

حکومت کا کام کاج بہتر طریقے سے چلانے کے لیے مغل بادشاہوں نے وقتاً فوقتاً مختلف صوبے دار مقرر کئے اور جنہوں نے مغلیہ حکومت کو مزید مستحکم بنانے میں نمایاں رول ادا کیا۔ مغل حکمراں چونکہ خوبصورتی کے دلدادہ تھے۔ اس لیے وہ اکثر بہار کے موسم میں یہاں تشریف لاتے تھے۔ مغل حکمرانوں نے یہاں تعمیر و ترقی کے کئی کام کئے۔ مساجد اور باغات تعمیر کروائے۔ مغل دور کے باغات آج بھی سیاحوں کا دل مول لیتے ہیں اور یہ کشمیر کی خوبصورتی میں چار چاند لگاتے ہیں۔ مغل دور میں فارسی زبان نے یہاں اتنی ترقی کی کہ کشمیر کو 'ایرانِ صغیر' کہا جانے لگا۔ علامہ اقبالؒ نے اسی بابت اپنی ایک نظم میں اشارہ کیا ہے:

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبورو فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

[۲۰]

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بڑی تیزی سے بکھرنے لگا۔آخری مغل بادشاہ، بہادر شاہ ظفر تک آتے آتے یہاں کے ناظم یہاں کے حکمران بن چکے تھے۔ ۱۷۵۱ء میں احمد شاہ درانی نے کشمیر پر حملہ کر کے مغل عمل داری کا خاتمہ کر دیا اور اب کشمیر افغانوں کے قبضے میں آ گیا۔

افغان عہد (۱۷۵۲ء تا ۱۸۱۹ء)

مغلوں کے زوال کے بعد کشمیر پر افغانوں نے قبضہ کر لیا۔اکثر محققین نے لکھا ہے کہ جب کشمیر کے لوگ مغلوں کے گورنروں کے ظلم وستم سے تنگ آ گئے تو انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو کشمیر پر حملے کی دعوت دی۔ چنانچہ احمد شاہ ابدالی مغلوں کا کٹر دشمن تھا۔اس لیے اس نے ۱۷۵۲ء میں حملہ کر کے کشمیر کو افغان حکومت کا حصہ بنا دیا۔ظلم و جبر میں جو کسر مغل گورنروں نے اٹھا رکھی تھی وہ افغان گورنروں نے اچھی طرح پوری کی۔ چنانچہ کشمیر کی معاشی، سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حالت دن بہ دن بدتر ہوتی چلی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا دور ایک سخت گیر دور تھا۔ان کا سلوک ہندوؤں سمیت مسلمانوں کے تمام فرقوں سے یکساں تھا۔افغان عہد کے بارے میں عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

> ''وہ عہد جو ۱۷۵۲ء میں کشمیر پر افغانوں کے قبضے کے بعد شروع ہوا، اسے بعض اوقات دورِ ابتری سے موسوم کیا جاتا ہے۔مغل سامراج نے کشمیر کی آزادی چھینی تھی تو کم سے کم ایرانی تہذیب، شائستگی، ادب اور علم کی روایات دی تھیں جن کی چھینٹ افغانوں پر بہت دور کے واسطے سے پڑی تھی۔ وہ جری تھے، بہادر سپاہی

تھے،لیکن عوام کی دلبری کے بغیران کی شہامت قاہری بن گئی تھی۔ [۲۱]

افغانوں نے ۶۷ سال تک کشمیر پر حکومت کی۔افغان گورنروں نے عوام پر ظلم وتشدد کی انتہا کی۔پی۔این۔کے۔بامزئی لکھتے ہیں کہ افغانوں کوکشمیر کی حکومت اپنے ہاتھوں میں لینے کی دعوت دیتے ہوئے اہلِ کشمیر کو دھوکہ ہوا تھا کہ وہ مغل بادشاہوں کی طرح مہذب اورانسانی ہمدردی رکھنے والے حکمران ہوں گے لیکن ان کی اس چوک نے انہیں گویا کڑھائی سے چولہے میں جھونک دیا۔ ۱۸۱۹ءمیں کشمیر میں افغان دوراختتام کو پہنچاجب رنجیت سنگھ نے کشمیر پر چڑھائی کی۔

سکھ شاہی دور(۱۸۱۹ءتا۱۸۴۶ء)

۱۸۱۹ءمیں کشمیر،افغانوں کی درانی سلطنت اورمسلمانوں کے چارسوسالہ اقتدار سے گذرکر پہلی بارسکھوں کے قبضے میں آ گیا۔کشمیر کے لوگ مسلسل ظلم وستم سہنے کے بعدانہوں نے سکھوں کونجات دہندہ تصورکیا۔لیکن انہوں نے بھی پرانی روایت برقراررکھتے ہوئے یہاں کی عوام کا جینا حرام کر دیا۔ سکھوں کی طرف سے ۱۰ گورنرکشمیر میں بھیجے گئے جن میں سے ۵ ہندو،۳سکھ اور۲مسلمان تھے۔سکھوں کا دورکشمیر میں ظلم وتشدد کے نام سے یادکیا جاتا ہے۔موتی رام جوایک سال تک حکمران رہا،کے دور میں بقولِ محمدامین خان،مسلمانوں پرعرصہ حیات تنگ کیا گیا۔جامع مسجد سری نگرکوعبادت کے لیے بند کر دیا گیا۔ جمعہ کی نماز پر پابندی لگا دی گئی۔گائے ذبح کرنے پر سزائے موت سنائی جاتی۔اس پورے دور میں تھوڑا سا سدھاراس وقت آیاجب یہاں کے گورنرشیخ محی الدین اورشیخ امام الدین رہے۔انہوں نے دوبارہ لوگوں کی حالت زآرسدھارنے کی حت المقدورکوشش کی۔ان کے بارے میں یہ روایت ملتی ہے کہ انھوں نے سری نگر کی جامع مسجد ۲۵ سال کے بعد دوبارہ عبادت کے لیے کھول دی۔۱۸۴۶ءمیں گلاب سنگھ نے انگریزوں کی مدد سے کشمیر پراپنی حکومت قائم کی۔

ڈوگرہ شاہی (۱۸۱۹ءتا۱۹۴۷ء)

جموں کے قدیم باشندوں کو ڈوگرہ کہا جاتا ہے۔ ڈوگرہ حکومت کے بانی گلاب سنگھ کی ولادت ۱۷۹۲ء میں جموں میں ہوئی۔ گلاب سنگھ نے جموں میں ایک جاگیردار کے یہاں اپنی بہادری دکھائی اور جس کی شہرت سن کر رنجیت سنگھ نے انہیں اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔ یہاں سے گلاب سنگھ اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہوا۔ کشمیر جو کہ افغانوں کے قبضے میں تھا۔ رنجیت سنگھ کے کہنے پر گلاب سنگھ نے افغانوں پر کئی کامیاب حملے کئے۔ اسی بنا پر رنجیت سنگھ نے انہیں جاگروں سے نوازا۔ آہستہ آہستہ گلاب سنگھ نے کئی اور اہم علاقوں جیسے لداخ وغیرہ کو بھی اپنے قبضے میں کرلیا۔

رنجیت سنگھ کی موت کے ساتھ ہی لاہور دربار بدنظمی کا شکار ہوگیا اور خالصہ فوج نے انگریزوں کو بھی چھیڑا۔ انگریزوں کی جوابی کاروائی سے گھبرا کر انہوں نے گلاب سنگھ کو مصالحت کے لیے تیار کیا۔ گلاب سنگھ نے انگریزوں اور سکھوں کے درمیان صلح کروائی اور اپنے لئے پورا جموں وکشمیر بطور انعام حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ جو معاہدہ انگریزوں اور سکھوں کے درمیان ۹/مارچ ۱۸۴۶ء کو ہوا۔ اسکی دفعہ ۱۲ میں جموں وکشمیر کے متعلق انگریزوں نے سکھوں سے لکھوالیا کہ اسے مہاراجہ گلاب سنگھ کے سپرد کیا جائے گا۔ چنانچہ اس معاہدہ کی روشنی میں ۱۴/مارچ ۱۸۴۶ء کو ایک معاہدہ انگریزوں اور گلاب سنگھ کے درمیان ہوا۔ یوں گلاب سنگھ ریاستِ جموں وکشمیر کا آزاد اور خودمختار حکمران بن گیا۔

اس بارے میں محی الدین زور کشمیری اپنے ایک مضمون 'تحریک آزادی ہند اور جموں وکشمیر کے اردو شعراء' میں لکھتے ہیں:

> ''کشمیر کی تاریخ میں ایک بدنما داغ اس وقت نظر آتا ہے۔ جب ۱۶/مارچ ۱۸۴۶ء میں امرتسر معاہدے کے تحت مہاراجہ گلاب سنگھ نے ۷۵ لاکھ نانک

شاہی روپیوں کے عوض کشمیر کو انگریزوں سے خرید لیا تھا۔'' ۲۲

کشمیر کے معروف صحافی پی۔ جی۔ رسول اس بات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جدید ریاستِ جموں وکشمیر ۱۸۴۶ء کے معاہدے امرتسر کی پیداوار ہے لیکن اس کو ۱۹۴۷ء کی جغرافیائی حیثیت دینے میں ۱۸۴۶ء کے بعد کئی سال لگ گئے۔ عمومی طور پر معاہدہ امرتسر کو ایک قوم فروخت کرنے کا معاہدہ سمجھا جاتا ہے۔ دراصل معاہدہ امرتسر عوام کو بے اقتدار کرنے کا مذموم تاریخی عمل تھا۔ اس معاہدے سے عوام یکسر اپنے تمام حقوق سے محروم ہوگئے۔ لوگ، زمین مہاراجہ کی ملکیت قرار پائی۔ لوگ صدیوں کی آبائی ملکیت سے محروم ہو گئے۔ لوگ زمینی پداوار اور وسائل سے محروم ہو گئے۔ عوام تمام دیگر جائداد و وراثت حتیٰ کہ بھیڑ بکریوں کی ملکیت سے بھی محروم ہوگئے۔ وہ تمام انسانی اور سیاسی حقوق سے محروم کر دیئے گئے۔ اس لیے معاہدہ امرتسر معاہدہ استعماریت Treaty of Dispossession ہے۔ ....اسی فیصد مسلم اکثریتی خطہ جموں وکشمیر وشمالی علاقہ جات کو قانونی وسرکاری لحاظ سے ایک ہندو ریاست قرار دیا جا چکا تھا۔''

۲۳

مہاراجہ گلاب سنگھ نے کشمیری قوم کو بھیڑ بکریوں کے ترازو میں وزن کرکے ان کے جان و مال، عزت وآبرو اور مال واسباب سمیت پورے خطہ ارض کو ۷۵ لاکھ نانک شاہی ٹکوں میں انگریزوں بہادر سے خرید لیا۔ قوموں کی اس خرید وفروخت پر دنیا کے تمام انصاف پسند لوگوں نے سخت برہمی اور لعنت و ملامت کی۔ علامہ اقبالؔ اس سودے بازی پر اپنا احتجاج کچھ یوں درج کرتے ہیں:

بادِ صبا اگر با جینوا گذر کنی
حرف ز ما با اقوام باز گوئے
دہقان کشت و جو، بیابان فروختند

قومائے فروختند چہ ارزانِ فروختند

اس طرح گلاب سنگھ نے ۹ رنومبر ۱۸۴۶ء میں کشمیر کا تخت سنبھالا۔ تخت سنبھالنے کے فوراً بعد گلاب سنگھ نے انتظامی امور کی طرف توجہ مرکوز کی اور اس میں کافی ردو بدل کیا۔ گلاب سنگھ چونکہ خود ہندو تھے اس لیے اپنے فرقے کے لوگوں کو بڑے بڑے عہدوں پر بٹھایا اور مسلمانوں کو حکومت کے معاملات سے بے دخل کر دیا۔ پیرزادہ حسن شاہ تاریخ حسن میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''ہندوؤں کے بہترین دن لوٹ آئے۔ وہ اعلیٰ منصوبوں پر فائز ہو گئے۔ مسلمانوں کو ملکی معاملات سے بے دخل کر دیا گیا اور وہ خاموشی سے تابعدار اور فرمانبردار بنے رہے۔'' ۲۴

گلاب سنگھ نے بھاری ٹیکس عائد کر کے کشمیری عوام کی زندگی تلخ کر دی۔ دوسری پالیسی جو اس نے اختیار کی وہ یہ تھی کہ اس نے قوم اور خطے کی بنیاد پر لوگوں میں تفریق ڈالی۔ اس نے کشمیری پنڈتوں کے بجائے پنجابیوں کو سرکاری عہدے عطا کیے۔ مسلمانوں کو ان کی جاگیروں سے بے دخل کیا گیا۔ گائے ذبح کرنے والے کے کان اور ناک کاٹ دیئے گئے۔

کشمیر کی تاریخ میں ۱۹۳۱ء کا سال ہمیشہ کے لیے یاد رکھا جائے گا کیونکہ بالآخر استعماریت اور محرومی کے خلاف لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس سال عید کے موقع پر جموں میں سرکاری اہلکاروں نے امام صاحب کو خطبہ دینے کی اجازت نہ دی۔ اسی دوران پولیس لائنز جموں میں ایک پولیس آفیسر نے اپنے ماتحت عملے میں سے ایک مسلمان کو قرآن کی تلاوت کرتے دیکھ لیا اور اس نے قرآن کی توہین کی۔ ریاسی میں بھی ایک اور واقعہ میں مسجد شریف پر حملہ کیا گیا۔ یہ خبریں جب سری نگر پہنچی تو لوگوں کی ایک بڑی تعداد مہاراجہ ہری سنگھ کے خلاف مظاہرے کرنے کے لیے اپنے گھروں سے باہر

آئے۔اس موقع پر عبدالقدیر نامی ایک آزادی پسند نے مہاراجہ کے خلاف زوردار تقریر کی۔حکومت نے ان کی تقریر کو ملک اور حکومت مخالف قرار دے کر انہیں گرفتار کیا۔حکومت نے ان کی سنوائی خفیہ طور پر سنٹرل جیل سری نگر میں رکھی لیکن کسی طرح سے یہ راز فاش ہوا اور جیل کے باہر تقریباً دس ہزار لوگوں کا مجمع جمع ہوا۔ پولیس انہیں روکنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اتنے بڑے ہجوم پر قابو نہ پا سکی۔آخر پولیس نے اندھا دھند گولیاں چلائی۔ڈوگرہ فوج نے جلیانوالہ باغ کا سانحہ دہرایا اور کئی معصوم لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ڈاکٹر عبدالاحد ایف۔ایم حسنین اور پی۔این بزاز کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں:

> ''.....twenty-two unarmed kashmiris were massacred...the city was handed over to the army. They resorted to indiscriminate firing at Nawab Bazaar, killing several persons and wounding many, besides arresting over three looting some ۲۵ hundred kashmiris and well-to-do Muslims"

صورتِ حال مہاراجہ کے قابو سے باہر ہوگئی تو اس نے وائسرائے ہند سے امداد طلب کر لی۔ اس کی درخواست پر انگریز فوج کشمیر میں داخل ہوگئی اور اس کے بعد ۱۲ر نومبر کو ایک کمیشن قائم ہوا۔ یہ کمیشن گلینسی کمیشن کے نام سے جانا جاتا ہے۔مسلمانوں نے اس کے سامنے ایک مکمل آئینی حکومت کا مطالبہ پیش کیا۔مسلمانوں کی شکایات کا کافی حد تک ازالہ کیا گیا اور ایک ایسی حکومت کی طرف قدم اٹھایا گیا، جس میں عوام کے نمائندے شامل ہوسکیں۔اس کے فوری بعد جون ۱۹۳۲ء میں مسلمانوں کی جد و جہد خالصاً آئینی شکل اختیار کر گئی۔مسلمانوں نے مل کر ایک سیاسی جماعت کی داغ بیل ڈالی،

جس کا نام 'مسلم کانفرنس' تجویز ہوا۔ شیخ محمد عبداللہ صدر اور جنرل سیکٹری چودھری غلام عباس منتخب ہوئے۔ باقی ممبران میں غلام احمد عشائی، میر واعظ احمد اللہ، مرزا محمد بیگ، مولانا محمد مسعود، بخشی غلام محمد، غلام محمد صادق وغیرہ کافی اہم ہیں۔ مسلم کانفرنس یہاں کے عوام کی آواز بن گئی۔ مسلم کانفرنس تقریباً پندرہ برس تک مہاراجہ کی حکومت سے برسرِ پیکار رہی۔

۱۹۳۵ء میں شیخ عبداللہ کی فکر میں تبدیلی ہونی شروع ہوئی۔ انہوں نے اپنی آواز اور تحریک کو موثر بنانے کے لیے ۱۹۳۸ء میں مسلم کانفرنس کو 'آل جموں وکشمیر نیشنل کانفرنس' میں بدل دینے کا فیصلہ لیا۔ ۱۹۳۸ء کا اجلاس شاہی مسجد سری نگر میں بلایا گیا۔ اس کی صدارت خواجہ غلام محمد صادق نے کی۔ اس اجلاس میں جن لوگوں نے شرکت کی ان میں پریم ناتھ بزاز، بخشی غلام محمد، پنڈت شیام لال صراف، پنڈت جیالال کلیم، محمد سعید مسعودی، سردار بدھ سنگھ وغیرہ شامل ہیں۔ اس اجلاس میں مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کی قرارداد منظور کی گئی۔ اس اجلاس کے استقبالیہ خطبے میں محمد سعید مسعودی نے کہا تھا:

> ''مسلم کانفرنس کا یہ اجلاس فیصلہ کرے گا کہ آج سے اسے نیشنل کانفرنس کے نام سے موسوم کیا جائے گا اور ریاست کا ہر کوئی باشندہ جو بالغ ہو، عورت یا مرد، بلا کسی امتیاز، مذہب وملت اس کانفرنس کا رکن بن سکتا ہے جس کے لیے شرط صرف یہ ہے کہ وہ ذمہ دار نظامِ حکومت کے قیام اور شخصی آزادیوں کے حصول کو تحریری طور پر اپنا سیاسی نصب العین ظاہر کرے۔'' ۲۶

۱۹۴۲ء میں نیشنل کانفرنس نے مہاتما گاندھی سے متاثر ہو کر ڈوگرہ حکومت کے خلاف 'کشمیر چھوڑ دو تحریک (Quit Kashmir Movement) کا آغاز کیا۔ اس تحریک کو کچلنے کے لیے مہاراجہ نے ہر ممکن کوشش کی۔ ظلم و بربریت کا ماحول گرم تھا۔ اس کی خبریں ہندوستان کے علاوہ دوسرے

ممالک تک پہنچنے لگی۔ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو نے کشمیر جانے کا ارادہ کیا لیکن انھیں مہاراجہ کی فوج نے جموں وکشمیر کی حدود میں داخل نہیں ہونے دیا۔نیشنل کانفرنس کے اکثر رہنماؤں کو جیلوں میں بند رکھا گیا۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان اور پاکستان دو آزاد مملکتیں وجود میں آئی۔ ملک کا بٹوارہ کر کے انگریزوں نے جاتے جاتے شیطانی منصوبے کو عملی جامہ پہنایا۔عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''بھارت کو چھوڑتے ہوئے انگریز شاطر نے ایسی چال چلی کہ فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے اور بے گناہ عوام کا خون بہایا گیا۔'' ۲۷

۱۹۴۷ء تک کشمیر کی عوام مہاراجہ کے شخصی راج کے خلاف برسرِ پیکار تھی۔اسی سال یہ امید جاگی تھی کہ کشمیر صدیوں کے ظلم اور بربریت کے شکنجوں سے آزاد ہو جائے گا لیکن یہ سب سراب ثابت ہوا۔اس ضمن میں مشہور صحافی و سرکردہ انسانی حقوق کارکن ظہیرالدین لکھتے ہیں:

''سال ۱۹۴۷ء کے واقعات بھی ایسی ہی ایک اصلیت ہے جو ہندوستان اور پاکستان کے لیے جہاں آزادی کی صبح لے کر آئی وہیں جموں وکشمیر کے لیے مہیب اندھیروں کو طوالت بخشنے کا سبب بنی۔انگریزوں کی حکمرانی کے خاتمے کے بعد یہ امید جاگی تھی کہ کشمیر کے وحشت زدہ سیاسی منظر پر بھی روشن سحر طلوع ہوگی لیکن یہ سب سراب ثابت ہوا۔'' ۲۸

۲۸: ظہیرالدین،تفریظ، مسئلہ کشمیر کی تاریخی اصلیت، ص،ا

دراصل ہندوستان میں ان ریاستوں کی اچھی تعداد تھی جو براہ راست انگریزی حکومت میں شامل نہیں تھیں۔ان ریاستوں کی کل تعداد کے بارے میں تضاد پایا جاتا ہے۔اکثر مورخین ان ریاستوں کی تعداد ۵۶۲ بتاتے ہیں۔

ان ریاستوں کو انگریز Princely States کہا جاتا ہے۔ان میں کچھ چھوٹی اور کچھ بڑی

ریاستیں تھیں۔ بڑی ریاستوں میں حیدر آباد اور کشمیر شامل تھیں۔ ان ریاستوں کا اقتدار اپنا تھا۔ برطانیہ حکومت کے ساتھ ان کے تعلقات ان معاہدوں کی بنیاد پر تھے۔ جو ریاست کے حکمرانوں سے سے کئے گئے تھے۔

۱۴راگست ۱۹۴۷ء کو اقتدار اعلی کے خاتمے کے ساتھ ہی ان ریاستوں کے لیے تین امکانی راستے تھے۔ پہلا خود مختاری کا اعلان، دوسرا پاکستان کے ساتھ الحاق اور تیسرا ہندوستان کے ساتھ الحاق۔ لیکن ہندستان نے کئی ریاستوں پر فوج کشی کر کے غاصبانہ انداز میں ان ریاستوں کی خود مختاری کو کچل ڈالا۔ کئی ریاستیں جدو جہد کر رہی تھی جن میں سرِ فہرست جموں و کشمیر تھی اور یہ جدو جہد اب تک جاری ہے۔ کشمیر کی تحریک کو دونوں مما لک پاکستان اور ہندوستان اقوامِ متحدہ تک لے گئے لیکن کشمیر کے عوام کی بدقسمتی نے ان کو آگے نہ بڑھنے دیا۔ پاکستان اور ہندوستان نے ریاست پر اپنے قبضے کو اور مضبوط کر لیا۔ آج دونوں مما لک اپنے سابقہ وعدوں سے انحراف کر کے کشمیری عوام پر ظلم وستم روا رکھے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں ریاست جموں و کشمیر کا عارضی الحاق ہندوستان کے ساتھ جواہر لال نہرو کے اس وعدے پر طئے ہوا کہ حالات میں سدھار ہوتے ہی یہاں عالمی امن اداروں کی نگرانی میں رائے شماری (pelbesite) سے ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کیا جائے گا۔ لیکن آج تک یہاں کی عوام اس دن کی منتظر ہیں۔ ہندوستان کی آنے والی حکومتیں جواہر لال نہرو کے وعدے کو آج تک عمل میں لانے میں ناکام ثابت ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مسئلہ اب بھی لٹکا ہوا ہے۔ پی۔ جی۔ رسول اپنی کتاب ''مسئلہ کشمیر کی تاریخی اصلیت'' میں لکھتے ہیں:

''وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئی دہلی جموں و کشمیر میں رائے شماری کے وعدے

سے مکر گئی۔ اس کی وجہ مورخ پیری اینڈرسن کے الفاظ میں یہ تھی کہ خفیہ ادارے حکومت کو ۱۹۴۹ء کے وسط ہی سے خبردار کر رہے تھے کہ جس طرح صوبہ سرحد میں خان عبدالغفار خان اور کانگریس حکومت کے باوجود رائے شماری میں عوام نے قطعی اکثریت سے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔ اسی طرح کے نتائج جموں وکشمیر میں بھی ظاہر ہوں گے۔'' ۲۹

اب جب کہ ہندوستان اور پاکستان کو آزاد ہوئے ۷۰ سال ہو چکے ہیں لیکن کشمیر کا مسئلہ ابھی بھی لٹکا ہوا ہے۔ ۲۰۰۰ء میں امریکی وزیرِ خارجہ میڈلین آلبرائٹ نے ایک عبرت انگیز بیان دیا۔ اس نے کہا کہ دنیا کے بیشتر مسائل حل تو ہو گئے لیکن مسئلہ کشمیر اب بھی باقی ہے۔ کئی ماہرین نے تو کشمیر کے مسئلے کو عالمی امن کے لیے سب سے بڑا خطرہ تصور کرتے ہیں۔ بہرحال آج کی دنیا میں جب انسانی حقوق کی حرمت کا اس قدر چرچا ہے، وہاں یہ امید ضرور کی جا سکتی ہے کہ مسئلہ کشمیر کا تاریخی المیہ یوں ہی خون آشام لہروں کا عنوان نہیں بنتا رہے گا۔ اس کو ختم ہو جانے ہی چاہیے تا کہ مظلوم جموں وکشمیر اور پورے برصغیر کے عوام امن وآشتی، احترام آدمیت اور ترقی سے ہمکنار ہوں۔

بہرحال کہا جا سکتا ہے کہ کشمیر کی غلامی کا دور بہت جلد نہ صحیح پر ایک نہ ایک دن ختم ہو جائے گا کیو نکہ بقولِ محمد امین، فطرت کے اس قانون کو کوئی نہیں بدل سکتا، جو قوموں کے عروج وزوال کے متعلق ہے۔ عروج سے زوال پذیر ہونے میں بھی ایک عرصہ لگتا ہے۔ اس طرح زوال سے عروج کی طرف مراجعت میں بھی عرصہ درکار ہوتا ہے۔ کشمیریوں کا سفر عروج کی طرف جاری ہے۔ آزادی کی طرف ہی بڑھ رہے ہیں۔ غلامی وآزادی کا دور قوموں پر آتا ہی رہتا ہے۔ ہمیشہ کے لیے کسی قوم کو غلام نہیں رکھا جا سکتا۔ امید کی جا سکتی ہے کہ ریاست کشمیر کے سامنے جو مسائل ہیں وہ یقیناً ایک دن ختم ہو جائیں گے اور یہاں کے عوام خوشحال زندگی بسر کر سکیں گے۔

حوالے:

1. Karl Marx, Das Kapital, English Literature For Competitive Examinations

۲: محمد امین خان، آئینہ تاریخ کشمیر، ص ۲۳

۳: ایضاً، ص ۲۴

۴: حبیب کیفوی، کشمیر میں اردو، ص ۱

۵: علامہ اقبالؒ، ارمغانِ حجاز، نظم نمبر ۲۲، ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض

۶: شیرازہ، گوجری نمبر، ص ۷۷

۷: Kashmiriyat through the Ages, edited by Prof. M.Fida p.2

۸: جی۔ایم۔ڈی۔صوفی، Kasheer، ص ۲۲

۹: جی۔ایم۔ڈی۔صوفی، Kasheer، ص ۱۹

۱۰: محمد امین خان، آئینہ تاریخ کشمیر، ص ۲۶

۱۱: عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو، جلد اول، ص ۴۵

۱۲: ڈاکٹر شمس الدین (مترجم)، تاریخ حسن، ص ۴۷

۱۳: بشیر بشیر (مترجم)، راج ترنگنی، ص ۶۰

۱۴: ڈاکٹر شمس الدین احد، تاریخ حسن، ص ۱۲۱

۱۵: عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو، ص ۱۲

۱۶: عبدالقادر سروری، کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ، ص ۱۴

۱۷: ڈاکٹر جی۔ایم۔ڈی صوفی، کشمیر، ص ۱۳۶

۱۸: عبدالقادر سروری، کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ، ص ۱۷

۱۹: حامدی کاشمیری، ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب، ص ۵۴

۲۱: محمد امین خان، آئینہ تاریخ کشمیر، ص ۳۶

۲۰: علامہ اقبال، ارمغانِ حجاز، ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض، نظم نمبر ۲۴

۲۱: عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو، جلد اول، ص ۷۸

۲۲: فکر و تحقیق، سہ ماہی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، دہلی، شمارہ ۳، جلد ۱۶، ص ۵۹

۲۳: پی۔جی۔رسول، مسئلہ کشمیر کی تاریخی اصلیت، ص ۳۵

۲۴: ڈاکٹر شمس الدین، تاریخ حسن، ص ۹۳۸

۲۵: عبدالاحد، کشمیر ڈسکورس (Kashmir Discourse) ص ۳۲۰

۲۶: شیخ محمد عبداللہ، آتشِ چنار، ص ۹۸
۲۷: عبدالقادر سروری، جموں و کشمیر میں اردو ادب، جلد اول، ص ۹۸
۲۸: پی۔ جی۔ رسول، مسئلہ کشمیر کی تاریخی اصلیت، ص ۱
۲۹: پی۔ جی۔ رسول، مسئلہ کشمیر کی تاریخی اصلیت، ص ۱۴۷

باب دوم:

ریاست جموں وکشمیر میں اردو اورناول کی روایت

(الف) جموں وکشمیر کا ادبی پس منظر

(ب)جموں وکشمیر میں اردو ناول کی روایت

(الف) جموں وکشمیر کا ادبی پس منظر

جموں وکشمیر عہدِ قدیم ہی سے علم و ادب اور تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ کشمیر میں مختلف زبانوں کے ادبی اور شعری نمونوں کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ عہدِ ماضی سے لے کر جدید دور تک سنسکرت، فارسی، کشمیری، ہندی اور اردو زبانوں میں یہاں کے شعرا و ادبا کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار ملتا ہے۔

کشمیر میں سنسکرت زبان قدیم زمانے میں علمی و ادبی اغراض کے لئے رائج تھی۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ سنسکرت یہاں اُن آرائیوں کے ساتھ آئی جو ابتداء میں ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے۔ یہاں پر ابتداء میں آنے والی آریائی قوم اپنے ساتھ پراکرت لائے تھے اور پڑھے لکھے لوگ پراکرت کے علاوہ سنسکرت بھی بولتے تھے۔

اشوک کے زمانے میں بُدھ مت وادی میں داخل ہوا لیکن یہاں پر بدھ مت کے علماء نے جو کتابیں تصنیف کی' ان کی زبان سنسکرت تھی جبکہ ہندوستان میں بدھ مت کی اشاعت کے لئے پالی زبان استعمال کی جاتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ یہاں کے لوگ سنسکرت پر دسترس حاصل کر چکے تھے۔ اسی لئے بدھ مت کے عالموں نے اس کا فائدہ اٹھا کر سنسکرت ہی میں بدھ مت کی تبلیغ شروع کی۔

کشمیر میں بدھ مت بڑی تیزی سے پھیلا اور کنشک کے عہد میں بدھ مت کی چوتھی مجلس کشمیر میں منعقد ہوئی۔ اس مجلس کے مباحث پالی کے علاوہ سنسکرت میں بھی لکھے گئے۔ مؤرخین کے مطابق کشمیر میں سنسکرت نے بڑی تیزی سے ترقی کی منزلیں طئے کیں اور ہندوستان کے کئی علاقوں سے لوگ یہاں سنسکرت سیکھنے کی غرض سے آتے تھے۔ کشمیر میں سنسکرت زبان کا استعمال نہ صرف بدھ مت کی ترویج کے لیے ہوا بلکہ قواعد، عروض، شعریات وغیرہ پر بھی بہت اچھی کتابیں اسی زبان میں لکھی گئیں۔ اس کے بعد جتنے بھی راجاؤں نے کشمیر پر حکومت کی ان کے عہد میں سنسکرت زبان برابر ترقی کرتی رہی۔ کچھ ہندو راجاؤں نے سنسکرت کو عام کرنے کے لئے کئی اقدام کئے۔ اس کے علاوہ سنسکرت ہی میں ڈرامے اور ناٹک بھی لکھے گئے۔ اس طرح یہاں اس زبان کا اثر بڑھنے لگا۔ ابھینو گپت سنسکرت کے مشہور شاعر، نقاد اور فلسفی گذرے ہیں۔ انہوں نے جمالیات پر 'ابھینو بھارتی' کتاب لکھ کر شہرتِ دوام پائی۔ اسی طرح شاعری میں علم الاصوات پر کشمیری علماء خاص کر انندوردھن نے 'دھونیالوک' تصنیف کی جو اس میدان میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ کلہن نے راج ترنگنی لکھ کر برصغیر میں تاریخ نویسی کی بنیاد رکھی۔ کشمیری تاریخ کے ماہر پروفیسر ڈاکٹر فدا محمد حسنین اپنی ایک کتاب "Kashmiriyat- through the Ages" میں اس بابت لکھتے ہیں:

> "The Kashmiris contributed voluminously to the Sanskrit literature in India. Not only in the field of poetics where the Kashmirian scholars have excellled all others, but also in the field of philosophicla and historical literature their contribuation is superb and notable." 1

کشمیر میں چودھویں صدی تک سنسکرت زبان ہی میں ادب لکھا جانے لگا۔ چودہویں صدی

سے کشمیر میں مسلمانوں کی آمد شروع ہوتی ہے۔اگرچہ مسلمان صرف اپنے دین کی اشاعت کی غرض سے یہاں آئے تھے لیکن کچھ حکمرانوں نے بھی یہاں سیاسی اغراض سے قدم رکھا۔خصوصاً ایرانی لوگ یہاں آئے۔اس طرح وہ اپنے ساتھ فارسی زبان اور کلچر بھی ساتھ لائے تھے جس کا اثر یہاں کے لوگوں پر پڑا۔اس تعلق سے عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

> ''فارسی زبان کشمیر سے بہت قدیم زمانے میں روشناس ہوئی۔اہلِ کشمیر کے تہذیبی رشتے ایران سے قدیم زمانے سے رہے۔وادی کے ابتدائی بسنے والے جو ہند یورپی اور ہند ایرانی شاخ سے کٹ کر وسط ایشیا اور ملتان سے ہوتے ہوئے کشمیر میں آ کر بسے تھے۔لفظوں کا ابتدائی ذخیرہ اپنے ساتھ لائے تھے۔کشمیر کے وسط ایشیا کے ان ملکوں سے تجارتی اور تہذیبی تعلقات کی بدولت ترقی یافتہ فارسی زبان کے اثرات بھی یہاں پہنچتے رہتے تھے''۔[۲]

کشمیر میں ابتدا میں مسلمان اسلام کی اشاعت کیلئے یہاں آئے۔مسلمان حکمرانوں نے یہاں نے یہاں پر اپنی حکومت قائم کی۔ابتداء میں جو مسلمان یہاں تشریف لائے وہ زیادہ تر ایران کے رہنے والے تھے اوران کی زبان فارسی تھی۔اس وجہ سے یہاں پر سنسکرت کی جگہ فارسی نے بڑی تیزی سے ترقی کی۔فارسی زبان کی تیزی سے پھیلنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے سے پہلے ہی یہاں کے لوگ اس زبان سے آشنا ہو چکے تھے۔

کشمیر کے لوگ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہی فارسی زبان سے کسی حد تک واقفیت حاصل کر چکے تھے۔پھر جب مسلمانوں نے یہاں حکومت قائم کر لی تو فارسی زبان کو درباری زبان کا درجہ ملا۔چونکہ کشمیر کے لوگ مختلف مذہبی پیشواؤں اور عالموں کے استحصال سے تنگ آ چکے تھے اور مذہب اسلام کی تبلیغ و اشاعت سے یہاں کے لوگ اسلام کی خوبیوں سے واقف ہوئے اور اس کی طرف

راغب ہوئے۔اس طرح کشمیری عوام اسلام قبول کرنے لگی۔اس طرح فارسی زبان میں شعروشاعری ہونے لگی اوراعلیٰ پائے کے ادیب سامنے آئے۔

کشمیر میں مسلمان حکمرانوں میں شہہ مرزا نے ۱۳۳۹ء میں حکومت کی بنیاد ڈالی۔شہہ میری سلاطین کے دورِحکومت (۱۳۳۹ء۔۱۵۴۰ء) میں اِیرانی تہذیب کی نشوونما بہت تیزی سے ہوئی۔ علمی وادبی زبان فارسی تھی اورحکومتی کام بھی اسی زبان میں ہوتا تھا۔اس خاندان کا سب سے قابل بادشاہ زینُ العابدین کا دورِحکومت (۱۴۲۰ء۔۱۴۷۰ء) تھا۔اس عہد میں انہوں نے ہر اعتبار سے کشمیرکوترقی کی راہ پر گامزن کیا۔بڈشاہ کے دور میں جوناراجا نےکلہن کی راج ترنگنی کے سلسلے کوآگے بڑھایااور پندرھویں صدی کے وسط تک پہنچایا۔شہہ میری سلاطین کے دور میں یہاں عربی زبان بھی متعارف ہوئی۔عربی چونکہ مسلمانوں کی مذہبی زبان تھی اس لیے یہاں کی عوام نے عربی میں کافی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔کشمیر میں آج بھی اسکولوں اور کالجوں میں عربی پڑھائی جاتی ہے۔عربی علم وادب میں یہاں جن لوگوں نے اپنی قابلیت اورعظمت کالوہامنوایاان میں شیخ یعقوب صرفیؒ، ملامحسن فانی اور مولاناانورشاہ کشمیریؒ وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

سلاطینِ کشمیر کے دور میں کشمیری زبان کی حوصلہ افزائی اورسرپرستی کی وجہ سے کئی نامورفارسی اور سنسکرت داں ہستیوں نے کشمیری میں لکھنا شروع کیا۔کشمیری زبان میں جہاں تک سب سے قدیم ادب کا تعلق ہے وہ ’مہانے پرکاش‘ ہے۔اس کے بعد لل دیؔد کے واکھ اور شیخ العالمؒ کے شرق (شلوک) ہیں۔لل دیؔد کے واکھوں میں شیومت عقائد کی تفصیل اورفلسفہ کا بیان ملتا ہے۔لل دیؔد کے کشمیری اشعار ہرعام وخاص کی زبان پرآج بھی جاری ہیں۔لل دید کشمیر میں لل عارفہ اورلل ایشوری کے ناموں سے بھی جانی جاتی ہیں۔شیخ العالمؒ کے کلام میں اسلامی عقائد اورفکروفلسفہ ملتا ہے۔ یہاں

کے لوگ بلاتفریق مذہب وملت ان دونوں دانشوروں کو کافی عزیز رکھتے ہیں۔محی الدین زور کشمیری اس بارے میں اپنے ایک مضمون 'تحریک آزادی ہند اور جموں وکشمیر کے اردو شعرا' میں لکھتے ہیں:

''کشمیر ہمیشہ بیرونی حاکموں وبادشاہوں کے لیے سیر گاہ رہا ہے اور وہ لوگ یہاں کے معصوم عوام کو اکثر و بیشتر ستاتے رہے لیکن ان کے حقوق کو ہمیشہ سلب کیا گیا اوران کی آواز کو دبانے کی کوشش کی گئی۔کشمیریوں نے ہمیشہ حب الوطنی، اسکولیر روایتوں کا ساتھ دیا اور یہ روایتیں انہیں یہاں قدیم شیوازم اور صوفی ازم سے ملی ہیں، جس کی عظیم مثالیں لالہ عارفہ اور شیخ العالم موجود ہیں۔۔ان کے بعد بھی یہاں نئی نئی زبانیں اور ادبیات معرض وجود میں آتے رہے، مگر ان لاثانی روایتوں اور قدروں کو کشمیر کے شعراوٴادبا نے نہیں چھوڑا۔'' ۳۲

شہ میری دور کے بعد چک دور میں بھی اس زبان کی کافی حوصلہ افزائی کی گئی۔ چنانچہ مشہور شاعرہ حبہ خاتون اسی دور سے تعلق رکھتی ہیں۔انہوں نے لول شاعری کی بنیاد ڈالی۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ حبہ خاتون کشمیر کے آخری خودمختار حکمران یوسف شاہ چک کی ملکہ تھی جسے مغل بادشاہ اکبرِ اعظم نے معزول کر کے ملک بدر کیا تھا۔اگر چہ مغلیہ دورِ حکومت میں اس زبان کی طرف کم توجہ کی گئی لیکن اس کے ادب کا سفر پھر بھی جاری رہا اور کئی مایہ ناز ادباء وشعراء اس زبان وادب کی نوک پلک سنوراتے رہے۔ ان میں عبدالوہاب پرے، رسول میر، ارنی مائی، روپہ بھوانی، پرمانند، محمود گامی، مقبول شاہ کرالہ واری، نعمہ صاب، سوچھ کرال، شاہ غفور، شمس فقیر، صمد میر، امیر شاہ، وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

کشمیر میں مغل دور (۱۵۸۶ء۔۱۷۵۲ء) میں فارسی زبان برابر ترقی کرتی رہی۔ فارسی زبان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر یہاں کے پنڈتوں نے بھی اسے علمی وادبی زبان کے طور پر قبول

کیا۔آ گے چل کر فارسی زبان نے یہاں اتنی ترقی کر لی کہ کشمیر کو'' ایران صغیر'' کہا جانے لگا۔مظہرؔی، ملامحسن خاںؔ، غنی کاشمیرؔی، ناقعؔ، سالمؔ، مجرمؔ ملاحمید اللہ وغیرہ ایسے شاعر ہیں جنھوں نے فارسی زبان میں اپنے کلام کے عمدہ نمونے پیش کئے۔غنی کاشمیرؔی کی قادرالکلامی کا یہ عالم تھا کہ نہ صرف کشمیر بلکہ ایران کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کو اس کی شاعری نے حیران کر دیا تھا۔حبیب کیفوی اپنی کتاب میں غنی کاشمیری کا شاعری کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ملامحسن فانی وہ بزرگ تھے جن کی آغوشِ تربیت میں غنی ایسا قادرالکلام شاعر پروان چڑھا جس کی شاعری نے اہلِ کشمیر ہی سے نہیں ایرانیوں سے بھی خراجِ تحسین وصول کیا۔'' ۴؎

کشمیر میں مغل حکومت کے خاتمے کے بعد افغان برسرِ اقتدار آئے۔کشمیر میں افغانوں کا دور (۱۷۵۲ء۔۱۸۱۹ء) میں بھی فارسی زبان وادب کی ترقی برابر ہوتی رہی۔کیونکہ افغان حکمران بذاتِ خود فارسی سے کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ان کی اپنی زبان (پشتو) فارسی سے بہت قریب ہے۔یہی وجہ ہے کہ فارسی زبان سے ان کی دلچسپی قائم ہوئی۔عبدالقادر سروری افغان حکمرانوں کی زبان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''کشمیر سے مغلوں کے تسلط کے خاتمہ کے بعد جب افغان برسرِ اقتدار آئے تو وہ بھی کشمیر کی فارسی روایات سے بے تعلق نہ رہ سکے۔'' ۵؎

افغان حکومت کے خاتمے کے بعد، کشمیر سکھوں کے قبضے میں آ گیا۔سکھوں کے دورِ حکومت (۱۸۱۹ء۔۱۸۴۶ء) میں اگرچہ سرکاری زبان فارسی ہی رہی، لیکن یہ زبان اب یتیم سی ہو گئی تھی کیونکہ سکھوں نے اپنے دورِ حکومت میں ساری توجہ مال جمع کرنے پر صرف کی اور یہاں کی علمی و ادبی سرگرمیوں کی طرف بہت کم توجہ کی جس کی وجہ سے فارسی زبان اپنے معیار سے گرنے لگی۔اس بارے

میں حبیب کیفوی لکھتے ہیں:

''جب افغانوں کا دورِ حکومت ختم ہو گیا اور سکھوں کی عملداری شروع ہوگئی تو فارسی کو زوال آنا شروع ہوا۔ اگر چہ ان (سکھوں) کے دور میں بھی دفتری زبان فارسی تھی لیکن ادب بے سہارا ہو گیا کیونکہ اس کی سرپرستی کرنے والا کوئی باقی نہ رہا۔'' ؎٦

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی موت ١٨١٩ء کے بعد سکھوں نے کشمیر کو بطور تاوان انگریزوں کے حوالے کیا۔ انگریزوں نے ١٦/مارچ ١٨٤٦ء کو امرتسر معاہدہ کے تحت کشمیر کو جموں کے راجا گلاب سنگھ کے ہاتھوں فروخت کی۔

ڈوگرہ حکومت (١٨٤٦ء۔١٩٤٧ء) میں بادشاہوں کی ساری توجہ خزانوں کو بھرنے کی طرف زیادہ رہی۔ لیکن پھر بھی ڈوگرہ دورِ حکومت میں علم وادب میں خاطر خواہ ترقی ہوئی۔ ڈوگرہ حکومت قائم ہونے کے بعد بھی یہاں کی سرکاری زبان فارسی ہی رہی۔ ڈوگرہ حکمرانوں نے اگرچہ ڈوگری زبان کو سرکاری زبان بنانا چاہا لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حبیب کیفوی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''ڈوگرہ حکمرانوں گلاب سنگھ اور رنبیر سنگھ نے اپنے وقتوں میں فارسی کے بجائے ڈوگری کو دفتری زبان بنانے کی بڑی کوششیں کیں لیکن ان کی کوئی کوشش بارآور نہ ہوئی اس لئے کہ اس میں وہ اہلیت ہی نہ تھی جو دفتری زبان کیلئے ضروری ہے۔'' ؎٧

ڈوگرہ دورِ حکومت میں جموں وکشمیر کے تعلقات ہندوستان کے کئی شہروں سے قائم ہوئے۔ چونکہ جموں کے لوگ ڈوگری زبان بولتے ہیں اور کشمیر میں کشمیری زبان۔ اس لئے وقت کا تقاضہ تھا کہ

کوئی ایسی زبان ہو جو ریاست کے باشندۓ بلاتفریقِ مذہب و ملت استعمال کرتے۔ چنانچہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں اردو زبان بہت ہی مقبول ہو رہی تھی۔ ان ہی شہروں سے آنے والے لوگوں اور ٹورسٹوں کی وجہ سے یہاں لفظوں کا لین دین شروع ہوتی ہے۔ اردو زبان یہاں کے باشندوں کو بہت پسند آئی اور اس کو سیکھنے کی وہ کوشش کرنے لگے۔ اس بارے میں ڈاکٹر چمن لال بھگت ایک جگہ اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ڈوگرہ حکومت کے ابتدائی چند برسوں میں اگرچہ سرکاری زبان فارسی تھی لیکن آہستہ آہستہ اردو کا چلن بھی عام ہوتا جا رہا تھا۔'' ۸

ریاست جموں و کشمیر میں اردو زبان زبان کی ترویج میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت بھی سودمند ثابت ہوئی۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے اپنی فوجوں کو انگریزوں کی مدد کے لیے دہلی روانہ کیا تا کہ بغاوت کو کچلنے میں ان کی مدد کریں۔ جنگِ آزادی کے بعد ڈوگرہ فوجیں کچھ عرصہ دہلی میں مقیم رہیں اور واپس آتے وقت اردو کے بے شمار الفاظ بھی وہ ساتھ لائے اور اس طرح ان فوجیوں کی وجہ سے کشمیر میں اردو زبان کے رائج ہونے میں بڑی مدد ملی۔ عام لوگوں کے علاوہ ڈوگرہ حکمرانوں نے بھی اس زبان کی مٹھاس اور مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اس کی ترقی کے لئے کئی قدم اٹھائے۔ اس بارے میں ڈاکٹر ظہورالدین لکھتے ہیں:

''جہاں تک اردو زبان کی توسیع کا تعلق ہے، ڈوگرہ حکمرانوں کا کردار قابل ستائش ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلے دونوں ڈوگرہ حکمرانوں مہاراجہ گلاب سنگھ ۱۸۴۶۔۱۸۵۷ اور مہاراجہ رنبیر سنگھ ۱۸۵۷۔۱۸۸۵ء کے زمانے میں فارسی ہی سرکاری زبان کے طور پر استعمال ہوتی رہی لیکن فارسی کبھی بھی عوام کی زبان نہ بن سکی۔ یہ صرف شرفا کی زبان تھی۔ عوام کے لئے سرکاری دفاتر میں

جس زبان کواستعمال کیا جاتا تھا وہ اردو ہی تھی۔'' ۹

مہاراجہ پرتاب سنگھ (۱۸۸۵ء۔۱۹۲۵ء) کے زمانے تک اردو زبان نے یہاں پر بہت ترقی کی ۔ یہ عوام میں بڑی مقبول ہوئی ۔مہاراجہ نے اپنے دربار میں عالموں اور فاضلوں کو جمع بھی کیا۔ وہ فارسی زبان میں دست رس رکھنے کے باوجود اردو زبان بھی بولتے اور لکھتے تھے۔ سرکاری رپورٹیں اردو میں قلم بند ہونے لگی تھیں اور یوں اردو نثر و نظم کے لیے راہ ہموار ہوتی رہی۔ چنانچہ وقت کے تقاضوں اور اردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر مہاراجہ پرتاب سنگھ نے ۱۸۸۹ء میں اسے سرکاری زبان کے طور پر قبول کرلیا۔ برج پریمی اس تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''ریاست جموں وکشمیر میں اردو نثر کی باضابطہ شروعات انیسویں صدی کے آواخر میں اس وقت ہوئی۔ جب اس زبان کی مقبولیت کے زیر اثر مہاراجہ پرتاب سنگھ نے ۱۸۸۹ء میں اسے سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس زمانے تک آتے آتے اردو خواندہ لوگوں کا حلقہ بڑھ چکا تھا۔ سرکاری سرپرستی حاصل ہونے کے بعد یہ زبان ریاست کی سماجی اور سیاسی زندگی میں موثر رول ادا کرنے لگی۔ چنانچہ تعلیمی اداروں، سرکاری محکموں اور عدلیہ میں اس کے برتے جانے سے نہ صرف زبان میں وسعت پیدا ہوئی بلکہ اس کی اہمیت میں بھی اضافہ ہوا۔'' ۱۰

سرکاری سرپرستی ملنے کے ساتھ ہی اردو زبان اور شعر و ادب نے بڑی تیزی سے ترقی کی منزلیں طئے کیں۔ اردو ریاست کے تینوں خطوں (جموں، کشمیر، لداخ) کے لوگوں کو ہندوستان کے باقی علاقوں سے جوڑنے کا ذریعہ بن گئی۔ مہارراجہ پرتاب سنگھ نے بذات خود اردو کی ترقی و ترویج کے لئے بہت سے اقدام کئے۔ اس طرح علمی و ادبی سطح پر بھی اردو رائج ہوئی۔ ریاست کے باصلاحیت لوگ اس زبان کے توسط سے ادبی، سیاسی اور سماجی زندگی میں اپنا شاندار رول ادا کرنے لگے اور آگے

چل کر اردو کو یہاں کے لوگوں نے مادری زبان کی طرح سینچا۔اس بارے میں حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

''۱۸۸۹ء میں مہاراجہ پرتاب سنگھ نے اردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر اسے سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ چنانچہ یہ زبان دفاتر اور عدالتوں میں رائج ہوگئی اور تعلیمی اداروں میں پڑھائی جانے لگی۔'' [۱۱]

مہاراجہ پرتاب سنگھ (۱۸۸۵ء۔۱۹۲۵ء) کے زمانے میں جن لوگوں نے اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت کی۔ان میں ہرگوپال خستہ اور ان کے چھوٹے بھائی سالک رام بے حد اہم ہیں جو خستہؔ شبلیؔ اور حالیؔ کے ہم عصر تھے۔انہوں نے کئی اہم کارنامے انجام دیئے۔وہ اردو زبان کے مزاج سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔ان کے نثری کارناموں میں سب سے اہم کتاب ''گلدستہ کشمیر'' ہے۔ یہ کشمیر کی پہلی نثری تاریخ ہے۔ یہ کتاب عہدِ قدیم سے لیکر مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد کا احاطہ کرتی ہے اور یہ ۱۸۸۳ء میں لاہور میں شائع ہوئی۔سالک رام نے لاہور ہی سے ''خیر خواہ کشمیر'' کے نام سے ایک ہفتہ روزہ جاری کیا۔اس کے علاوہ انہوں نے اردو لغات اور اردو محاورات کے نام سے کئی چھوٹی چھوٹی کتابیں مرتب کیں۔سالک کے بارے میں ڈاکٹر برج پریمی لکھتے ہیں:

''سالک کا ادبی ذوق بھی خستہ کی طرح لاہور کی ادب پرور فضاؤں میں پروان چڑھا تھا''۔ [۱۲]

ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان کو سرکاری سرپرستی ملنے کے ہندوستان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ملازمت کی غرض سے کثیر تعداد میں وارد ہوئے۔ان لوگوں زبان اردو تھی اور عام لوگوں کے ساتھ ان کے میل جول نے اردو کی ترقی میں بڑی مدد کی۔ یہ لوگ شعری محفلوں کا اہتمام بھی کرتے تھے اور یوں مقامی نوجوانوں میں ادبی شعور بیدار ہوتا چلا گیا۔ان بزرگوں میں چوہدری خوشی محمد ناظر،

مولوی عبد الصمد، مولوی نذیر احمد ملک، ملک شیر محمد، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کے نام خصوصیت کے ساتھ شامل ہیں۔

بیسویں صدی کی شروعات کے ساتھ ہی ریاست جموں و کشمیر کے عوام کی تعلیمی حالت سدھارنے کے لیے کئی ایک انجمنیں وجود میں آئیں۔۱۹۱۴ء میں آفتاب احمد آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی منظوری سے ریاست میں ایک وفد کشمیر بھیجی گئی۔اس وفد نے ریاست کے مہاراجہ پرتاب سنگھ کو کئی تجاویز پیش کیں تا کہ ریاست کی تعلیمی حالت کو بہتر بنایا جا سکے۔اس کے علاوہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کا قیام بھی عمل میں آیا تا کہ کشمیری نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے سہولیتیں فراہم کی جائیں۔ اس کے علاوہ ۱۹۰۰ء میں جموں کے چند دردمند بزرگوں نے ریاست کے مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی اور معاشی بدحالی کو محسوس کرتے ہوئے انجمن حمایت اسلام لاہور کی تقلید میں جموں میں ’انجمن اسلامیہ‘ کی بنیاد رکھی۔ یہ انجمن کی طرف سے سالانہ جلسہ کا اہتمام ہوتا تھا اور اس جلسے میں ہندوستان کے نامور واعظوں،خطیبوں کے علاوہ شاعروں کو بھی مدعو کیا جاتا تھا تا کہ یہاں کے لوگوں کو تعلیم کی طرف راغب کیا جا سکے اور ادبی فضا کو ہموار کرنے میں مدد ملے۔ چناچہ مولوی نذیر احمد، مولانا شبلی، عبدالماجد دریا آبادی، مولانا عبدالحلیم شرر وغیرہ اس انجمن کے سالانہ اجلاس میں باقاعدہ شامل ہوتے تھے۔جن لوگوں نے اس انجمن کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا ان میں جنرل سردار سمندر خان، شیخ امام الدین، شیخ کریم اللہ، بابو محمد عبداللہ، شیخ عبدالحمید، کرنل پیر محمد، کیپٹن نصیرالدین، ملک غلام حیدر، ملک غلام نبی، مرزا فیروزالدین اور منشی محمد یعقوب۔اسی طرح وادیٔ کشمیر کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے مولانا میر واعظ فاروق نے کئی دردمند بزرگوں کی مدد سے ’’انجمن نصرت الاسلام‘‘ نامی انجمن کا قیام عمل میں لایا اور انہیں خطوط پر کام کیا جن پر جموں کی انجمن کر رہی

تھی۔

ریاست میں اب تک جتنی بھی ادبی انجمنیں وجود میں آئیں تھیں ان کی قیادت بزرگ کر رہے تھے اور نوجوانوں کی شمولیت ان میں نہیں کے برابر تھی۔ اس صورتِ حال کے پیش نظر ریاست کے پڑھے لکھے اور باشعور نوجوانوں نے مل کر ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء میں بالترتیب ''ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن'' اور ''بزمِ سخن'' نام کی انجمنوں کی بنیاد رکھی۔ ان تنظیموں کے مقاصد میں بھی بے جا رسموں کی اصلاح کے علاوہ تعلیم و تربیت اور اردو کا فروغ شامل تھا۔ یہ انجمنیں ریاست جموں و کشمیر کے نوجوانوں کی آواز بن گئی اور اردو کے فروغ میں ان انجمنوں کی خدمات نا قابلِ فراموش ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی ادبی انجمنیں قائم کی گئیں۔ اغراض و مقاصد قریب قریب تمام انجمنوں کے ایک جیسے تھے۔ ریاست کی ان تمام انجمنوں نے اردو کی ترقی و ترویج کے لیے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

ڈوگرہ حکمران مہاراجہ ہری سنگھ (۱۹۲۵ء۔۱۹۴۷ء) کو بھی ادب سے کافی دلچسپی تھی۔ انہوں نے بھی اردو زبان و ادب کی ترقی کیلئے کئی اہم اقدامات کئے۔ یہاں کے لوگوں کو علم حاصل کرنے کی طرف راغب کرنے کی کوششیں کی۔ پروفیسر ظہور الدین اس بارے میں رقمطراز ہیں:

> ''مہاراجہ پرتاب سنگھ کے بعد، مہاراجہ ہری سنگھ (۱۹۲۵ تا ۱۹۴۷ء) نے بھی اردو کی سرپرستی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اردو کے فروغ کے لئے یہاں اردو انسپکٹر آف اسکولز تعینات کئے، وہیں ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے لئے انعامات و اعزازات دینے کا سلسلہ بھی شروع کیا۔'' ۱۳

۱۹۴۷ء میں جموں و کشمیر میں عوامی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ بہت جدوجہد اور قربانی کے بعد ڈوگرہ حکومت کا خاتمہ ہوا۔ ریاست جموں و کشمیر میں نیا قانون بنانے کے بعد اردو کو سرکاری زبان کا

درجہ دیا گیا۔ واضح رہے کہ ریاست جموں وکشمیر ہندوستان کی واحد ایسی ریاست ہے جس کا اپنا قانون ہے اور تب سے لیکر آج تک یہ زبان یہاں پر چھائی ہے۔

ریاست جموں وکشمیر چونکہ ایک کثیر لسانی علاقہ ہے۔ اس کی تین بڑی اکائیاں جیسا کہ پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے جموں، کشمیر اور لداخ ہے۔ یوں تو ان تینوں خطوں میں بالترتیب ڈوگری، کشمیری اور لداخی بولی جاتی ہے مگر ان کے علاوہ یہاں کے طول وعرض میں میں اردو، ہندی اور پنجابی جیسی بڑی زبانوں کے ساتھ ساتھ گوجری، بلتی، پہاڑی، پوگلی، شینا، رام بنی، بھدرواہی، کشتواڑی، سراجی، بھلیسی، کھشالی، پاڈری، چمیالی اور پنگیالی وغیرہ جیسی چھوٹی چھوٹی بولیاں بھی مروج ہیں اور یہاں بولی جانی والی تمام زبانیں اپنے اپنے علاقوں تک محدود ہیں۔ نیز ان کا دائرہ اثر دوسرے علاقوں تک نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لیے کسی ایک علاقے کو دوسرے علاقوں پر لسانی اور سیاسی سرتری حاصل نہ ہوا ایک بہتر منصوبے کے تحت اردو زبان کو اس منصب سے سرفراز کیا گیا۔ لیکن انگریزی زبان کے استعمال کی گنجائش بھی واضح طور پر رکھی گئی۔ اس سلسلے میں ریاستی آئین کا دفعہ ۱۴۵ کے تحت یہ الفاظ درج ہیں:

> "The official langauge of the state shall be Urdu but the Engish langauge shall unless the legislature by law provides, continue to be used for all the official purposes of the state for which it was being used immediately before the commencemet of this contitution." [۱۴]

کشمیر میں اردو زبان وادب کی ترقی کیلئے بہت حضرات نے اپنا خونِ جگر صرف کیا۔ یہاں پر ہم اب ان شعراء وادباء کا ذکر کریں گے جنھوں نے اس زبان کو عوام میں مقبول کیا تا کہ ریاست کا

ادبی پس منظر اچھی طرح سمجھ میں آ سکے۔

اردو ادب کی جتنی بھی اصناف ہیں۔ بہت سے ایسے اہلِ قلم پیدا ہوئے جنھوں نے اردو کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کر کے ثابت کیا کہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب اور اردو زبان کسی دوسرے اردو کے مرکز سے کمزور یا پست نہیں۔ بلکہ ۱۹۴۷ء میں سرکاری زبان کا درجہ دینے سے ریاست کے حکمرانوں نے ثابت کیا کہ وہ کسی بھی طرح اردو کے بغیر اپنے تشخص کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔حامدی کاشمیری اس بارے میں رقمطراز ہیں:

> ''جہاں تک اردو شعروادب کا تعلق ہے اہلِ کشمیر نے اس میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔حق تو یہ ہے کہ کشمیر کی خدمات کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ کشمیر نے اردو کو کئی ایسے عظیم المرتبت شاعر اور ادیب دیئے ہیں جنھوں نے اپنی بے پناہ صلاحیتوں سے اسے توانائی، وسعت اور جامعیت عطا کی۔'' ۱۵

ریاست جموں وکشمیر میں اردو شاعروں اور ادیبوں کی تعداد بہت اچھی ہے۔ یہاں پر ان شعرا اور ادباء کا ذکر کیا جائے گا جنھوں نے اردو ادب کی بہت خدمت کی۔ ریاست جموں وکشمیر کے ادبی پس منظر کا تفصیلی جائزہ ایک الگ کتاب کا موضوع بن سکتا ہے۔اس لئے یہاں پر تفصیل کے بجائے اختصار کو مدنظر رکھا گیا ہے اور کشمیر کے ادبی پس منظر کا جائزہ لیتے ہوئے صرف اہم اردو اصناف اور شعراء وادیبوں کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اردو شاعری

ریاست جموں وکشمیر میں شاعروں کی پہلی کہکشاں انیسویں صدی کے اواخر سے بیسویں صدی

کے اوائل تک وجود میں آئی۔ان شاعروں کے بارے میں اگر چہ کوئی خاص موادفراہم نہیں ہوتا البتہ ''بہارگلشن کشمیر'' ایک ایسی کتاب ہے جس میں ان ابتدائی دور کے شاعروں کا ذکر آیا ہے۔ ان شاعروں میں پنڈت ہر گو پال خستہؔ، صادق علی خاںؔ، پیر زادہ محمد حسین، منشی محمد الدین فوق، مرزا مبارک بیگؔ، مرزا اسدالدین سعدؔ، راجہ شیر علی خاںؔ، تارا چند ترڑلؔ، کاشی ناتھؔ، منشی سراج الدینؔ، خوشی محمد ناظرؔ، قمر قمرازی، ڈاکٹر عماؔدالدین، حبیب کیفویؔ، قیس شیروانیؔ، وشوا ناتھ ورؔما، اللہ رکھا ساغرؔ، حمید نظامیؔ اور غلام حیدر چشتیؔ قابل ذکر ہیں۔

یہ شعراء کرام عام طور پر پرانے رنگ میں ہی لکھتے تھے۔غزل میں ہی انہوں نے اپنا خونِ جگر صرف کیا اور اپنے کلام کے بہترین نمونے پیش کئے۔ غزل میں یہ شعراء عشق و عاشقی، معرفت و تصوف ہی کو مختلف طریقوں سے بیان کرتے رہے۔کئی شعراء نے غزل سے باہر بھی قدم رکھا اور نظم میں بھی طبع آزمائی کی۔

ریاست جموں وکشمیر میں شاعری کے دوسرے دور کا آغاز انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہوا۔اگر چہ پہلے دور کے کچھ شاعر بھی اس دور میں شامل ہیں، لیکن نئے فنکاروں نے اردو شاعری میں کمال حاصل کیا۔ دوسرے دور کے شعراء اردو شعر و ادب سے بہت اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔ انہوں نے شاعری کیلئے ضروری شرائط کو اچھی طرح برتا اور بہترین کلام پیش کیا۔ حامدی کاشمیری دوسرے دور کے شاعروں کے متعلق رقمطراز ہیں:

> ''اس دور کے شعراء میں دوراوّل کے شعراء کی نسبت فنی شعور میں زیادہ
> پختگی اور رچاؤ ہے۔موضوعات میں زیادہ فکری گہرائی ہے''۔ ۱۶

دوسرے دور کے شعراء نے غزل کے ساتھ ساتھ نظم نگاری میں بھی کھل کر طبع آزمائی کی اور

بہترین نظمیں لکھی۔اس دور کے شعراء عشق و عاشقی اور تصوف ومعرفت جیسے مضامین سے کنارہ کش ہو گئے اور وہ سیاسی مسائل کی ترجمانی کرنے لگے۔دوسرے دور ہی میں اردوشاعری ریاست جموں و کشمیر میں حقیقی دنیا سے آشنا ہوئی۔اس دور کے شاعروں میں پرفیسر طالب کشمیری، شہہ زور کاشمیری، مرزا کمال الدین شیدا، میر غلام رسول نازکی، دینا ناتھ مست، منوہر لال، میکش کاشمیری، شاد شوریدہ کاشمیری، رسا جاودانی، غ۔م۔طاؤس، تنہا انصاری، کشن سمیل پوری، عبدالحق برق، سیفی سوپوری، عشرت کشتواڑی، اکبر جے پوری، غلام علی بلبل، عرش صہبائی اور قیصر قلندر قابل ذکر ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردوشاعری کے تیسرے دور کا آغاز ۱۹۴۰ء کے بعد ہوا۔چونکہ اس دوران تقسیم کا سانحہ بھی پیش آیا اور اس کا سب سے زیادہ اثر جموں وکشمیر پر پڑا۔اس دور کے شعراء نے ہندوستان کے دوسرے شاعروں کی طرح پرانی روش سے ہٹ کر نئے رجحانات جیسے داخلیت پسندی اور علامت نگاری جیسے موضوعات کو زیرِ بحث لایا۔اس دور کے اہم شاعروں میں حامدی کاشمیری، حکیم منظور، قاضی غلام محمد، ہمدم کاشمیری، عابد مناوری، شجاع سلطان، فاروق نازکی، پرتپال سنگھ بیتاب، رفیق راز شامل ہیں۔اس دور کے شاعروں کے بارے میں حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

> ''وہ (یعنی اس دور کے شاعر) روایت کے مادی اثرات سے بہت حد تک نجات پا کر تجربات اور زبان و بیان میں جدت پسندی کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ان کے یہاں فریب، گشتگی، محرومی اور تنہائی کی علامتی پیکرتراشی ملتی ہے'' [۱۷]

اردو افسانہ

شاعری کے علاوہ ریاست جموں وکشمیر میں آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد ادیبوں کی ایک کہکشاں پیدا ہوئی، جنھوں نے اردو نثر کی تقریباً تمام اصناف جیسے افسانہ، ناول، ڈراما، تحقیق وتنقید

اورصحافت وغیرہ میں طبع آزمائی کرکے پورے ملک میں اپنی ایک الگ پہچان بنالی۔

بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان میں پریم چنداور سجادحیدر یلدرم نے افسانے کی داغ بیل ڈالی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ صنفِ نثر بہت مقبول ہوئی۔کئی اہل قلم حضرات نے اس صنف میں طبع آزمائی کی اور بہترین افسانے لکھے۔جموں وکشمیر کے تعلقات چونکہ اس زمانے میں ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے استوار ہو چکے تھے۔ ہندوستان میں افسانے کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے یہاں کے ادیب بھی اس میں طبع آزمائی کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے کئی بہترین افسانہ نگار سامنے آئے اور بہترین افسانے لکھ کر اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔

ریاست جموں وکشمیر میں افسانے کے ابتدائی نقوش منشی محمد الدین فوق کے لکھے ہوئے مختلف قصوں میں ملتے ہیں۔اگرچہ ان قصوں کو پوری طرح افسانے کے زمرے میں نہیں رکھا جاتا ہے لیکن پھر بھی ان میں ہلکی سی افسانوں مہک ضرور محسوس ہوتی ہے۔دراصل فوق نے اپنے ان قصوں میں کچھ سماجی مسائل کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اس لئے ان پر افسانے کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

فوق کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں اردو افسانے کی طرف توجہ کرنے والے فنکاروں میں چراغ حسن حسرت، پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در، دینا ناتھ واریکو، تیرتھ کاشمیری، شام لال ایمہ، امیر کاشمیری، غلام حیدر چشتی، صاحب زادہ محمد عمر، رامانند ساگر، قدرت اللہ شہاب، نرسنگھ داس نرگس اور کشمیری لال ذاکر کافی اہم ہیں۔ان فنکاروں کے افسانوی مجموعے شائع ہوکر دادتحسین حاصل کر چکے ہیں۔

پریم ناتھ پردیسی نے اگرچہ ابتداء میں کچھ رومانوی طرز کے افسانے لکھے لیکن وہ اپنے آپ کو ترقی پسند نظریات سے بچا نہ سکے۔ چونکہ اس زمانے میں کشمیر کے لوگ ظلم کی چکی میں پسے جارہے

تھے۔ پردیسی نے اسی ظلم وتشدد کے خلاف کئی بہترین افسانے لکھے۔ جیسے دنیا ہماری۔شام وسحر اور بہتے چراغ وغیرہ۔حامدی کاشمیری پردیسی کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پردیسی نے کشمیری زندگی کی روح میں اتر کر اس کے پوشیدہ درد وداغ کی نقاب کشائی کی ہے۔'' ۱۸؎

پریم ناتھ دربھی ریاست جموں وکشمیر میں افسانے کی تاریخ کا ایک اہم نام ہیں۔اگر چہ پریم ناتھ درا کثر اوقات کشمیر سے باہر ہی رہے لیکن ان کے دل سے کشمیر کی محبت ہمیشہ رہی۔انہوں نے بھی کشمیر کی درد بھری زندگی کو بہترین انداز میں پیش کیا۔ان کے دو افسانوی مجموعے'' کاغذ کا واسودیوؔ' اور''نیلی آنکھیں'' ان کی فنکاری کی عکاسی کرتے ہیں۔

پریم ناتھ دراور پریم ناتھ پردیسی کے معاصرین افسانہ نگاروں میں دینا ناتھ واریکو، تیرتھ کاشمیری،شیام لال ایمہ،نندلال بےغرض، دینا ناتھ ،اسیر کاشمیری، اخگرعسکری،کوثر سیمابی، کاشی ناتھ کنول،گلزاراحمدفدااور جگدیش کنول اہمیت کے حامل ہیں۔ان حضرات نے کئی عمدہ افسانے لکھے اوراپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔

ان حضرات کے علاوہ جن لوگوں نے افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا اورفن افسانہ نگاری میں نام کمایاان میں رامانند ساگر، قدرت اللہ شہاب، نرسنگھ داس نرگس، کشمیری لال ذاکر، گنگادھر دھاتی شامل ہیں جنھوں نے فنِ افسانہ نگاری کو کشمیر میں عروج پر پہنچایا۔اگر چہ یہ ادیب اکثر اوقات کشمیر سے باہر رہے لیکن کشمیر کی محبت، ان کے دلوں کو ہمیشہ تڑپاتی رہی اوران سے کشمیر کے بارے میں لکھواتی رہی۔ان ادیبوں نے کشمیر کی معاشی اور اقتصادی زبوحالی کو اپنے افسانوں میں بڑی فنکاری سے پیش کیا۔دیہاتی زندگی کے مسائل کو بھی انھوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا۔

برج پریمی ان ادیبوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''............ان حضرات کی کہانیوں میں دیہاتی زندگی کی عکاسی خاص طور پر نظر آتی ہے۔اس کے علاوہ اپنے وطن کی بدحالی اور جاگیردارانہ نظام کے استحصال کو اپنی کہانیوں میں بے نقاب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔'' ۱۹

۱۹۴۷ء میں تقسیم کا واقعہ پیش آیا۔اس سانحے نے زندگی کے تمام شعبوں پر اپنا خاصا اثر ڈالا۔ ادیب اور فنکار بھی اپنے آپ کو اس اثر سے بچا نہ سکے۔ادب میں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔فن، موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے افسانہ نئی منزلوں سے ہمکنار ہوا۔کشمیر میں اس دوران جو فنکار، افسانے لکھتے رہے ان میں ٹھاکر پونچھی اور موہن یارو قابل ذکر ہیں۔موہن یارو کے افسانے سیاہ تاج محل، وسکی کی بوتل اور تیسری آنکھ بہترین افسانے تصور کئے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے فنکاروں میں سومناتھ زتشی، علی محمد لون، اختر محی الدین، بنسی نردوش، دیپک کول، تیج بہادر بھان، ویدراہی، پشکر ناتھ، حامدی کاشمیری، برج پریمی اور غلام رسول سنتوش وغیرہ شامل ہیں۔ان افسانہ نگاروں نے کئی بہترین افسانے لکھے اور زندگی کی حقیقتوں کو بڑی فنکاری کے ساتھ پیش کیا۔ان کے افسانوں میں ترقی پسند نظریات کی ترجمانی بھی ملتی ہے۔ برج پریمی ان افسانہ نگاروں کے موضوعات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''......ان کے یہاں محنت کش طبقہ اور ریاستی عوام کی ترجمانی کا احساس ہوتا ہے۔ چنانچہ ان افسانہ نگاروں کے یہاں خالی خالی رومان کے رنگ نظر نہیں آتے بلکہ حقیقت کی تلخیاں سامنے آتی ہیں۔'' ۲۰

۱۹۶۰ء کے بعد مغرب کے اثرات زندگی کے ہر شعبے پر پڑنے لگے اور مغربی اثرات نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ادب پر بھی مغربی اثرات نے اپنا گہرا اثر چھوڑا۔

ہندوستان کی طرح ریاست جموں وکشمیر میں بھی افسانوی دنیا میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ چنانچہ اب علامتی افسانہ، تجریدی افسانہ، لایعنی افسانہ وغیرہ وجود میں آئے۔ نئے تجربے کرنے والے فنکاروں میں عمر مجید، ویریندر پٹواری، مالک رام آنند، شبنم قیوم، اشوک پٹواری، پروفیسر ظہورالدین خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ان افسانہ نگاروں نے کئی بہترین افسانے لکھے۔ان کے افسانوں میں ایک طرف رومان کے دھندلے نقوش نظر آتے ہیں تو دوسری طرف زندگی کی حقیقتوں کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ برج پریمی ان افسانہ نگاروں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''یہ سب باصلاحیت کہانی کار ہیں اور انہوں نے نہ صرف روایتی انداز کی کہانیاں نہیں لکھی ہیں بلکہ روایت سے انحراف کر کے نئے اور تازہ موضوعات کو اسلوب کی نُدرت اور تازہ کاری سے اردو افسانے کو ترقی کی نئی سمتیں عطا کی ہیں۔ان کے یہاں ہلکے پھلکے رومان بھی نظر آتے ہیں اور عصری زندگی کی زخمی تمنائیں بھی ملتی ہیں۔'' [۲۱]

ریاست جموں وکشمیر میں آج بھی کئی بہترین افسانہ لکھنے والے موجود ہیں۔جن میں جان محمد آزاد، فاروق ریزو، غلام رسول آزاد، مشتاق مہدی، ترنم ریاض، حمیداللہ بٹ وغیرہ۔ان ادیبوں کے افسانے ریاست کے اہم روزناموں اور رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ان کے افسانوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ریاست میں اردو افسانے کا مستقبل روشن ہے۔

اردو ڈراما

ریاست جموں وکشمیر میں اردو کی ترویج وترقی میں ڈرامے کا بہت اچھا رول رہا ہے۔ ڈوگرہ حکومت میں جیسے کہ پہلے ہی بیان کیا چکا ہے کہ ریاست کے تعلقات ملک کے دوسرے حصوں سے

استوار ہو چکے تھے۔ ہندوستان میں اردو ڈرامے کی شروعات ہو چکی تھی اور کئی ڈرام کمپنیاں وجود میں آ چکی تھیں۔ یہ ڈرامے یہاں بہت جلد عوام میں مقبول ہو گئے۔اس سے متاثر ہو کر یہاں ایک ڈرامہ کمپنی کی بنیاد رکھی گئی اور کئی بہترین ڈرامہ اسٹیج کئے گیے۔ حبیب کیفوی نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بظاہر تو یہ کھیل تماشے تھےلیکن غیر شعوری طور پر ریاست میں یہاں کے ڈراما نگاروں نے اردو زبان وادب کی ترقی وترویج میں اہم رول انجام دیا ہے۔

ریاست جموں وکشمیر کے فنکاروں نے ڈراما میں بھی اپنی قابلیت اور ذہانت کے جوہر دکھائے ہیں۔ ریاست میں ڈراما نگاری کے ابتدائی نقوش بھانڈ پاتھر (کسی شخص کی حرکات کی نقل کرنا) میں ملتے ہیں۔ کشمیر کے یہ بھانڈ جگہ جگہ جا کر ڈرامے کھیلتے تھےاور تفریح وطبع کا سامان فراہم کرتے تھے۔

اس ریاست میں انیسویں صدی کے اواخر تک ڈرامے کی یہی صورتحال رہی۔انیسویں صدی کے آخر سے اردو کا اثر کافی حد تک پوری ریاست پر پڑا۔اس دوران ہندوستان کے مختلف شہروں سے ڈراما کمپنیاں یہاں آنے لگیں جو مذہبی قسم کے ڈرامے پیش کرتی تھیں۔ ہمارے ادیب وفنکار اردو ڈرامے کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اس میں اپنا زورِ قلم آزمانے لگے۔اس بارے میں برج پریمی لکھتے ہیں:

> ''ریاست کے بہت سے باذاق ادیب جنھیں ہندوستان کے مختلف شہروں میں جانے کا موقع فراہم ہوا تھا، ہندوستانی تھیٹر میں بہت سے ڈرامے دیکھ چکے تھے۔ چنانچہ ان کے دل میں بھی اسٹیج کرنے کا خیال پیدا ہوا۔اس لئے جب راس لیلا پارٹیاں جموں اور سری نگر آ کر ڈرامے اسٹیج کرنے لگیں اور انہیں مقبولیت حاصل ہوئی تو ہمارے نوجوانوں نے بھی اس شعبے میں اپنی صلاحیتیں آزمانے کے موقع تلاش کئے''۔ ۲۶

ریاست میں اردوڈرامے کی ابتداء محمد عمر اور نورالٰہی کی جوڑی سے ہوئی۔انہوں نے اردو میں کئی بہترین ڈرامے لکھے۔جن میں ''تین ٹوپیاں''، ''بگڑے دل'' اور ''ظفر کی موت'' کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ اردو زبان میں ڈرامے کی پہلی تاریخ ''ناٹک ساگر'' بھی ان ہی حضرات نے لکھی۔ پروفیسر عبدالقادر سروری اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ناٹک ساگر اردو میں ڈراما اور اسٹیج پر پہلی تصنیف تھی اور جس توجہ اور محنت سے وہ لکھی گئی تھی۔اس کی وجہ سے ادبی و علمی حلقوں میں اس کی بڑی قدر ہوئی۔'' ۲۷

۱۹۴۷ء کے بعد ریاست میں ڈراما نگاروں کی بڑی تعداد وجود میں آئی۔جن میں پریم ناتھ پردیسی اور پروفیسر محمود ہاشمی کافی اہم ہیں۔ ہاشمی کا ڈرامہ ''یہ کشمیر ہے'' بہت ہی مقبول ہوا اور ریاست میں اردو ڈرامے کا سنگِ میل بھی تصور کیا جاتا ہے۔ یہ ڈراما خالص وطن پرستی کے نعروں پر مبنی ہے۔ ڈرامے کی نوعیت کا اندازہ اس کے عنوان سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔

محمود ہاشمی کے علاوہ جن ادیبوں نے ریاست میں اردو ڈارما کو نئی بلندیوں سے آشنا کیا ان میں اختر محی الدین، سومناتھ زتشی، رام کمار ابرول، ٹھاکر پونچھی، سکھ دیو سنگھ، علی محمد لون، نری ہری رائے زادہ، پشکر ناتھ، زیڈ سیمی، وجے سمن، وجے سوری، بنسی نردش، جتندر شرما، وینو بھائی، وید راہی، شبنم قیوم کافی اہمیت کے حامل ہیں جنھوں نے کئی بہترین ڈرامے لکھے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ساتھ ہی ریاست میں ڈرامے کو نئی جہت ملی ۔ریاست میں عصر حاضر میں اردو ڈرامے کی طرف خاص توجہ دی جارہی ہے۔

تحقیق وتنقید

شاعری، افسانہ، ناول اور ڈراما کے ساتھ ساتھ ریاست جموں وکشمیر میں اردو تحقیق وتنقید کے

شعبوں میں بھی کافی پیش رفت ہوئی۔ اگر چہ مقدار کے لحاظ سے یہاں پر تحقیقی وتنقیدی کام بہت کم ہوئے ہیں لیکن اس مختصر سے تحقیقی وتنقیدی سرمایے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ریاست کے محقق ونقادِ ان شعبوں میں بھی عمدہ صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ جموں وکشمیر میں تحقیق وتنقید کے شعبوں میں زیادہ کام نہ ہونے کی وجوہات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر برج پریمی لکھتے ہیں:

’’... یہ پورادور ہمارے لکھنے والوں کے لئے عبوری دور تھا۔ اس لئے یہ توقع کرنا کہ ہمارے لکھنے والوں نے ادب کی جملہ اصناف......خاص طور پرادبی تنقید جیسے کم سن شعبے میں اپنا جوہر آزمایا ہوگا، بالکل بے جا ہے‘‘۔ ۲۲

اس ریاست میں تحقیق وتنقید کی ابتدا اسی وقت ہوئی جب ۱۸۸۲ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دور حکومت میں سرکاری اخبار بدیابلاس جاری کیا گیا۔ اس اخبار پر اگر چہ حکومت کا کنٹرول تھا لیکن کبھی کبھار اس دور کے معاشرے اور ادب کے بارے میں بھی تحقیقی اور تنقیدی مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس کے بعد کئی اخبار جاری ہوئے جن میں ’’وتستا‘‘ (۱۹۳۲ء اور ’’ہمدرد‘‘ (۱۹۳۵ء) کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان اخبارات نے اردو تحقیق وتنقید کے لئے راہیں ہموار کیں۔ کیونکہ ان اخبارات میں باضابطہ طور پر ادبی تخلیقات پر تبصرے شائع ہوتے تھے۔

ریاست میں باضابطہ طور پر اردو تحقیق وتنقید کی ابتداء محمد عمر ونورالٰہی کی معرکتہ آرا تصنیف ’’ناٹک ساگر‘‘ سے ہوئی۔ محمد عمر اور نورالٰہی نے مشترکہ طور پر کئی اہم کارنامے انجام دیئے لیکن ’’ناٹک ساگر‘‘ فنِ ڈراما نگاری میں امتیازی خصوصیت کی حامل ہے۔ اس کتاب میں ڈرامے کی تاریخ پر موثر انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ ’’ناٹک ساگر‘‘ کو جہاں اردو میں ڈرامہ نگاری کی تاریخ کے لحاظ سے خشتِ اول قرار دیا جاتا ہے، وہاں اسے ریاست کی اردو تنقید میں سنگ میل کی حیثیت حاصل

ہے۔

جموں وکشمیر کی تنقیدی وتحقیقی کتابوں میں عبدالاحد آزاد کی تصنیف ''کشمیری زبان اور شاعری'' سب سے اہم تسلیم کی جاتی ہے۔ یہ کتاب ریاستی کلچرل اکادمی نے ۱۹۵۹ء میں پہلی بار شائع کی۔اس معرکتہ آراء کتاب میں کشمیری زبان کے مشہور ومعروف شعراء کے بارے میں تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔اس کتاب کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں آزاد نے تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقیدی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔آزاد کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہمیں ان کے اس بیان سے اچھی طرح ہوتا ہے:

> ''ہر انقلاب پرانے تہذیب وتمدن کو نئے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ادب بھی انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کی ہر منزل پر نئے روپ بدلتا ہے۔مگر ہر نئے ادب کو پرانے ادب کے ساتھ گہرا ربط ہوتا ہے'' ۲۳

نندلال طالب اور پریم ناتھ بزاز نے بھی کشمیر میں رہ کر اردو ادب کی ترقی کے لئے اپنا خونِ جگر صرف کیا۔نندلال طالب نے اپنے شعری مجموعے ''بہارگلشن'' پر تبصرہ کر کے ثابت کیا کہ ان میں تنقیدی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے غالب پر کئی اہم مضامین لکھے اور جن کو ۱۹۸۰ء ''جائزہ کلام غالبؔ'' کے نام سے شائع کیا گیا۔ پریم ناتھ بزاز نے ''شاعرِ انسانیت (۱۹۵۲ء) لکھ کر اپنی تنقیدی صلاحیت کا لوہا منوایا۔'شاعرِ انسانیت' کشمیری زبان کے مشہور محقق اور شاعر عبدالاحد آزاد سے متعلق ہے۔ برج پریمی اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ کتاب عبدالاحد آزاد کی شاعری کے متعلق ہے اور ناقدانہ اندازِ نظر سے آزاد کے تخلیقی ذہن کے سوتوں تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے'' ۲۴

جموں وکشمیر میں ۱۹۴۷ء کا سال کافی اہمیت کا حامل ہے۔اس عہد میں زندگی کے ہر ایک شعبے

میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ادب میں بھی کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔مغربی خیالات ورجحانات ادب کے مختلف شعبوں پر اثر نداز ہونے لگے۔مختلف اصنافِ ادب کے ساتھ ساتھ تحقیق وتنقید کے شعبوں میں بھی مغربی خیالات نے انقلاب برپا کیا۔آزادی کے بعد جن اہلِ قلم نے تحقیق وتنقید میں قدم رکھا اور اہم خدمات انجام دیں ان میں ڈاکٹر عزیز احمد قریشی، حامدی کاشمیری، ڈاکٹر اکبر حیدری، محمد یوسف ٹینگ اور ڈاکٹر محمد زماں آزردہ قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر عزیز احمد قریشی نے ''ہماری قومی اور انقلابی شاعری'' (۱۹۵۹ء) اور'' جدید تنقیدی زاویے'' (۱۹۴۰ء) لکھ کر اپنی تنقیدی صلاحیتوں کو منوایا۔حامدی کاشمیری ریاست جموں وکشمیر کے نہ صرف مایہ ناز شاعر، ادیب اور افسانہ نگار ہیں بلکہ کہنہ مشق نقاد بھی ہیں۔اردو ادب کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے انہوں نے ''تاثراتی تنقید'' کا نظریہ پیش کیا ہے۔اپنی تنقیدی صلاحیتوں کی وجہ سے وہ ہندوستان بھر میں جانے جاتے ہیں۔انہوں نے کئی اہم تنقیدی کارنامے انجام دیئے ہیں۔''جدید اردو نظم پر یوروپی اثرات''، ''غالب کے تخلیقی سرچشمے''، ''نئی حسیت اور عصری اردو شاعری''، ''اقبال اور غالب''، ''معاصر تنقید ایک تناظر میں''، ''کارگہہ شیشہ گری''، ''ناطر کاظمی کی شاعری''، ''تفہیم و تنقید''، ''جدید شاعری کا منظرنامہ'' حامدی کاشمیری کی اہم تنقیدی و تحقیقی تخلیقات ہیں۔

اکبر حیدری بھی ریاست جموں وکشمیر کے اہم ناقدین میں شمار کئے جاتے ہیں۔انہوں نے تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقید میں بھی اہم خدمات انجام دی ہیں۔انہوں نے کئی اہم ادبی تصانیف لکھی ہیں مثلاً میر انیس بحثیت رزمیہ شاعر، مطالعہ زور، میر ضمیر، دیوانِ میر، ان کی بہترین تنقیدی تصانیف ہیں۔اکبر حیدری کے علاوہ ڈاکٹر برج پریمی بھی اردو دنیا میں اپنے تحقیقی وتنقیدی کام کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔انہوں نے سعادت حسن منٹو سے متعلق کچھ مضامین لکھ کر منٹو کی فنکاری کو اجاگر کرنے کی

کوشش کی۔اس کے علاوہ ان کے کئی تحقیقی وتنقیدی مضامین ملتے ہیں جن کی اہمیت تسلیم شدہ ہے۔

محمد یوسف ٹینگ جموں وکشمیر میں اردو تحقیق وتنقید کا ایک اہم نام ہے۔انہوں نے کشمیری اور اردو دونوں زبانوں کے ادب میں کافی خدمات انجام دی ہیں۔جان محمد آزادان کی تنقیدی خدمات کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپ (محمد یوسف ٹینگ) ایک بالغ النظر محقق اور بے لاگ نقاد کی حیثیت سے ملک بھر میں معروف ہوئے۔آپ نہ صرف اردو ادب پر اپنی گہری نظر کے ثبوت فراہم کرتے رہے بلکہ آپ کی نگاہ کشمیری ادب پر بھی بہت دور تک ہے''۔ ۲۵

کشمیر میں اردو ادب سے وابستہ کئی اور اہلِ قلم اور دانشوروں کے نام ملتے ہیں۔ان میں ڈاکٹر ظہورالدین، ڈاکٹر شیام لال، عابد پشاوری، ڈاکٹر منظر اعظمی، پروفیسر کنول کشن، پرنسپل جی لال کول، محی الدین قاضی، تنہا انصاری، رحمٰن راہی، ڈاکٹر شمس الدین، ڈاکٹر کاشی ناتھ، امین کامل، غلام رسول نازکی، قیصر قلندر، موتی لال ساقی، بلدیو پرشاد شرما، رشید نازکی، مرغوب بانہالی وغیرہ خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ان قلمکاروں نے ریاست جموں وکشمیر میں تنقید وتحقیق کے میدان میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر کے باشندے نہ ہوتے ہوئے بھی کئی اہلِ قلم حضرات نے یہاں قیام کے دوران تحقیق وتنقید میں کافی دلچسپی لی۔ان حضرات کا ذکر کیئے بغیر ریاست جموں وکشمیر کی ادبی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ان میں پنڈت برج موہن کیفی، دتاتریہ کیفی، جعفر علی خاں اثر، ڈاکٹر محمد الدین تاثیر، پروفیسر منظر اعظمی، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر محی الدین قادری زور، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر گیان چند جین وغیرہ کافی اہم نام ہیں۔ان

قلم کاروں نے تحقیق وتنقید کو نئے بال و پر دیئے اور کشمیر میں رہ کر انھوں نے جو کام کئے وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔

اردو صحافت

ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کی کوئی بھی تاریخ صحافت کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گی۔ کیونکہ یہاں اردو شعر وادب کی ترقی وترویج میں اخبارات ورسائل کا زیادہ حصہ رہا ہے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ صحافت کا بھی سرسری طور پر جائزہ لیا جائے۔

صحافت بنیادی طور پر نثر کا ہی ایک طاقت ور شعبہ ہے۔ ریاست جموں وکشمیر میں اردو سرکاری زبان بننے کے بعد کئی تخلیق کاروں نے سرکار کی اجازت سے اخبار جاری کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں ہر بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دورِ حکومت (۱۸۵۷ء تا ۱۸۸۵ء) سے لے کر مہاراجہ پرتاب سنگھ کے دورِ حکومت (۱۸۸۵ء تا ۱۹۲۴ء) کے زمانے تک یہ کوششیں برابر جاری رہیں لیکن حکومتِ وقت نے اس کی اجازت نہیں دی۔ ایسی صورتِ حال کے پیشِ نظر یہاں کے اہلِ قلم حضرات نے دوسرے شہروں کا رخ کیا اور مختلف اخبارات جاری کئے۔ ان اخباروں میں سیاسی، سماجی وادبی مسائل پر بھی گفتگو ہوتی رہی۔ ان میں سالک رام سالک، ہر گوپال خستہ، محمد الدین فوق جیسے صحافیوں نے اہم خدمات انجام دی ہیں۔ برج پریمی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ”پنڈت ہر گوپال خستہ اور ان کے بھائی پنڈت سالکرام سالک نے پنجاب سے کشمیر آتے ہی مہاراجہ رنبیر سنگھ سے درخواست کی تھی کہ انہیں ایک پریس قائم کرنے کی اجازت دی جائے اور ایک اخبار نکالنے کی بھی اجازت ملے لیکن ان کی درخواست کو بھی جب سابقہ مسترد کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے

لاہور میں مختلف اخبار جاری کیے۔'' ۲۸

مہاراجہ پرتاب سنگھ کے انتقال کے بعد حکومت کی باگ ڈور مہاراجہ ہری سنگھ کے ہاتھوں میں آئی۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے ۱۹۲۴ء میں مشہور صحافی لالہ ملک راج صراف کو ہفتہ روزہ اخبار ''رنبیر'' نکالنے کی اجازت دی۔ ''رنبیر'' کے رول کے بارے میں اکثر و بیشتر شبہ ظاہر کیا گیا۔ حبیب کیفوی اپنی کتاب ''کشمیر میں اردو'' میں لکھتے ہیں:

''ہفت روزہ رنبیر کی پالیسی حکومت نوازتھی البتہ حکومت پر کبھی کبھی بڑی نرمی سے تنقید کر دیا کرتا تھا۔'' ۲۹

اخبار ''رنبیر'' سیاسی لحاظ سے اگر چہ کوئی انقلابی رول ادا نہیں کر سکا کیونکہ حکومتِ وقت نے اخبار کے مالک کو واضح کر دیا تھا کہ اخبار حکومت کی پالیسیوں کی ترجمانی یا تنقید سے کوسوں دور رہے گا۔ ریاست کے ادبی حلقوں میں یہ اخبار کافی پسند کیا جاتا تھا اور یہاں کے اکثر قلم کار اپنی ادبی تحریریں اس میں شائع کراتے رہے۔ اس طرح یہاں کی عوام اردو کے بہت قریب آتی گئیں۔ یہ اخبار ۱۹۴۲ میں روزنامہ ہوا اور ۱۸ مئی ۱۹۵۰ء کو اس کی اشاعت رک گئی۔ کیونکہ اس پر الزام لگایا گیا کہ وہ یہاں کی سیاسی صورتِ حال سے لوگوں کو بیدار کرنے کا کام کرنے لگا ہے۔ بہر حال ''رنبیر'' ریاست کا پہلا اخبار تھا اور آگے چل کر یہ سلسلہ آگے بڑھتا گیا۔

مہاراجہ ہری سنگھ نے حکومت سنبھالتے ہی شروع شروع میں لوگوں کے دل جیت لینے کے لیے کئی اقدامات کیے لیکن یہ محض ایک سراب تھا۔ وہ بہت جلد عوام دشمن اور نا اہل مشیروں کے کہنے پر عوام سے لاتعلق ہو گیا۔ ملک میں ناخواندگی اور بے روزگاری بڑھتی گئی اور عوام کی زندگی اجیرن بن گئی۔ ایسی صورتِ حال کے پیش نظر مہاراجہ ہری سنگھ کے مشیر سر البین بینر جی Sir Albion

Banerjee نے اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ انہوں نے پریس کی عدم موجودگی کو بھی اپنے استعفیٰ کی وجہ بتلایا۔ انہوں نے اپنے استعفیٰ میں لکھا:

''سرکار اور عوام میں کوئی رابطہ نہیں ہے اور نہ انہیں شکایات پیش کرنے کے لیے کوئی مناسب موقع ملتا ہے۔ انتظامیہ کی مشینری کو سرے سے بدلنے کی ضرورت ہے۔ ریاست میں کوئی رائے عامہ نہیں ہے۔ پریس عنقا ہے اور تعمیری تنقید کے ذریعہ سے سرکار کے پاس استفادہ کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔'' ۳۰

اس دباؤ اور تنقید کو دیکھتے ہوئے پریس ایکٹ میں ترمیم ہوئی اور ۱۹۲۴ء سے باضابطہ طور پر اخبارات کا اجرا ہوا اور تقسیم ملک تک آتے آتے یہ تعداد ۵۰ کے قریب پہنچ گئی۔ ان اخبارات میں 'وتستا' 'ہمدرد' 'مارتنڈ' 'دیش' 'خدمت' کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اخبارات میں کافی پیش رفت ہوئی۔ اب ریاست میں اردو اخبارات اچھی خاصی تعداد میں شائع ہو رہے ہیں۔ جن اخبارات نے سیاسی بیداری کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کی ترقی میں اپنا رول ادا کیا ان میں سے ہمدرد، وتستا، مارتنڈ، دیش، کیسری، خدمت، حقیقت، صداقت، نور، خالق، البرق، رہنما، جیوتی، نوجیون، کشمیر ٹائمز، وکیل، خالد، آفتاب، سری نگر ٹائمز وغیرہ کافی اہمیت کے حامل ہیں۔

ریاست میں جن اہلِ قلم کاروں نے اردو صحافت کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں اپنا خونِ جگر صرف کیا ان میں ہرگوپال خستہ، سالک رام سالک، محمد الدین فوق، کشپ بندھو، ملک راج صراف، پریم ناتھ بزاز، معراج الدین احمد، نرسنگھ داس نرگس، نندلعل واتل، گنگا ناتھ دھر دیہاتی، ثناء اللہ بٹ، شمیم احمد شمیم، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان اخبارات میں سہ روزہ اور ہفتہ روزہ دونوں شامل ہیں۔ ان اخبارات کے معیار کو بلند کرنے کے لیے اردو کے مقبول و معروف اور باصلاحیت فنکاروں، شاعروں اور ادیبوں کا تعاون بھی

حاصل کیا گیا۔ یوں ایک طرف ان فنکاروں کی حوصلہ افزائی ہوئی اور دوسری طرف ریاست میں اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت میں اضافہ ہوا اور آگے چل کر ایسے کئی قلم کار نمودار ہوئے جنہوں نے اپنے قلم سے پورے ملک میں اپنی شناخت اور پہچان بنا لی ۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں اخبارات کے ساتھ ساتھ کچھ رسائل بھی شائع ہوتے رہے۔اس سلسلے میں ''پریم'' اور ''فردوس'' نامی رسائل کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ان رسائل کی مدد سے بھی ریاست کے اردو ادیبوں کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملا۔ان کے علاوہ آل سٹیٹ کلچرل کانفرنس نے ''کونگ پوش'' اور ترقی پسند مصنفین نے ''آزاد'' رسائل نکال کر اردو شعروادب کی خدمت کی اور یہاں کے فنکاروں کو نئے ادبی رجحانات سے آشنا کیا۔ جموں صوبہ سے ''ادبیات'' ترقی پسند نظریات کا ترجمان بنا۔ کشمیر یونیورسٹی کے قیام کے ساتھ ہی اس میں شعبہ اردو بھی قائم کیا گیا اور کئی ادبی رسائل جیسے ''بازیافت'' کا اجرا ہوا۔ ''بازیافت'' برابر باقاعدگی سے شائع ہورہا ہے۔ادبی رسائل کی اشاعت میں کلچرل اکاڈمی کے رول کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ۔ اس ادارے نے ادبی میدان میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔اس کے اہتمام سے ''ہمارا ادب'' اور ''شیرازہ'' نامی رسائل شائع ہورہے ہیں ۔ان رسائل کی اشاعت سے ریاست میں اردو زبان وادب کے ساتھ ساتھ یہاں کی تہذیب و ثقافت کے بہت سے گوشے سامنے آرہے ہیں۔ ''شیرازہ'' ریاست جموں وکشمیر کے ہی نہیں بلکہ ملک کے تمام ادبی حلقوں میں اپنی ایک پہچان بنانے میں کامیاب ہو چکا ہے۔اس طرح سے اس مختصر وقت میں یہاں کے اخبارات ورسائل نے اردو کی ترقی وترویج میں کافی اہم رول انجام دیا ہے۔

بہرحال ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرزمین ہندوستان میں ریاست جموں وکشمیر کو اس وجہ سے اہمیت حاصل ہے کہ اس ریاست نے آزادی کے بعد جہاں اردو زبان وادب کو اپنے علاقے کی سرکاری

زبان کی حیثیت سے قبول کیا ہے، وہیں اس زبان وادب کی ہمہ جہت ترقی وترویج کے لیے عملی اقدام بھی انجام دیئے ہیں۔تاہم آزادی کے بعد جس تیز رفتاری کے ساتھ اس زبان وادب کے لئے جو کوششیں کرنی تھیں وہ اس لیے ممکن نہ ہوسکی کہ اس علاقے کے سیاسی، سماجی اور معاشی صورتحال میں ابتری پیدا ہوگئی اور یہی صورتِ حال اب بھی برقرار ہے۔جس طرح پورے ملک میں اردو کے تیئں حکومت سنجیدہ نہیں ہے اسی طرح یہاں کی ریاستی سرکار بھی اس زبان کی طرف لاپرواہی برت رہی ہے۔جس کی مثال یہاں پر اردو اکاڈمی کا قیام اب تک عمل میں نہ لایا جانا ہے۔

دوسری طرف انگریزی زبان کے بڑھتے ہوئے رجحان اور مغرب کی اندھی تقلید کی وجہ سے یہاں کی عوام اس زبان کو سیکھنے اور سیکھانے میں ہچکچاہٹ محسوس کررہی ہے۔ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان اگرچہ اس وقت بھی سرکاری زبان ہے لیکن اب شاید ہی کوئی تعلمی ادارہ ہو جہاں اردو ذریعہ تعلیم ہو۔لیکن پھر بھی اردو کی طرف لوگوں کا رجحان زیادہ ہے اور اس کا ثبوت یہاں سے شائع ہونے والے اردو اخبارات ہے۔اس کے علاوہ جموں وکشمیر سے بلاواسطہ یا بالواسطہ تعلق رکھنے والے شاعروں، افسانہ نگاروں، ڈرامہ نگاروں وغیرہ کے ہوتے ہوئے اس زبان کا مستقبل روشن ہونے کے امکانات موجود ہے۔

(ب) جموں وکشمیر میں اردو ناول کی روایت

ریاست جموں کشمیر ان ریاستوں میں ایک ہے جہاں اردو زبان کو عام لوگوں کے ساتھ ساتھ علماء وفضلاء، شعراء وادباء اور دانشوروں نے تقریباً ڈیڑھ صدی سے اپنائے ہوئے ہیں۔ اسے اپنے پیار ومحبت کی سوغاتیں ہی نہ دیں بلکہ دنیا سے اسی کے توسط سے رابطہ رکھنے کے علاوہ اپنے جذبات و احساسات کو اسی زبان میں پیش کیا۔ اسی لیے آج ریاست جموں وکشمیر اب اردو کا ایک اہم دبستان بن گیا ہے۔ یہاں بولی جانے والی تمام زبانوں میں اردو کو اولیت اور مرکزیت حاصل ہے۔ یہاں کے قلم کاروں نے اپنی اپنی مادری زبانوں کو چھوڑ کر زیادہ تر اسی زبان میں اظہارِ خیال کیا ہے جس کے نتیجے میں یہاں اس قدر اردو ادب پیدا ہوا کہ اس دبستان کی ایک الگ جامع ادبی تاریخ بن سکتی ہے۔ ہمارے ادبا وشعرا نے ابتدا ہی سے قریب قریب تمام ادبی اصناف میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو کی تمام تحریکوں اور رجحانوں کا بھی خیال رکھا۔ یوں تو کشمیر کی سرزمین نے اردو کے بڑے بڑے شعراء وادباء اور دانشورں کو جنم دیا ہے۔ یہاں پر اردو ناول نگاروں کی بھی ایک بڑی تعداد ملتی ہے جنھوں نے عمدہ ناول تخلیق کئے ہیں۔ یہاں جموں وکشمیر میں اردو ناول نگاری کی ابتدا اور ۱۹۴۷ء تک اردو ناول نگاری کا ایک جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ اول یہ کہ یہاں کے اکثر ادیب پریم چند سے متاثر ہو کر مختصر افسانے میں زیادہ دلچسپی لیتے رہے تھے۔ چونکہ ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ تھا اور یہاں کے لوگ انگریزوں اور جاگیردارانہ طبقے کے ظلم کے

خلاف لڑ رہے تھے ۔کشمیر کے لوگ بھی اسی طرح کے ظلم کے شکار تھے۔فرق صرف اتنا تھا کہ ہندوستان میں انگریز ظلم کررہے تھے اور کشمیر میں ڈوگروہ خاندان۔ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے ادب میں افسانے سے بہتر کوئی صنف نہیں۔اس لیے یہاں کے ادیبوں کا رجحان ناول کی بہ نسبت افسانے کی طرف زیادہ رہا۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول میں ادیبوں کی دلچسپی نہ لینے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ یہاں سے کوئی اخبار شائع نہیں ہوتا تھا جن میں یہاں کے ادیبوں کے ناول شائع ہوتے۔اخبارات و رسائل کے شائع ہونے کے بعد یہاں ادیبوں کے ناول اخبارات کے ذریعے قسط وار شائع ہونے لگے۔اسی خیال کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر برج پریمی لکھتے ہیں:

> ''مغرب میں اور خود ہندوستان میں فکشن کی ترویج اور اشاعت کے سلسلے میں اخبارات اور رسائل کا نمایاں رول رہا ہے۔اردو کے بیشتر ناول نگاروں کے ناول عرصہ دراز تک اخبارات اور رسائل میں قسط وار چھپتے رہے ہیں۔......کتنے ہی رسائل نے کتنے ہی ناولوں کو کتابی صورت میں شائع ہونے سے قبل اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ ہمارے فنکار اُس وقت اس صنف کی طرف متوجہ ہوئے جب جموں خطے سے ریاست کا پہلا اخبار ''رنبیر'' شائع ہونے لگا۔ ۳۱؎

اگرچیکہ ریاست جموں وکشمیر میں ناول کی روایت کوئی زیادہ پرانی نہیں ہے لیکن پھر بھی ناول کی صورت میں جو سرمایہ موجود ہے، وہ قابل قدر ہے۔کمیت کے اعتبار سے دیکھیں تو یہ ناول انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں لیکن کیفیت کے لحاظ سے یہ ناول مایوس کن نہیں ہیں۔اردو کے دیگر معروف ناول نگاروں کے ناولوں کے مقابلے میں یہاں کے ناول فنی اعتبار سے بلندی کو چھوتے نظر نہیں آتے لیکن پھر بھی جس انداز اور فنکاری سے یہاں کے ناول نگاروں نے ناول لکھے وہ کشمیر کی ناول نگاری کی

تاریخ میں کافی اہمیت کے حامل ہیں۔اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے منصور احمد منصور رقمطراز ہیں:

''یہاں کے ناول نگار بلاشبہ اُن فنی معیاروں کو چھونے سے قاصر ہیں جو اردو میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین وغیرہ نے قائم کئے ہیں۔لیکن یہاں کے ناول نگار جس فنی مہارت اور ریاضت کا ثبوت بہم پہنچا رہے ہیں وہ امید افزاء بھی ہے اور قابل ستائش بھی''۔ ۳۲

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اردو کے کچھ جانے مانے ادیبوں نے کشمیر کو اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے۔ان ادیبوں اور شاعروں نے کشمیر کی وادیوں، سرسبز و شاداب میدانوں، گھنے جنگلوں اور قدرت کی دیگر رنگینیوں کو اپنی تخلیقات میں پیش کرنے کوشش کی لیکن ان تخلیقات میں صرف کشمیر کا بیرون دکھائی دیتا ہے جبکہ یہاں کے لوگوں اوران کی معاشی وسماجی خستہ حالی ان کی نظروں سے اوجھل رہے۔کشمیر کی رنگین اور خوبصورتی کا ان پر ایسا جادو پڑا کہ وہ یہاں کی درد بھری زندگی کا اندازہ نہ کرسکے جبکہ کشمیر میں لکھے گئے ناول سرسری معلومات اور اخباری اطلاعات پر مبنی ناول یا ڈرامہ نہیں ہیں بلکہ یہ ناول یہاں کی معاشرتی زندگی کی سچی تصویریں پیش کرتے ہیں۔اس ضمن میں علی جواد زیدی لکھتے ہیں:

''بیرونِ کشمیر کے ادیب برابر اس جنتِ ارضی کے رومان خیز افسانے لکھتے رہے ہیں۔لیکن کرشن چندر، راما نند ساگر اور اوپندر ناتھ اشک تک کے قلم سے بعض اوقات غیر محتاط باتیں نکل گئی ہیں۔شاید اس کا سبب یہ ہو کہ ماضی کے حسین افسانے اور فطرت کے حسین مناظر کی چکا چوند میں وہ مادی حالات اور تاریخی متقضیات کو وقتی طور سے نظر انداز کر جاتے ہیں اور پھر اہلِ کشمیر کو اس پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان ممتاز اہلِ قلم سے ان کے سطحی مطالعہ کا شکوہ کریں۔تیج بہادر

،علی محمد لون، اختر محی الدین، امین کامل اور پشکر ناتھ، یہ سبھی افسانہ نویس حقیقت
کے چہرے سے رومان کی دلاویز نقابیں ہٹا کے کشمیر کے حقیقی اور فطری حسن کو
ہمارے سامنے لانے کی نیک کوششوں میں مصروف ہیں۔'' ۳۳ے

ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول کے ابتدائی نقوش انیسویں صدی کے نصف آخر سے ملنے شروع ہوتے ہیں۔ ریاست میں ناول کے ابتدائی نقوش کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر برج پریمی لکھتے ہیں:

''انیسویں صدی کے اواخر اور بیسوی صدی کے شروع میں سب سے پہلے ناول
نگاری کی شروعات پنڈت سالکرام سالک اور مولوی محمد الدین فوق نے کی''۔
۳۴ے

ایک اور جگہ یہاں ناول نگاری کے آغاز کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''کشمیر میں اردو ناول کی طرف کافی تاخیر سے توجہ ہوئی۔ اگرچہ بہت پہلے
پنڈت سالک رام سالک اور مولوی محمد الدین فوق نے اس صنف میں شروعات
کی تھی لیکن ابتدائی واضح نقوش پنڈت نندلال اور بے غرض کے یہاں نظر آتے
ہیں۔ جب انہوں نے موجودہ صدی کے تیسرے دہے کے دوران اپنا ناول
''تازیانہ عبرت'' کے عنوان سے لکھا جس کے کچھ حصے مقامی اخبارات میں شائع
ہوئے۔ یہ ناول رتن ناتھ سرشار کے ضخیم ناول ''فسانہ آزاد'' کے تتبع میں لکھا گیا
ہے اور اس میں آغاز سے انجام تک داستانی رنگ چھایا ہوا ہے۔'' ۳۵ے

اس طرح جموں وکشمیر میں اردو ناول نگاری کی ابتدا کا سہرا سالک رام سالک کے سر جاتا ہے۔ سالک کے ناول ''داستانِ جگت روپ'' اور ''تحفہ سالک'' سے کشمیر میں اردو ناول کی بنیاد پڑی۔ سالک کا عہد (۱۸۵۷ء تا ۱۹۲۹ء) رہا ہے۔ وہ بچپن ہی سے ادبی ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر چند اہم نثری تصانیف کے علاوہ شاعری کے کئی اچھے نمونے بھی چھوڑے ہیں۔ اگرچہ

سالک کی تصانیف کو بیشتر ناقدین ناول ماننے سے انکار کرتے ہیں کیونکہ اس میں داستانی طرز پر پلاٹ در پلاٹ کی تکنیک ملتی ہے اور مافوق الفطری عناصر کی کارفرمائی بھی ہے۔اس بات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر برج پریمی لکھتے ہیں:

"'داستان جگت روپ' ناول سے زیادہ ایک داستان ہے۔اس میں پلاٹ در پلاٹ کی تکنیک کا التزام کیا گیا ہے۔کئی مقامات پر فوق الفطری عناصر کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔" ۳۶

لیکن اس سے قطع نظر جموں وکشمیر میں اس سے پہلے کوئی نثری ناول موجود نہیں تھا۔اس لئے ابتداء میں ایسی غلطیاں درآنا کوئی مضائقہ نہیں تھا۔سالکرام سالک کی دوسری تصنیف "تحفہ سالک" نے پچھلی خامیوں کا ازالہ کیا اور اس میں قریب قریب وہ تمام عناصر پائے جاتے ہیں جو ناول کے لئے ضروری خیال کئے جاتے ہیں۔ان دو ناولوں سے ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول نگاری کی بنیاد پڑی اور دیگر ادیبوں کو اس صنفِ کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کیا۔"تحفہ سالک" ڈپٹی نذیر احمد کے ناول "مراۃ العروس" کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے کیونکہ اس میں "مراۃ العروس" کے قصے کی طرح کہانی ترتیب دی گئی ہے۔

سالک رام سالک کے فوراً بعد ہی منشی محمد الدین فوق (۱۹۴۵ء۔۱۸۷۷ء) نے بھی ناول نگاری کے میدان میں قدم رکھا۔انھوں نے سالک رام سالک سے بہترین ناول لکھے۔ریاست جموں وکشمیر کے اردو ادب کی تاریخ میں منشی محمد الدین فوق کا نام اردو صحافت نگار اور تاریخ نویس کی حیثیت سرِ فہرست ہے۔انھوں نے صحیح معنوں میں کشمیری عوام کی زندگی کے مسائل کو موضوع اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔انھوں نے "تاریخِ اقوامِ کشمیر" (تین جلد) کے علاوہ "خواتین کشمیر" اور "مکمل

تاریخ کشمیر'' جیسی مایہ ناز کتابیں لکھی۔اس کے علاوہ افسانوں اور ناولوں میں بھی طبع آزمائی کی۔فوق کے ناولوں میں ''انارکلی'' (۱۹۰۰ء) اور ''اکبر'' (۱۹۰۹ء) ایسے ناول ہیں جن سے ریاست جموں و کشمیر میں ناول نگاری کی باضابطہ ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں تحریر کئے گئے ہیں۔فوق نے ان کے علاوہ بھی کئی ناول تحریر کئے جن میں ''ناکام'' ''ناصح مشفق'' ''غریب الدیار'' اور ''نیم حکیم'' قابل ذکر ہیں۔فوق کے نالوں میں ''اکبر'' کو لوگوں نے بہت پسند کیا۔ یہ تاریخی ناولوں میں درجہ امتیاز رکھتا ہے، کیونکہ اس کے اکثر واقعات حقیقت پر مبنی ہے۔ برج پریمی کے مطابق:

''فوق کو اس بات کا یقین تھا کہ یہ ناول دلچسپی سے پڑھا جائے گا''۔ ۳۷

یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اسے دلچسپ انداز میں تحریر کیا ہے۔

فوق اور سالک رام سالک کے بعد جن ناول نگاروں نے نثر کے اس میدان میں طبع آزمائی کی۔ان میں موہن لال مروہ، وشوا ناتھ ورما اور شنبھو ناتھ ناظر کے نام قابل ذکر ہیں۔موہن لال مروہ جموں خطے سے تعلق رکھتے تھے۔انہوں نے ''داستان محبت'' کے نام سے ایک ناول لکھا جو ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔ وشوا ناتھ ورما نے ''تلاشِ حقیقت'' کے نام سے ایک قصہ لکھا جس پر ناول کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ اسی دوران کشمیر میں پنڈت نندلال دھر نے اس شعبے میں گہری دلچسپی لی۔انہوں نے ''تازیانہ عبرت'' لکھ کر ریاست میں ناول نگاری کی بنیادوں کو مستحکم کیا۔ یہ ناول ''فسانہ آزاد'' سے کافی حد تک ملتا جلتا ہے۔

۱۹۴۷ء سے قبل ریاست میں ناول نگاری کی تاریخ کا ایک اور اہم نام پریم ناتھ پردیسی کا ہے جنھوں نے افسانے کے علاوہ ناول کی طرف بھی توجہ کر کے اس میں وسعت پیدا کی۔اصل میں وہ ایک بڑے افسانہ نگار تھے۔اس صنفِ ادب سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ وہ ایک شاعر بھی تھے۔انہوں

نے اپنی شاعری میں کشمیر اور کشمیر کے لوگوں کی ابتر صورتِ حال کی بہترین عکاسی کی ہے۔ ان کی شاعری کشمیر میں آزادی کے متوالوں کے لیے ایک نئی توانائی فراہم کرتی ہے۔ محی الدین زور کشمیری ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پریم ناتھ پردیسی اصل میں ایک افسانہ نگار تھے لیکن انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہی کیا تھا۔ شاعری میں وہ رونق تخلص کرتے تھے۔ وہ ڈوگروں سے کشمیر کی آزادی کے خواہاں تھے۔'' ۳۸

انہوں نے ایک ناول ''پوتی'' کے عنوان سے لکھا جو ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں تلف ہوا۔ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے برج پریمی لکھتے ہیں:

''انہوں (پریم ناتھ پردیسی) نے ایک بھرپور ناول ''پوتی'' کے عنوان سے لکھا۔ لیکن تقسیم کے دوران یہ تلف ہوا۔ اور اس طرح سے ہم ایک اچھے ناول کے مطالعے سے محروم رہے۔'' ۳۹

غرض جموں و کشمیر میں اردو ناول کے ابتدائی نقوش ان متذکرہ ناول نگاروں کے ناولوں سے ہوتا ہے۔ لیکن اب یہ ناول ناپید ہیں۔ صرف ان کے لکھے جانے کا محض تذکرہ ہی ملتا ہے۔ اس طرح ۱۹۴۷ء سے قبل جموں و کشمیر میں اردو ناول کی ابتدا سے متعلق جو معلومات ملتی ہیں ان کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ناول اردو کے ابتدائی ناولوں سے متاثر ہو کر ہی لکھے گئے ہیں۔ ان میں وہ تمام خصوصیات ملتی ہیں جو ابتدائی ناولوں کی خصوصیت رہی ہے۔ مثلاً داستانی طرزِ اظہار، مافوق الفطری عناصر اور پلاٹ در پلاٹ کی روایت وغیرہ۔ لیکن ناول نگاری کی اس روایت کو ابتدائی عہد میں فروغ دینے والوں میں سالک رام سالک، محمد الدین فوق، موہن لال، وشوناتھ ورما، شنبھو ناتھ اور پریم ناتھ پردیسی کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے جنھوں نے کسی حد تک اپنے ناولوں کو حقیقی زندگی

سے جوڑتے ہوئے تکنیک کی طرف بھی خاص توجہ کی ۔غرض ابتدائی دور میں اردو ناول کی روایت اتنی مضبوط نہیں تھی جتنی ۱۹۴۷ء کے بعد رہی ۔ کیونکہ یہ اردو ناول کا عبوری دور تھا۔ یہاں ناول نگاری کی طرف توجہ کر کے ان ناول نگاروں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا اور جموں وکشمیر میں اردو ناول کی روایت کو قائم کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

حوالے:

۱: Prof. Fida M Hassanain. Kashmiriyat through the Ages,p2-
۲: عبدالقادر سروری، کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ،ص ۲۳
۳: فکر و تحقیق، سہ ماہی، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۳ء، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، ص ۵۹
۴: حبیب کیفوی، کشمیر میں اردو،ص ۱۰
۵: عبدالقادر سروری، کشمیر میں فارسی اردو،ص ۱۴۷
۶: حبیب کیفوی، کشمیر میں اردو،ص ۱۱
۷: ایضاً،ص ۱۵
۸: ڈاکٹر چمن لال بھگت، برج پریمی کی ادبی خدمات،ص ۴۵
۹: پروفیسر ظہور الدین، تعلیل و تاویل،ص ۳۱۸
۱۰: ڈاکٹر برج پریمی، کشمیر کے مضامین،ص ۱۸۵
۱۱: پروفیسر حامدی کاشمیری، ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب،ص ۵۷
۱۲: ڈاکٹر برج پریمی، ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما،ص ۲۱
۱۳: پروفیسر ظہور الدین، تعلیل و تاویل،ص ۳۲۱
۱۴: ماہنامہ، اردو دنیا، مارچ، ۲۰۱۵، ریاست جموں و کشمیر میں اردو زبان کی اہمیت اور مستقبل،ص ۱۴
۱۵: حامدی کاشمیری، ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب،ص ۳۹
۱۶: ایضاً،ص ۴۰
۱۷: ایضاً،ص ۴۲
۱۸: ایضاً،ص ۴۳
۱۹: برج پریمی، جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما،ص ۳۲
۲۰: ایضاً،ص ۳۳
۲۱: ایضاً،ص ۳۷
۲۲: ایضاً،ص ۲۷
۲۳: عبدالاحد آزاد، کشمیری زبان اور شاعری، جلد اول،ص ۱۵
۲۴: برج پریمی، جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما،ص ۴۳
۲۵: جان محمد آزاد، جموں و کشمیر کے اردو مصنفین،ص ۱۳۹

۲۶: ڈاکٹر برج پریمی، کشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما، ص ۱۰۰
۲۷: عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو۔ جلد دوم، ص ۲۷۴
۲۸: برج پریمی، کشمیر کے مضامین، ص ۱۸۹۔۱۹۰
۲۹: حبیب کیفوی، کشمیر میں اردو، ص ۲۹
۳۰: برج پریمی، کشمیر کے مضامین، ص ۱۹۲
۳۱: ڈاکٹر برج پریمی، جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما، ص ۴۰
۳۲: شیرازہ، جموں و کشمیر میں اردو ادب کے پچاس سال، جموں و کشمیر کلچرل اکاڈمی، سنہ اشاعت، ص ۱۷۴
۳۳: جہلم کے سینے پر، تیج بہادر، پیش، ص ۳
۳۴: ڈاکٹر برج پریمی، جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما، ص ۴۰
۳۵: کشمیر جاگ اٹھا، جان محمد آزاد، ص ۸
۳۶: ڈاکٹر برج پریمی، جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما، ص ۴۰
۳۷: ڈاکٹر برج پریمی، جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما، ص ۴۰
۳۸: فکر و تحقیق، فکر و تحقیق، سہ ماہی، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۳ء، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، ص ۶۸
۳۹: ڈاکٹر برج پریمی، جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما، ص ۴۰

باب سوم:

ریاست جموں و کشمیر میں اردو ناول:

(۱۹۴۷ تا ۱۹۶۰ء)

ہندوستان میں اردو ناول کا آغاز ۱۸۵۷ء کے بعد ہوتا ہے۔ یہاں ناول کی شروعات انگریزی ناول کے زیر اثر ہوئی۔ اگر چہ قصے کہانیوں کی روایت قدیم زمانے سے ہی ملتی ہے لیکن ناول کی ابتدا بحیثیت صنف کے انیسویں صدی کے آخری دور میں ہوتی ہے۔ اگر چہ ناول یہاں مغرب سے آیا لیکن موضوعات کے اعتبار سے لکھے جانے والے ناول خالص ہندوستانی ہیں۔ اسی وجہ سے یہاں لکھے جانے والے ناول انگریزی ناول سے متاثر ہو کر بھلے ہی لکھے گئے ہوں لیکن موضوعات کے اعتبار سے یہ ناول خالص ہندوستانی تہذیب و معاشرت کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ ابتدا میں گھریلو و خانگی مسائل سے شروعات ہوئی۔ بعد میں دیگر موضوعات مثلاً سیاسی و سماجی مسائل اس میں داخل ہوئے۔ اس طرح دنیا بھر میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے زیر اثر کئی اور مسائل اردو ناولوں کے موضوعات بننے لگے اور یوں اس کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔

ہندوستان کی آزادی اور اس کے ساتھ ہونے والی تقسیم نے یہاں کے تقریباً تمام انسانوں کو یکساں طور پر متاثر کیا۔ ایسے میں یہاں کا فنکار بھی اس متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ تقسیم ہندوستان کی تاریخ کا سب بدترین اور متاثر کن سانحہ تھا۔ جانے مانے مفکر اور اسکالر اے۔ جی۔ نورانی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"It is one of the great tragedies in recorded human history" [1]

بلاشبہ تقسیم کا سانحہ ہندوستان کی تاریخ کا سب سے بدترین واقعہ ہے۔اس واقعہ میں لاکھوں لوگ مارے گئے۔ نہ جانے کتنے بے گھر ہوئے اور نہ جانے کتنی عورتوں کی عصمت تار تار کی گئی۔ سرحدی پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی گئی۔کل تک جو لوگ میل جول اور بھائی چارے کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے، جنگ آزادی میں شانہ بہ شانہ انگریزی سامراج کے خلاف صف آرا تھے، وہی تقسیم کے اعلان کے ساتھ ہی ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے۔اس طرح سے برسوں سے یہاں پنپ رہی بھائی چارے اور آپسی میل جھول کی روایات نے دم توڑ دیا۔انسان انسانیت کے منصب سے گر کر جانوروں کی صف میں شامل ہوگیا۔ بلکہ جانوروں کی سطح سے بھی نیچے گر گیا۔

اس سانحے نے جہاں ایک طرف عام انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا وہیں ادیب اور فنکار بھی اس سے اپنے آپ کو نہ بچا سکے۔خصوصاً ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں تقسیمِ ہند کے حالات کو موثر انداز میں پیش کیا۔

اس موضوع کے تحت لکھا جانے والا پہلا کامیاب ناول رامانند ساگر کا ''اور انسان مر گیا ہے''۔ یہ ناول ۱۹۴۸ء میں پہلی بار لاہور سے شائع ہوا۔انگریزی زبان میں اس سانحے پر پہلا لکھا جانے والا ناول خوشونت سنگھ کا 'Train to Lahore' ہے۔ یہ ناول بھی رامانند ساگر کے ناول ''اور انسان مر گیا'' کے کئی سال بعد یعنی ۱۹۵۴ء میں پہلی بار شائع ہوا۔

رامانند ساگر

رامانند ساگر کی ولادت ۲۹/ دسمبر ۱۹۱۷ء کو لاہور کے نزدیک اصل گور کے مقام پر ہوئی۔ ان کا

اصلی نام چندرارام تھا۔ان کے پردادالالہ شنکرداس چوپڑا پشاور سے ہجرت کر کے کشمیر میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔ رامانند ساگر کے دادالالہ گنگارام نے سری نگر شہر میں تجارت کا پیشہ اختیار کیا اور بہت جلد سری نگر کے تجارتی حلقوں میں خوب نام کمایا۔ وہ ماں باپ کی محبت سے محروم رہے۔ ان کا بچپن مصائب میں گذرا۔جس کے نتیجہ میں ان کی زندگی میں کئی موڑ آئے۔

رامانند ساگر بچپن ہی سے کافی ذہین تھے۔انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ''پریتم پرتیکھشا'' لکھ کر کیا جو شری پرتاب سنگھ کالج ،سری نگر کے سالانہ ادبی رسالے میں شائع ہوا۔ پڑھائی کے دوران رامانند ساگر مختلف چھوٹے موٹے کام کرتے رہے۔جن سے زندگی کا گذر بسر ہو رہا تھا۔۱۹۴۲ء میں وہ یونیورسٹی آف پنجاب سے فارسی اور سنسکرت میں گولڈ میڈلسٹ رہے۔اس کے بعد روزنامہ ''ملاپ'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔اس دوران انہوں نے ۱۳۲ مختصر اور طویل افسانے لکھے۔ وہ پہلے پہل رامانند چوپڑا کے نام سے لکھتے تھے لیکن آگے چل کر رامانند ساگر کے نام سے مشہور ہو گئے۔

رامانند ساگر کی شہرت ایک ادیب سے زیادہ ہدایت کار اور کہانی نویس کے طور پر ہوئی۔انہوں نے ہندوستان کی مشہور اساطیر ''رامائن'' سیریل بنا کر بہت شہرت حاصل کی۔ وہ ایک بہترین فلم ساز کے طور پر بھی اپنی ایک الگ شناخت رکھتے ہیں۔تقریباً ۴۰ سال تک وہ سنیما سے وابستہ رہے۔ ۱۹۴۹ء کے بعد سے ہی انہوں نے فلمی دنیا میں قدم رکھا اور کئی نئی طرز کی فلمیں بنائی جن کی نہ صرف ملکی سطح پر بلکہ بین الاقوامی سطح پر کافی پذیرائی حاصل ہوئی۔ یہاں ان کی ناول نگاری کا تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے۔

''اورانسان مرگیا'' رامانند ساگر کا شاہکار ناول ہے۔اس ناول کا پہلا ایڈیشن اگست ۱۹۴۸ء میں 'نوہند پبلیشرز لمیٹڈ بمبئی' سے شائع ہوا۔ادبی حلقوں میں اس کی بہت پذیرائی ہوئی۔ تقسیم

کے نتیجے میں ایک انسان پر کیا بیتی ان حالات کی روداد انہوں نے اس ناول میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ ناول ۱۹۴۷ء کے دردناک حادثات و واقعات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ اس ناول کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ انگریزی زبان میں اس ناول کا ترجمہ پی۔ ڈی۔ پانڈے نے "The Bleeding Partition" کے عنوان سے کیا ہے جو آرنلڈ پبلیشرز نئی دہلی سے ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔

اس ناول میں مشرقی اور مغربی پنجاب، لاہور اور امرتسر کے فرقہ وارانہ فسادات کے حوالے سے اس دور کے سماج کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس ناول میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ تہذیب وتمدن، محبت واخوت اور انسانیت کی بنیاد پر بنے ہوئے سارے رشتے جس دہشت اور انسانی درندگی کی نذر ہو گئے ہیں۔ اس کی مکمل طور پر عکاسی کی گئی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے دوران ہندوستان کی جو صورتحال تھی۔ اس سماج کی پہچان صرف دو لفظوں سے ہوتی ہے۔ ہندوؤں کا سماج اور مسلمانوں کا سماج۔ پاکستان میں مسلمانوں کو اور ہندوستان میں مغربی پنجاب کے باشندوں کو نئے سرے سے بسایا جا رہا تھا۔ انسانیت کے اس لین دین نے ہندوستان کی برسوں پرانی مشترکہ تہذیب کو نگل لیا تھا۔ مسلمانوں کو ہندوؤں اور سکھوں نے اور ہندوؤں وسکھوں کو مسلمانوں نے مارنا شروع کیا۔ بستیاں جلائی گئیں۔ بچوں کو نیزوں پر اچھالا گیا۔ عورتوں اور لڑکیوں کی تذلیل کی گئی۔ اس ناول کا خاص موضوع تقسیم ہند کا المیہ اور وہ تمام صورتحال ہے جو اس وقت رونما ہوئی تھی۔ ان تمام حالات کی بھرپور عکاسی اس ناول کے ذریعہ ہوتی ہے۔

رامانند ساگر نے یہ ناول اردو ادب کے مایہ ناز ادیب سہیل عظیم آبادی کے نام معنون کیا ہے۔ انتساب ہی سے ناول کی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

''سہیل عظیم آبادی کے نام:
بہار کے ہندوؤں نے جس کا سب کچھ لوٹ لیا لیکن جس کی انسانیت کو کوئی لوٹ
نہ سکا۔''۲

ناول کا دیباچہ اردو زبان وادب کے مشہور افسانہ نگار خواجہ احمد عباس نے تحریر کیا ہے۔ خواجہ احمد عباس نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ رامانند ساگر کسی سیاسی غرض یا سیاسی مقصد کے لئے قلم کا استعمال کرنا نہیں جانتے تھے۔ انھوں نے کسی بھی نظرئے یا سیاسی پارٹی کی نمائندگی نہیں کی۔ ان کے مطابق وہ بس ایک انسان بنے رہے اور انسانیت کے مرنے پر تلملا اٹھتے ہیں۔ یہ ناول بھی اسی انسانی دردمندی کی زندہ مثال ہے۔ لکھتے ہیں:

''مگر خوش قسمتی یا بدقسمتی سے وہ کسی پارٹی کا ممبر نہیں۔ صرف انسان پارٹی سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ انسانیت کے علمبردار فن کاروں کی اس بلند مرتبت صفت کا ایک رکن ہے۔ اسی لئے وہ سیاسی اور ہنگامی تاویلیں تلاش نہیں کرتا۔ اس نے انسانیت کو بہیمیت میں ہوتے دیکھا ہے اور وہ تڑپ اٹھا ہے اور اس درندگی کے لئے وہ ذمہ دار ٹھہراتا ہے، انسان کو، ہندوستانی کو، ہندو اور مسلمان اور سکھ کو، اونچے طبقے والوں کو اور نیچے طبقے والوں کو۔ آخر نفرت اور خون کے اس سیلاب میں کروڑ پتی سیٹھ اور بھوکے کسان سب ہی تو بہہ گئے تھے۔'' ۳

خواجہ احمد عباس کی تحریر سے صاف عیاں ہے کہ یہ ناول رامانند ساگر کی انسان دوستی اور انسانی ہمدردی کا نتیجہ ہے۔ اس ناول کے موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہوئے خواجہ احمد عباس نے اسے کلاسک کا درجہ دیا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک اس ناول کا موضوع ہو یا کردار وہ ہماری سماجی وتہذیبی صورتحال کی سچی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ جس کے آئینہ میں ہم اس عہد کو دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''یہ فن کا نہ صرف ادبی کمال ہے بلکہ اس کے خلوص اور انسان دوستی کا نتیجہ ہے۔ یہ ہنگامی لٹریچر نہیں ایک کلاسک ہے۔ اس کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ مرتی ہوئی انسانیت کی صدائے بازگشت ہیں۔ وہ ناول کے ذریعے۔ اس کے کرداروں کے ذریعے آپ کو آئینہ دکھا رہا ہے کہ اس میں انسان کے یعنی اپنے مسخ شدہ خدوخال دیکھ لیں۔ خوب پہچاں لیں کہ انسانیت کے مرنے کے بعد انسان کی کیا شکل ہو جاتی ہے۔'' ۴

''اور انسان مر گیا'' کا پلاٹ سیدھا سادہ لیکن غیر مربوط ہے جس کی وجہ سے واقعات کی کڑیاں مربوط نہیں ہے یعنی ناول چار حصوں اور سترہ ابواب پر مشتمل ہیں۔ پہلا حصہ ''سرخ فوارے'' دوسرا حصہ ''رقص شرر'' تیسرا حصہ ''میں بچ گیا'' اور چوتھا حصہ ''اور انسان مر گیا'' کے عنوان کے تحت ہے۔ یہ چاروں حصے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان میں کوئی خاص ربط نہیں ملتا۔ ناول کے مطالعہ کے دوران کوئی خاص مضبوط ڈھانچہ نہیں ابھرتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ناول جذبات کی رو میں بہہ کر لکھا گیا ہے۔ واقعات اور حالات کی یہی جذبات نگاری ناول کی بنیادی خوبی بھی ہے۔ لیکن فنی اعتبار سے اس میں خامی درآئی ہے۔ چنانچہ اسی خامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسلم آزاد لکھتے ہیں:

''جذباتی بیانات اور جذباتی تفصیلات نے ناول کو اثر انگیز تو بنا دیا ہے لیکن فنی سطح پر کوئی ندرت اور فکری سطح پر گہرائی نہیں ملتی۔ بہر حال یہ نقص اس طرح کے تمام ناولوں میں موجود ہے۔'' ۵

ناول میں ناول نگار را مانند ساگر نے ان دکھوں کو پیش کیا ہے جو ہندوؤں اور سکھوں پر مسلمانوں نے روا رکھے۔ ناول کی کہانی آنند کے گرد گھومتی ہے جو لاہور کا رہنا والا ہے۔ وہ موت و حیات کی کشمکش میں ہے۔ وہ یہاں سے دور جانا چاہتا ہے لیکن یہاں سے بھاگنے کے تمام راستوں پر موت کھڑی ہے۔ آنند جو ایک شاعر، عاشق اور انسان دوست ہے۔ فسادات کے حادثوں نے جسے دیوانہ

بنا دیا ہے۔ آنند کی لاچاری اور محرومی ہمیں اس دور کے انسانوں کی اندرونی کیفیات کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ ان انسانوں کی کہانی ہے جو تقسیم سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے اور تقسیم نے جن کا سب کچھ چھین لیا۔ اس کے علاوہ یہ ان لوگوں کا بھی المیہ ہے جنہوں نے بڑی تعداد میں ہجرت کی اور جو یہاں کی سیاست کا براہِ راست شکار بنے۔

آنند پورے ہندوستان میں امن قائم کر چاہتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ اپنی برداری میں اپنا سر اونچا رکھنے کے لئے سارے مسلمانوں کو مارنا چاہتا ہے۔ وہ ایک عجیب قسم کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ رامانند ساگر نے یہاں آنند کے کردار کے ذریعے ایسے انسانوں کی نمائندگی کی ہے جو فطرتاً امن پسند ہے لیکن حالات انہیں دہشت پسند بننے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''حتیٰ کہ ایک دو کے نیفوں میں ٹنگی ہوئی نئی نئی چھریوں کی چمک دیکھ کر نہ جانے کہاں سے یہ خواہش ایک لمحے کے لئے تو اس کے دل میں بھی پیدا ہوئی کہ ایک ایسی ہی چمک دار چھری ہاتھ میں لے کر وہ باہر نکل جائے اور اسے ہر راہ چلتے ہوئے مسلمان کے سینے میں اتارتا چلا جائے۔ حتیٰ کہ ہر ہندو نوجوان اسے رشک سے دیکھنے لگے۔ اس میں اسے کچھ اس طرح کا ہیرو پن محسوس ہونے لگا۔ جس کے لئے ہر لڑکی اس پر جان چھڑکنے لگے گی۔ اس وقت اوشا اس پر کتنا فخر کرے گی۔ آخر اس میں زندگی اور حرکت تو ہے۔ امن اور اہنسا میں بے حرکتی اور ایک مردہ سی شانتی کے علاوہ کیا رکھا ہے۔'' ۶

لیکن دوسرے ہی پل وہ ان ساری باتوں اور ایسے خیالات کو دل و دماغ سے نکال دیتا ہے کیونکہ انسان دوستی اس کی خمیر میں موجود تھی۔ اسی لئے جب اس کی برادری کے لوگ ایک مسلمان شمس الدین نامی شخص کو آگ کی نظر کرتے ہیں تو وہ اکیلا ہی آگ پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً

اقتباس دیکھئے:

’’آنند نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ بھاگتا ہوا وہ اپنی گلی میں پہنچ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے دیکھا کہ واقعی شمس الدین کے مکان کو آگ لگی ہوئی تھی اور کوئی نوجوان آگ بجھانے والا موجود نہ تھا۔ صرف ایک طرف دو چار بوڑھے اس آگ کو دیکھ دیکھ کر کچھ اس طرح ہاتھ مل رہے تھے۔ جیسے یہ شمس الدین کا مکان نہیں بلکہ خود ان کے بچپن کو زندہ جلایا جا رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی انھوں نے فریاد کے انداز میں پکارا۔ ’آنند۔۔۔ اس آگ کو بجھاؤ۔ دیکھو یہاں کوئی نہیں ہے۔‘‘ ؎

آنند پورے ناول میں چھایا ہوا ہے۔ ناول نگار نے آنند کا کردار تراشنے میں اپنی قابلیت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ناول پڑھتے ہوئے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ آنند میں جب بھی کچھ اچھا کرنے کی تمنا پیدا ہو جاتی ہے تو وہ اس کے دل ہی میں رہ جاتی ہے۔ یا پھر عمل کرنے کا ارادہ کرتا بھی ہے تو بہت دیر ہو جاتی ہے کیونکہ اس وقت تک حالات کروٹ بدل چکے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اوشا سے اپنی محبت کا اظہار کرنے میں تاخیر کر دیتا ہے جب وہ اسے ایک ریلیف کیمپ میں مل جاتی ہے تب بھی وہ اپنی زبان نہیں کھول پاتا جسکی وجہ سے وہ خودکشی کر لیتی ہے۔

ناول کا ایک اور اہم کردار سیٹھ کشوری لال ہے جو زمیندار طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ اسے نہ ہندوستان سے کوئی واستہ ہے اور نہ ہی پاکستان سے۔ بیوی اور بچوں کو دولت کی خاطر قربان کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ اسے اگر کسی چیز کی فکر ہے تو وہ اس کی جمع شدہ دولت ہے۔ وہ اپنی دولت اور مال و اسباب کی خاطر کوئی بھی مصیبت اٹھانے کے لئے تیار رہتا ہے۔ چنانچہ ملک کی تقسیم کے ساتھ ہی اسے جب احساس ہوتا ہے کہ نوجوانوں کے ساتھ صلح اور سمجھوتے سے ہی وہ اپنی جمع شدہ دولت کی حفاظت کر سکتا ہے تو اس کے رویئے میں اچانک سے ہی تبدیلی رونما ہوتی ہے: ایک اقتباس اس سلسلے

میں دیکھئے:

''سنگِ مرمر پر ایرانی قالینوں کا فرش بچھا ہوا تھا اور ان پر محلے کے نوجوان کچھ اس انداز میں بیٹھے ہوئے تھے گویا اس فرش کے ایک ایک انچ پر حسن کے لمس کی مہریں لگی ہوں اور اس ایک ایک انچ پر مکمل جسمانی قبضہ کرنا ہی ان کا مقصد حیات ہو۔

سیٹھ جی اچانک بے حد خلیق اور ملنسار واقع ہو چکے تھے۔ پچھلے چند دنوں سے انہوں نے محلے کے ہر ایک آدمی سے بات کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب اتنا ہی نہیں کہ وہ نمستے کا جواب بڑی خندہ پیشانی سے دینے لگ گئے تھے بلکہ کبھی کبھی خود بھی پہلے نمستے کر لیتے تھے۔ جب سے فساد شروع ہوا تھا خصوصاً محلے کے نوجوانوں کے ساتھ ان کا برتاؤ بالکل تبدیل ہو گیا تھا۔ پہلے کے بالکل برعکس۔۔۔کسی نوجوان کو دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں خوش آمدید کا سا انداز پیدا ہو جاتا۔ سنا گیا تھا کہ سیٹھ جی کی تجوریوں میں بلیک مارکیٹ کا دو، اڑھائی لاکھ روپیہ نقد پڑا ہوا تھا اور وہ فساد کے باعث بینک نہ کھلنے کی وجہ سے سخت پریشان تھے۔'' ۸

سیٹھ کشوری لال کا کردار بھی ناول میں جان پیدا کرتا ہے۔ اس کردار سے ہمیں خود غرض اور مفاد پرست لوگوں کی خاصیت کا علم ہوتا ہے۔ یہ منفی کردار ہے لیکن اس کردار کے ذریعے سماج کی اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے جو اس عہد میں رائج تھی۔ آزادی اور ملک کی تقسیم کے وقت ایسے لوگ تھے جنھوں نے اپنی دولت کو اپنے عزیز و اقارب پر فوقیت دی۔ جو اپنی دولت کو بچانے کے لیے اپنے اہل و عیال کو حملہ آوروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ چنانچہ اس ناول میں سیٹھ کشوری لال کا کردار ایسا ہی ہے۔ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ جب تک جیب میں ٹھوس ہے تو بیویوں کی کیا کمی ہے۔ آج بھی ایسے حادثات ہمارے سماج میں نظر آتے ہیں جب کوئی انسان دولت یا روپیہ پیسے کی خاطر

اپنے ہی بھائیوں کا قتل عام کرتا ہے۔یعنی بے حسی و خود غرضی ہر دور میں رہی ہے۔سیٹھ کشوری لال اسی طرح کے عیبوں میں مبتلا تھا۔

اوشا بھی ناول کا اہم کردار ہے جو سیٹھ کشوری لال کی بیٹی ہے۔ جسے کشوری لال وہیں فسادیوں کے درمیان چھوڑ دیتا ہے۔اوشا کے کردار میں ہمیں ایک بے بس عورت دکھائی دیتی ہے جسے اس کا باپ روپیہ اور پیسے سے زیادہ عزیز نہیں رکھتا۔ وہ آنند کو دل و جان سے چاہتی ہے لیکن کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاتی جس سے اس کے باپ اور خاندان کی عزت مٹی میں مل جائے یا لوگ اس کے باپ پر لعنت و ملامت کریں۔ وہ آخر تک آنند کو چاہتی ہے لیکن آنند کی طرف سے اسے ہمت یا حوصلہ افزائی کے کلمات بھی نہیں ملتے۔ نتیجے کو طور پر آنند کی خاموشی اس کی موت کا سبب بن جاتی ہے۔

غرض رامانند ساگر نے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء کے دوران صرف ایک ناول لکھا۔اس ناول کو اس اعتبار سے اہمیت حاصل ہے کہ اس کا موضوع ہندوستان کی تقسیم اور تقسیم سے پیدا شدہ حالات کا انسانی زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات رہا ہے۔اگر چیکہ کہانی اس کے مرکزی کردار کے گرد گھومتی ہے لیکن اس کردار کے اطراف رہنے بسنے والے انسانوں کی المناک صورتحال کو اس میں پیش کیا گیا ہے۔ موضوع ، کردار نگاری، جذبات نگاری، منظر نگاری اور اسلوب کی دلکشی کی بدولت اہمیت رکھتا ہے۔ پلاٹ میں بے ربطی کی وجہ سے تاثیر کی کمی ضرور نظر آتی ہے۔لیکن مجموعی حیثیت سے یہ ایک اہم موضوع پر لکھا گیا کشمیر کے ناولوں میں **بنیادی اور مقبول ترین ناول تصور کیا جاتا ہے۔**

ٹھاکر پونچھی

ٹھاکر پونچھی کا اصل نام سوہن لال تھا لیکن ٹھاکر پونچھی کے قلمی نام سے شہرت حاصل کی۔ وہ

پونچھ کے ایک راجپوت خاندان میں ۳۱/دسمبر ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئے۔ پونچھ اس زمانے میں ریاست جموں وکشمیر کی ذیلی یا جگیر دار ریاست تھی۔ ان کے والد کا نام ٹھاکر بھیم سنگھ تھا۔ انہیں ورزشی کھیلوں جیسے پولو اور نیزہ بازی میں خاص مہارت حاصل تھی۔ یہی وجہ سے وہ پونچھ کے راجہ جگت دیو کے چہیتے تھے۔ پونچھ کے راجہ انہیں اپنی نجی محفلوں میں شامل کرتے تھے۔ اس طرح ٹھاکر پونچھی بھی بچپن سے محل میں آنے جانے لگے۔ ان کی تربیت اچھے پیمانے پر ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مقامی وکٹوریہ جوبلی اسکول میں ہوئی۔ بعد میں کالج کی تعلیم کی غرض سے انھیں پرنس آف ویلز کالج (حال، گاندھی میموریل کالج) جموں میں داخل کیا گیا جہاں سے انہوں نے بی۔اے۔کی ڈگری حاصل کی۔ اس علاقے میں وہ اردو ادب کا سنہری دور تھا۔ اس دور میں یہاں ادب وثقافت نے نمایاں پیش رفت حاصل کی۔ ایسے ماحول نے بعض اردو ادبا کو پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا جنہوں نے آگے چل کر اردو ادب اور فن کے مختلف شعبوں میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔

سنگیت اور ادب کا شوق ٹھاکر پونچھی کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنی کتاب ''کشمیر میں اردو'' میں لکھا ہے کہ ٹھاکر پونچھی کا پہلا افسانہ ''راجہ'' کالج کے رسالے ''توی'' میں شائع ہوا۔ ادھر بعض دیگر محققین جیسے خوش دیومنی نے اپنی کتاب میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے ٹھاکر پونچھی کی پہلی کہانی ''کالکی'' ہے۔ یہ کہانی جموں کے ہفت روزہ چاند میں شائع ہوئی تھی۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ محکمہ سول سپلائی میں ملازم رہے۔ لیکن وہ اس ملازمت سے جلد سبکدوش ہوئے اور آل انڈیا ریڈیو میں کام کرنے لگے۔ اس بارے میں مالک رام اپنی کتاب ''تذکرہ معاصرین'' میں لکھتے ہیں:

"تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ اولاً چندے محکمہ سول سپلائی میں ملازم رہے۔ لیکن ان کی طبیعت کی جولانی کے لئے یہ میدان بہت تنگ تھا۔ وہ محض کلرک اور بے عملی کی زندگی پر قانع نہیں رہ سکتے تھے۔۔۔۔وہ واقعی علمی اورادبی صلاحیتیں لے کرآئے تھے۔ چنانچہ جب سول سپلائی محکمہ سے دل اچاٹ ہوگیا تو ۱۹۴۸ء میں دلی چلے گئے۔ آدمی وجیہہ اورشکل وصوررت کے لحاظ سے اچھے تھے، کچھ سفارشو ں نے بھی کام کیا ہوگا۔ غرض انھیں جلد ہی آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت مل گئی۔ یہاں وہ ڈوگری نیوز سروس میں سب ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔" 9

دہلی اس زمانے میں تقسیم کی وجہ سے صوبہ پنجاب سے آئے ہوئے پناہ گزینوں سے بھری پڑی تھی۔ وہ لوگ یہاں اپنی جان کی امان پانے کے لئے آئے تھے اورطرح طرح کی تکالیف میں مبتلا تھے۔ان لوگوں کے پاس سر چھپانے تک کے لئے جگہ نہ تھی۔ان حالات نے ٹھاکر پونچھی کو رنجیدہ کیا۔ وہ ان لوگوں کے لئے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ ایسے میں انہوں نے اپنے کچھ ساتھیوں اور فنکاروں کے ساتھ مل کر دہلی میں مختلف ڈرامے کئے اورکئی دوسرے طرح کے پروگرام بھی پیش کیے۔ یہاں سے ملنے والی آمدنی کوانہوں نے شرنارتھی ریلیف فنڈ میں جمع کیا۔ یہاں ان کے اندر انسان دوستی جیسے عظیم جذبے کا علم ہوتا ہے۔

دہلی کے آل انڈیا ریڈیو میں وہ ۱۹۷۱ء تک کام کرتے رہے۔ بعد میں اسی عہدے پر ان کا تبادلہ جموں ریڈیو اسٹیشن کو ہوگیا۔ یہاں انہوں نے اردو زبان وادب کے ساتھ ساتھ ڈوگری علم وادب کی ترقی کی طرف بھی خاص توجہ کی۔

مالک رام کے بیان کے مطابق ٹھاکر پونچھی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانے سے کیا۔ان کا پہلا افسانہ"خانہ بدوش" ہے جو ۱۹۵۰ء میں ہفتہ وار"ایشیا" سے شائع ہوا۔انہوں نے اہم اورغیراہم

درجن بھر ناول لکھے۔اس کے علاوہ ان کے تین افسانوی مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ان کے کئی اہم ناولوں اور افسانوں کا ملک کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ان کے ناولوں کے نام کچھ اس طرح ہے: ڈیدی، وادیاں اور ویرانے، رات کے گھونگٹ، شمع ہر رنگ میں جلتی ہے، زلف کے سر ہونے تک، چاندنی کے سائے، یادوں کے کھنڈر، پیاسے بادل، اداس تنہائیاں، جب پتھر روتے ہیں، یہ رشتے یہ روگ وغیرہ۔زندگی کے آخری ایام میں انہوں نے ایک ناول ''اب میں وہاں نہیں رہتا'' کے عنوان سے لکھا جو اگست ۱۹۷۴ء کو مکمل ہوا۔ان کی ناول نگاری کے بارے میں جان محمد آزاد اردو کے مشہور نقاد ڈاکٹر شکیل الرحمان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ملک کی تقسیم کے بعد جو ناول اردو میں لکھے گئے ہیں ان میں وہ جمالیاتی رچاؤ، فنی پختگی، نفسیاتی نکتے اور جذبات کے اتار چڑھاؤ کہیں نظر نہیں آتے جو مجھے ٹھاکر پونچھی کے ناولوں میں ملتے ہیں۔ بلا شبہ جدید دور میں ٹھاکر پونچھی کے ناولوں نے اردو ادب کی لاج رکھ لی ہے۔ان کے فن سے ہماری روایتوں کو آگے بڑھنے کا موقع ملا ہے۔اس کی یقیناً ایک تاریخی حیثیت ہوگی۔'' [۱۰]

ریاست جموں و کشمیر کے افسانہ نگاروں میں ٹھاکر پونچھی نے اپنی ایک الگ شناخت بنالی۔ان کے افسانوں کی گونج نہ صرف ریاست جموں و کشمیر میں بلکہ ملک کی دوسری ریاستوں میں بھی سنائی دیتی ہے۔ان کے افسانے فن کی کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں۔لیکن ان کی فنی صلاحیتوں اور تخلیقی نزاکتوں کا صحیح اندازہ ان کے ناولوں ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔ٹھاکر پونچھی کا پہلا ناول ''رات کے گھونگھٹ'' ہے۔

''رات کے گھونگھٹ'' ٹھاکر پونچھی کا پہلا ناول ہے۔یہ ناول ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔ریاست کے ادبی حلقوں میں اس کی کافی پذیرائی ہوئی۔یہ ناول شروع سے آخر تک دلچسپیوں کا مرقع

ہے۔ سماج کے ٹھیکداروں کی اس ناول میں قلعی کھول دی گئی ہے۔ ٹھاکر پونچھی کے ناول کی اس خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے جان محمد آزاد لکھتے ہیں:

> ''ٹھاکر پونچھی نے اس ناول میں سماج کے حسین چہرے سے پارسائی کے رنگین گھونگھٹ الٹ دیئے ہیں۔ ناول کا ہر باب ایک ایسی شوخ رومانی داستان ہے جسے پڑھ کر عش عش کر اٹھتے ہیں۔ مصنف نے حقائق کو عدیم المثال فن کاری اور بے باکی سے پیش کیا ہے۔'' [11]

ٹھاکر پونچھی نے اس ناول کی ابتدا میں اپنے خیالات کا اظہار ''پس منظر'' کے تحت کیا ہے۔ یہاں وہ ناول کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''رات کے گھونگھٹ' ان فرشتوں کی کہانی ہے جنہیں نئے نظام کی تاریک راتوں نے جنم دیا۔ ان انسانوں کی کہانی ہے جنہیں نئے نظام کے اجیالے دنوں نے موت کے گھاٹ اتارا۔ رات کو جو گھونگھٹ اوڑھے پھرتے ہیں ان ہی کے خدوخال میں ابھارے ہیں۔'' [12]

ٹھاکر پونچھی کے اس ناول میں سماج کے چہرے پر سے پارسائی کے پردوں کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ یہ ناول ۱۵۵ اصفحات پر مشتمل ہے۔ ناول میں مختلف کردار ابھرتے ہیں۔ جو بظاہر دن میں نیکی اور شرافت کا لبادہ اوڑھے رہتے ہیں اور رات میں وہ اپنے اصلی رنگ وروپ میں نظر آتے ہیں۔ اس طرح کہانی آگے بڑھتی ہے۔ یہ ناول سجاد ظہیر کے مشہور ومعروف ناول ''لندن کی ایک رات'' کی طرح ایک رات کے واقعات پر مشتمل ہے۔

ناول کے ہر باب سے رومانیت کا اثر جھلکتا ہے۔ مصنف نے سماجی حقیقت نگاری کا ثبوت بہت ہی بے باک اور فنکارانہ طریقے سے پیش کیا ہے۔ دوسری طرف اس ناول کی خوبی یہ بھی ہے کہ

اس میں اردو کے معروف ناول نگار مرزا ہادی رسوا کے ناول ''امراؤ جان ادا'' کی تکنیک سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ ہادی رسوا نے جس طرح اپنے ناول کے مختلف کرداروں کو امراؤ جان ادا کے کوٹھے پر جمع کیا ہے اسی طرح ٹھاکر پونچھی نے اس ناول کے کرداروں کو کاسمو ہوٹل میں جمع کر کے کہانی کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ ٹھاکر پونچھی خود لکھتے ہیں:

> ''اس ناول میں مختلف کرداروں کی کہانیاں ہیں ۔ ان کا مرکز ایک ہے لیکن راستے مختلف ہیں ۔ یہ صرف ایک رات کی بات نہیں بلکہ پورے سماج کی بات ہے۔ پورے ماحول کا داغ ہے۔ پوری تہذیب کا سہاگ ہے۔ اجلے سفید ریشمی گھونگھٹ میں سیاہ چہرے ہیں۔'' ۱۳

ناول نگار نے کاسمو ہوٹل کے پس منظر میں مختلف کرداروں کی وساطت سے نئے سماج میں پنپ رہے ناسور کی طرف اشارہ کیا ہے۔ شہر کے جس مقام پر ہوٹل واقع ہے ناول نگار نے اس کے پس منظر میں جن چیزوں کو ابھارا ہے وہ پورے سماج کا ترجمان بن جاتا ہے۔ ناول میں واحد متکلم کی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔ ناول نگار نے سماج کے عزت دار اور دولت مند لوگوں کے چہروں سے نقاب ہٹانے کی کوشش کی ہے تا کہ ان کے اصلی چہروں سے بھی لوگ واقف ہو جائیں۔ ناول نگار یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ کس طرح ایک انسان دن اور رات میں مختلف نظر آتا ہے۔ جو انسان دن میں فرشتہ صفت نظر آتے ہیں وہ کاسمو ہوٹل میں داخل ہو کر کس طرح سے انسانیت کے منصب سے گر کر جانور بن جاتے ہیں اور رات ختم ہونے کے ساتھ ہی وہ پھر سے فرشتہ صفت بن جاتے ہیں۔

ناول میں ہماری ملاقات سب سے پہلے کنور صاحب نامی شخص سے ہوتی ہے۔ یہ کردار جاگیردارانہ ماحول کی ترجمانی کرتا ہے۔ جاگیرداروں کے یہاں جو دولت کی ریل پیل اور فراوانی نظر آتی ہے وہ سب کنور صاحب کے پاس بھی موجود ہے۔ دولت اور جاگیر کے علاوہ ایسے لوگوں کے

پاس رقص وموسیقی اور عیش وعشرت کے تمام سامان بھی موجود ہوتے ہیں۔ ناول نگار نے کنور صاحب کی کردار نگاری کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''شہر میں ان کے بہت سے ٹھکانے تھے۔ بہت سے اڈے تھے۔ جن کے چراغ ان ہی کے ہاتھوں جلتے۔ جوا ہوتا، رقص وموسیقی کی محفلیں جمتیں۔ خرید وفروخت ہوتی۔ پرانے اڈے اجاڑ کر نئے تعمیر کئے جاتے۔ جاگیردارانہ ماحول میں شراب اور عورت، رقص وموسیقی لازم وملزوم ہیں۔ کنور صاحب جنوں کی حد تک ان کے شیدائی تھے۔'' [۱۴]

ٹھاکر پونچھی نے کنور صاحب کا کردار تراش کر ناول میں ان تمام جاگیرداروں کی شخصیت کی ترجمانی کی ہے جنھوں نے دولت اور مال جمع کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور جنھوں نے غریب اور مفلس عوام کا خون چوسنے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ مزدور اور مفلس لوگ دن بھر ان جاگیرداروں کی کھیتوں میں کام کرتے تھے اور بدلے میں انہیں دو وقت کی روٹی بھی پیٹ بھر کر میسر نہیں ہوتی تھی۔ کنور صاحب ہوٹل میں داخل ہونے والے پہلے آدمی ہیں۔ ان کے آنے کے ساتھ ہی ہوٹل میں زندگی کروٹ لینے لگتی ہے۔ رقص وسرور کی محفل شروع ہوتی ہے جن سے کنور صاحب بھرپور لطف لیتے ہیں۔ کنور صاحب اور ان جیسے ہزاروں جاگیرداروں کا یہی معاملہ ہے۔ انہیں ان لوگوں کے دکھ، درد میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

ناول میں پروفیسر نارائن دت بھی اسی شکستہ تہذیب کا نمائندہ ہے۔ پروفیسر کی عمر تیس سال کی ہے۔ یہ پروفیسر کالج کی چہار دیواری میں ایک مکمل پروفیسر نظر آتا ہے۔ وہ کالج میں ہر ایک سے گھل مل جاتا ہے جیسے معلم نہیں خود طالب علم ہو۔ لیکن یہ سب کالج کی چہار دیواری تک محدود ہے۔ کالج سے باہر قدم رکھتے ہی وہ کسی کو نہیں پہچانتا اور ہر روز سورج ڈھلتے ہی وہ ساری دنیا سے بھاگ کر اسی

ہوٹل میں قدم رکھتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ پروفیسر تقسیم کے سانحے کا شکار ہے۔ کیونکہ وہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھا ہے۔ جب وہ گھر سے بھاگا تھا تو صرف اپنی بیوی کو اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔لیکن وہ بیوی پروفیسر کی شخصیت میں کوئی کشش نہ پا کر کسی اور کے ساتھ بھاگ جاتی ہے جس کا پروفیسر پر گہرا اثر ہوتا ہے اور وہ ہر وقت اسی کے خیالوں میں گم رہتا ہے۔

> ''دن برے ہوں تو اپنا سایہ بھی بھاگ جاتا ہے۔۔۔۔ باپ بھاگ گیا۔لکڑی کی منڈی بھاگ گئی۔ لاکھوں کا کاروبار بھاگ گیا۔ وہ کالج بھاگ گیا جس میں وہ پروفیسر تھا۔ وہ لوگ بھاگ گئے جن میں رہتا تھا۔ وہ سڑکیں بھاگ گئیں جن پر گھوما پھرا کرتا تھا۔ تو پھر بیوی کے بھاگ جانے پر کونسی حیرت کی بات ہے۔۔۔'' [۱۵]

پروفیسر کے علاوہ اس نئی تہذیب کے اور بھی نمائندے اس ناول میں نظر آتے ہیں۔ جو اپنی کرتوت اور اپنے اعمال کی وجہ سے کئی چہرے لے کر چلتے پھرتے اس ہوٹل میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ مسٹر کپاہی اور لالہ گھسیٹا رام چونے والے، جو پیشے سے ٹھیکدار ہیں اور سرکاری کاموں میں اتنا لوٹ کھسوٹ کرتے ہیں کہ ان کا شمار شہر کے امیر ترین اور ذی عزت ٹھیکداروں میں ہوتا ہے۔ ناول میں ایسے ٹھیکداروں اور سیاست دانوں کے چہرے سے بھی پردے ہٹانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ دراصل ٹھیکدار اور سیاست دانوں کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ٹھیکدار سیاست دانوں سے مل کے کمیشن پر ٹھیکہ حاصل کرتے ہیں اور کام صرف کاغذوں پر ہوتا ہے۔ ناول سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے جہاں ان ٹھیکداروں کی شخصیت کی نمایاں عکاسی کی گئی ہے:

> ''یہ رئیس لوگ ہیں۔شہر کے بہت بڑے ٹھیکدار۔ نئی سڑکیں، نئی عمارتیں اور نئے پل ان ہی کے زیرِ سایہ بن رہے ہیں۔ان کے کام کی بنیادیں اشترا کی اصولوں

پر رکھی گئی ہیں۔مل بانٹ کر کھاتے ہیں۔ان کی اپنی نئی پرانی گاڑیاں ہیں۔اپنے بینک ہیں۔اپنے اخبار ہیں۔اپنے انجینئر ہیں۔دفتروں میں خوبصورت لڑکیاں کام کرتی ہیں۔یہ شہر کے بہت بڑے آدمی ہیں۔شہر ان کے بغیر خالی ہے اور یہ شہر کے بغیر کھوکھلے۔آج کے دور میں سیاست اور ٹھیکداری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔دونوں لازم وملزوم۔سیاست بذات خود ٹھیکداری ہے اور ٹھیکیداری سیاست۔اسی لئے ان میں سے ہر کوئی کسی نہ کسی سیاسی جماعت سے ضرور منسلک ہے۔'' [۱۶]

اس کے ساتھ ہی سیاست دانوں کے مکر وفریب والے چہروں کی نقاب کشائی کے لیے ناول میں مہاشہ دیال سرن کا کردار تراشا گیا ہے۔مہاشہ دیال سرن لالہ گھسیٹا رام چونے والے کی طرح ہی سادہ لباس پہنتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن وہ اپنی سیاسی چالوں سے عوام کو خوب دھوکہ دیتے ہیں۔وہ ہر الیکشن میں موجودہ سیاست دانوں کی طرح عوام کو طرح طرح کی لالچ اور وعدے کر کے کامیاب ہوتا ہے لیکن عوام اور عام انسان کی حالت میں کوئی فرق اور بہتری نہیں آتی۔

اس کے علاوہ ہوٹل میں آنے جانے والے لوگوں میں شاعر اور افسانہ نگار بھی شامل ہیں۔لیکن یہاں پر آنے والے سب لوگ ان کے منہ نہیں لگتے۔ان سے ہر کوئی دوری بنائے رکھنا چاہتا ہیں کیونکہ وہ کبھی اپنے الفاظ کی جادوگری سے حقیقت کو لوگوں کے سامنے لا سکتے ہیں۔ساتھ ہی ناول میں ایسے کئی صحافی بھی ہیں جو پیسے کی خاطر اپنے فن اور ذمہ داریوں کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔

ہوٹل میں ہونے والے کرداروں میں کئی نسوانی کردار بھی شامل ہیں۔رانی ہوٹل میں داخل ہونے والی پہلی لڑکی ہے۔رانی ایسی لڑکیوں کی ترجمانی کرتی ہے جو عام اور سیدھی سادی تو نظر آتی ہیں لیکن زمانے نے جنھیں خودغرض اور جسم فروش بنا دیا ہے۔رانی محبت بھی کرتی ہے اور دھوکہ بھی کھاتی

ہے۔رانی کی محبت موجودہ دور کی محبت ہے جو ہوٹلوں میں پروان چڑھتی ہے رات کی سیاہی جس کی گواہ ہوتی ہے۔ جسے سماج کے ظالم ہاتھ مجبور کرتے ہیں کہ وہ محبت کے جال میں پھنس جائے اور پھر لوگ اسے دھوکہ دے کر اس کی زندگی کو ویران کر جاتے ہیں۔

غرض یہ ناول ایک ایسے سماج کی عکاسی کرتا ہے جہاں پر ذی عزت اور نفاست پسند لوگوں کے چہروں کی نقاب کشائی کی گئی ہے اور ان کے اصلی چہرے ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے'' ٹھاکر پونچھی کا دوسرا ناول ہے۔ یہ ناول ایک مصور کی کہانی ہے۔ اس مصور کا نام ویریندر بابو ہے۔ اس کے ساتھ ہی راجیش بھی کہانی کا اہم کردار ہے۔ وہ ویریندر بابو سے پہلی ہی ملاقات میں اس کا دوست بن جاتا ہے۔ یہ ناول دراصل ایک مصور کا المیہ ہے۔ اس میں ان کا درد و کرب اور سماج کے ہاتھوں ان پر روا رکھے جانے والے سلوک کی کہانی کو بہترین انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس ناول کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے جان محمد آزاد اپنی کتاب 'ریاست جموں وکشمیر کے اردو مصنفین' میں لکھتے ہیں:

> ''یہ ان مردوں کی کہانی ہے جو عورت کو ایسے عریاں انداز میں دیکھنے کی تمنا کرتے ہیں جس پر سے نظریں پھسل پھسل جائیں۔ اس تخلیق میں ایک اجڑی ہوئی تہذیب کا سارا درد سمٹ آیا ہے۔ یہ ایک نوجوان کا قصہ ہے جس کے ہاتھوں نے عورت کو حسن بخشا اسے خاتونِ خانہ بنا دیا۔'' [17]

مصور اور کہانی کار جب تک اپنے فن میں حقیقی زندگی اور داخلی احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتے رہے انھیں کوئی بھی مدح یا خریدار نہیں ملتا ہے۔ جب یہی مصور اور کہانی کار سچائی اور فن برائے فن کے نظریے کو قربان کرتے ہیں، بناوٹ اور تصنع کا لباس اوڑھ لیتے ہیں اور اپنے فن میں ظاہری نمائش اور عورت کے حسن کو عریاں کرتے ہیں تو پوری دنیا ان کے لیے زندہ ہو جاتی ہے۔ پوری

دنیاان کی مدح سرائی کرتی ہے۔ان کے فن کی داداور تعریف میں زمین وآسماں ایک کردیتے ہیں۔فن کاروں کی یہ حالت آج بھی ہمارے سامنے موجود ہے۔ کتنے ہی بہترین فنکار گمنامی کی زندگی جی رہے ہیں۔دنیاان کے کام اورفن پاروں کی کوئی قدر نہیں کرتی کیونکہ ان میں حقیقت اور تقدس ہوتا ہے۔ان میں سطحی جذباتیت نہیں ہوتی۔اس کے برعکس سطحی اور بناوٹی فنکاروں کو دنیا کے لوگ سرآنکھوں پر بٹھا لیتے ہیں۔

ناول کی شروعات ہی سے مصوراور کہانی کار کے فلسفۂ فن اور فلسفۂ حیات پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں۔کہانی کار جب تک اپنی کہانیوں کو اپنے خونِ جگر سے سینچتا ہے اس کا کوئی بھی مداح یا خریدار نہیں بنتا اور جیسے ہی وہ داخلی دنیا سے نکل کر خارجی دنیا میں قدم رکھتا ہے تو عریانیت وشہوانیت ان کی کہانیوں کا مرکز بن جاتی ہے۔ساری دنیاان کی کہانیوں کو بڑے شوق سے خرید لیتی ہے۔یوں وہ کچھ مدت میں ایک کامیاب کہانی کار بن جاتا ہے لیکن اسے سکون کی زندگی میسر نہیں آتی ہے۔اسی فلسفے کواس میں ان کرداروں کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔اقتباس دیکھئے:

> ''ایک دن تم اپنی کہانیاں بیچ کر گزارہ کرتے تھے،' ویریندر بابو نے دبی زبان سے کہنا شروع کیا۔'لیکن خوش تھے۔فٹ پات پر سویا کرتے تھے لیکن آرام کی نیند سوتے تھے۔میلا کچیلا لباس پہنتے تھے لیکن دھلے دھلے سے دکھائی دیتے تھے۔آج تمہارے پاس نوٹوں کے بنڈل ہیں۔بہت بڑی کوٹھی ہے۔سفید اجلا لباس ہے۔ہر طرف کی بھوک مٹانے کا سامان ہے۔پھر بھی تم خوش ہو، نہ تمہیں نیند آتی ہے اور نہ چہرے پر وہ پہلی سے شگفتگی ہے۔'' [18]

مصوراور کہانی کار مختلف مسائل جیسے فن کے لوازمات،ادب پر بحث کرتے ہیں۔دونوں کے خیالات میں قطبین کا فرق ہے۔چتر کار اپنی زندگی کی آخری سانس تک فن کو پیسے اور دولت وشہرت

کے لیے قربان کرنے کے حق میں بالکل بھی نہیں ہے جبکہ کہانی کار اپنے فن کو اپنی پیٹ کی آگ بجھانے اور دنیا میں دولت وشہرت کمانے کا ذریعہ سمجھتا ہے۔دونوں کردار اس سماج کے ٹھکرائے ہوئے ہیں جہاں ظاہری اور بناوٹی چیزوں کی اہمیت ہے۔کہانی کار پہلے ہی اپنے فن سے سمجھوتہ کر لیتا ہے جبکہ مصور ویریندر بابو آخری وقت تک اپنے فن کے ساتھ کسی بھی طرح کا سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نظر نہیں آتا ہے۔

اس ناول میں جذبات نگاری سے بھی کام لیا گیا ہے۔کس طرح دونوں کردار وقت کے ہاتھوں مجبور ہو جاتے ہیں۔کہانی کار راجیش کے خیال میں پیٹ کی بھوک سب سے بڑا مسئلہ ہے۔اس لیے کھانے کے لیے مرد اپنا ضمیر بھی بھیج دیتا ہے جبکہ ویرندر بابو اس کے برعکس سوچتا ہے کیونکہ وہ ایک آرٹسٹ ہے اس لیے چاہتا ہے کہ کاش پورے ملک کے لوگ آرٹ اور آرٹسٹ کی قدر کرتے اور سماج میں آرٹ کی اہمیت سے آگاہ ہو جاتے۔چنانچہ اس کے جذبات کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے:

> ’’آرٹ کی کتنی قدر و قیمت تھی۔وہ سوچتا۔کاش۔وہ قدر و قیمت سارے ملک میں ہوتی۔سارے ملک میں آرٹ کی اجیالی دھوپ کھلی ہوتی۔گوشے گوشے میں اس کے قدردان ہوتے اور پھر ملک کے کلاکار اپنی کلا پر زندہ رہتا۔کہانی کار اپنی کہانی پر اور شاعر اپنی شاعری پر زندہ رہتا۔‘‘ [19]

آرٹ اور فن سے دیوانگی کی حد تک محبت اور لگاؤ کے علاوہ ویرندر بابو روپ نامی لڑکی کی محبت میں گرفتار رہتے ہیں۔ناول میں کئی ایسے مواقع آتے ہیں جہاں پر وہ اپنی محبت کو حاصل کر سکتے تھے لیکن ناول نگار نے اس مرکزی کردار کو روپ کے ساتھ زندگی گذارنے سے باز رکھا۔یہاں پر ناول کمزور نظر آتا ہے اور فطری اختتام کے برعکس مصنوعی اختتام پر ناول ختم ہو جاتا ہے۔

روپ کے کردار کو ناول نگار نے کافی محنت اور لگن سے تراشا ہے۔وہ محبت کرتی ہے اور اپنی

محبت کو حاصل بھی کرنا چاہتی ہے۔ وہ اپنے والد سے ویرنندر بابو کے فن کی تعریف اس لیے کرتی ہے کہ وہ اپنی محبت کو پا سکے۔ اگر چہ کچھ دیر کے لیے اس کے والد منع کرتے ہیں لیکن روپ کی ضد کے سامنے وہ ہار مانتے ہیں۔ لیکن ناول کا ہیرو اپنی محبت کی ناکامی کا ذمہ دار خود ہوتا ہے۔ وہ روپ کے گھر جانے اور ان کے والد سے ملاقات کرنے کے بجائے کسی نامعلوم جگہ فرار ہو جاتا ہے کیونکہ اسے ڈر ہوتا ہے کہ کہیں روپ اسے ٹھکرا نہ دے۔

روپ کا کردار کافی اہم ہے۔ روپ کی نفسیاتی کیفیات کا بیان اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ اس نے آج تک جتنے بھی کلا کاروں کو دیکھا۔ اسے ان کے فن اور ان کی زندگی میں کافی تضاد نظر آیا۔ معصوم، حسین خیالوں کے خالق جسمانی اور روحانی طور پر کتنے بدصورت ہوتے ہیں اس کا تجربہ اسے خوب تھا۔ لیکن ویرنندر کو اس لیے دل و جان سے چاہتی ہے کہ وہ سب فنکاروں سے الگ تھا۔ ویرنندر کو پہلی بار دیکھ کر اسے لگا تھا کی چترکار اور چتر میں کوئی فرق نہ تھا۔

اس ناول میں ویرنندر کا کردار بھی کافی اہم ہے۔ وہ ایک فن کار ہے، ایک آرٹسٹ ہے۔ تصویریں بناتا ہے۔ وہ اپنے فن کو خونِ جگر دیتا ہے۔ وہ اپنے فن کے لیے راتوں کی نیند حرام کر دیتا ہے لیکن سماج میں وہ جس قدر اور عزت کا مستحق تھا وہ اسے نہیں ملتی۔ اس صورتِ حال میں وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے ناکام فنکار سمجھتا ہے۔

وہ اپنی تصویریں بیچنا چاہتا ہے تا کہ اپنے گھر اور اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کر سکے۔ لیکن ہر بار دولت مند تاجر اور سیٹھ اس کی تصویریں لینے سے انکار کرتے ہیں۔ ناول سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''ویرنیدر بابو چاہتا تھا ڈاک گھر بند ہونے سے پہلے ہی اسے اپنی محنت کی قیمت

مل جائے۔تا کہ وہ اپنی بہن کی راکھی کے دس روپئے بھجوا سکے۔کئی بار وہ سیٹھ کے
پاس تصویریں لے کر گیا تھا۔ ہر بار اسے ایک ہی جواب ملا۔
ذرا اور ابھارو۔'' ۲۰

ویرندر بابو اصل میں فنکاروں کے اس گروہ کی ترجمانی کرتا ہے جو فن کو مقصدیت اور روحانیت کا سب سے بہترین آلہ سمجھتے ہیں۔اسی وجہ سے ایسے فنکاروں کی موجودہ سماج میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ناول کا یہ کردار اس کشمکش میں مبتلا ہے کہ وہ دو وقت کی روٹی کے لیے اپنے فن کو قربان کر دے یا پھر اپنے ہی فلسفہ پر قائم رہے۔جس فن کے لیے اس نے اپنا خون جگر صرف کیا تھا اسی فن کو سر عام ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ویرندر بابو کے فن میں پاکیزگی اور سادگی تھی۔وہ شہوانیت اور عریانیت سے کوسوں دور تھا۔ناول سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''اب کی بار وہ تینوں تصویروں کو بنا سنوار کے سیٹھ کے پاس گیا تھا۔اب کی بار بھی وہی جواب ملا۔اس کے جی میں آیا کہ ان تصویروں کو سیٹھ کے گنجے سر پر پٹک دے اور اپنے ہاتھوں کو کاٹ کاٹ کر کھا جائے۔تا کہ دوبارہ کوئی چند روپیوں کے عوض عورت کے تقدس کو عریاں کرنے کا حکم نہ دے۔'' ۲۱

جب وہ سماج کی فرمائش کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے تو وہ سیٹھ کی بات مان کر اپنے فن کو ذاتی مقاصد کے ہاتھوں قربان کر دیتا ہے اور یوں ایک سچے فنکار کی موت ہو جاتی ہے۔اب وہ اپنے فن میں صرف ان ہی چیزوں کو پیش کرتا ہے جن کو سماج پسند کرتا ہے۔اس طرح وہ اپنے اندر کے فنکار کو خود اپنے ہاتھوں سے مار دیتا ہے۔وہ کہانی کار راجیس سے کہتا ہے:

'' ہاں، آتما کی بھوک مٹانے کے لیے، ویرندر بابو نے اسی رو میں جواب دیا۔
میں جانتا تھا تم طنز کرو گے لیکن چلتے چلتے اس دوراہے پر پہنچ کر میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ تمہارا راستہ صحیح ہے۔آرٹ نام کی چیز کی ابھی قدر نہیں۔دو برس کی

ٹھوکر نے مجھے سکھایا ہے۔ اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے، اپنے آرٹ کو زندہ رکھنے کے لیے ایسا راستہ اپنانا ہی پڑے گا جو ہر لحاظ سے گھٹیا ہو۔'' ۲۲

یوں یہ ناول ایک فنکار کی ناکامی اور نامرادی پر ختم ہو جاتا ہے۔ ناول کی زبان کافی سلیس اور عام فہم ہے۔ ناول کا پلاٹ بھی کافی چست ہے۔ ناول قاری کو اول سے آخر تک اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔ واقعات فطری طور پر رونما ہوتے ہیں۔

یوں تو یہ ناول ایک مصور اور ایک کہانی کار کی ناکامی معلوم ہوتی ہے لیکن اصل میں یہ ناول اس سماج کی عکاسی کرتا ہے جو اندر سے کھوکھلا ہے۔ جہاں پر بناوٹ اور تصنع ہے۔ ناول نگار نے بہترین انداز میں ایک فنکار کو زمانے اور سماج کے ہاتھوں مجبور کیا کہ وہ اپنے فن پر بناوٹ و شہوانیت کا لبادہ اوڑھ لے۔

'**قفس اداس ہے**' ٹھاکر پونچھی کا تیسرا ناول ہے۔ ناول میں کہیں پر بھی سنِ اشاعت درج نہیں لیکن داخلی شہادتوں سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ناول ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۵ء کے درمیان لکھا گیا ہے۔ یہ ایک نیم سوانحی ناول ہے جس میں ٹھاکر پونچھی نے اپنے ایک عظیم دوست، ملک کے بہترین مصور اور قلم کار غلام رسول سنتوش کی حالاتِ زندگی کو ناول کے روپ میں ڈھالنے کی بہترین کوشش کی ہے اور وہ اس کوشش میں کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔

غلام رسول سنتوش کا ناول ''سمندر پیاسا ہے'' ان کی اپنی زندگی کے بارے میں ہے۔ اس ناول کے بارے میں چوتھے باب میں تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ ٹھاکر پونچھی نے ناول ''قفس اداس ہے'' پر ''سمندر پیاسا ہے'' کا گہرا اثر ہے۔ دونوں ناولوں کے مطالعے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ٹھاکر پونچھی نے اپنا ناول ''قفس اداس ہے'' 'سمندر پیاسا ہے' کو سامنے رکھ کر لکھا ہے۔ دونوں ناولوں میں

پلاٹ کی ترتیب اور کہانی قریب قریب ایک جیسی ہے۔اس کے ساتھ ہی دونوں ناولوں میں واحد متکلم کی تکنیک کے سہارے کہانی آگے بڑھتی ہے۔مرکزی اور دوسرے کردار بھی ایک جیسے ہیں۔ناول میں جو واقعات پیش کئے گئے ہیں وہ بھی قریب قریب زماں ومکاں کے اعتبار سے ایک ہیں۔

ناول کی کہانی کچھ اس طرح سے ہے کہ ایک کردار سنتوش بچپن سے ہی باپ کی محبت اور شفقت سے محروم رہا ہے۔کیونکہ گھر کے حالات ایسے تھے کہ باپ کو اپنے بچوں کا پیٹ پالنے سے فرصت نہیں ملتی تھی۔یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ غریبی میں انسان کو اپنے بیوی بچوں کا خیال نہیں رہتا۔ ناول کا یہ کردار بھی غریبی کی کا شکار ہے اور پیار ومحبت سے کوسوں دور۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ان کے جائز حق سے محروم کرتا ہے جسکی وجہ سے اس کے بیٹے سنتوش کے کردار میں تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔اس کردار کے بارے میں ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''مجھے اپنے باپ کی وہ مہربان گود نہیں ملی جس کے لیے بچپن روتا ہے۔لڑکپن ترستا ہے۔۔۔جس نے مجھے غربت کا احساس دلوایا۔جس نے مجھے ہمیشہ کے لیے زندگی کی حقیقی مسرتوں سے دور کر دیا۔وہ اپنی مجبوریوں کا انسان تھا۔ایک غریب باپ تھا۔چاہتے ہوئے بھی اپنے بچوں سے پیار نہ کرسکتا تھا۔مجھے معلوم نہ تھا۔ماں باپ مر بھی جاتے ہیں۔کافی مدت کے بعد معلوم ہوا۔میں نے سوچ رکھا تھا کہ خالق کبھی نہیں مرتا۔ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔کتنی بڑی بھول تھی۔'' ۲۳

آگے چل کر سنتوش کی مصیبتوں میں کمی نہیں آتی بلکہ سخت مصیبتوں کا سامنا کرتا ہے۔اپنی ماں اور بھائیوں کے لیے کافی محنت ومشقت کے بعد کام شروع کرتا ہے لیکن وہ جس محبت اور شفقت سے بچپن میں محروم رہا جوان ہوکر بھی وہ اس میدان میں کامیاب نہیں ہوتا۔کیوں کہ وہ جس لڑکی سے محبت کرتا ہے۔اس کو سماج کے ظالم ہاتھ چھین لیتے ہیں۔اس طرح سنتوش میں اس سماج سے بغاوت کے

جذبات جنم لیتے ہیں۔اسے مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی محبت کو بھول کر اپنی ماں، بھائی اور خوبصورت وادی کو چھوڑ کر کسی جگہ چلا جائے۔اس کی غلطی صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک ہندو لڑکی، جو اسی کے محلے میں رہتی ہے،اس سے محبت کرتا ہے۔لیکن سماجی بندشوں کے آگے وہ مجبور ہوتا ہے۔

اس طرح ایک انسان بقول روسو جو آزاد جنم تو لیتا ہے لیکن موت تک وہ سماج کی بنائی ہوئی زنجیروں میں بندھا رہتا ہے۔ناول کی کہانی بھی ایسی ہے۔ناول میں ایسے ہی سماج پر چوٹ کی گئی ہے:

''میں نے ایسا ہی سنا اور سمجھا تھا۔لیکن اب معلوم ہو گیا کہ نام ہماری زندگیوں کے لیے کتنا بڑا بوجھ ہے۔نام نہ ہوتا تو سماج نہ ہوتا۔نام نہ ہوتا تو کوئی مذہب نہ ہوتا،کوئی دنیاوی بکھیڑا نہ ہوتا۔ہم ہر چیز کو نام دے دیتے ہیں۔آزاد روحوں پر مختلف اور مخصوص نام چسپاں کر کے انہیں آہنی زنجیروں میں جکڑ دیتے ہیں۔انسان میں تفریق اور نفرت کی طرح ڈال دیتے ہیں۔انسان کتنا ایک جیسا ہے۔لیکن نام کتنے مختلف ہیں۔اب میں جانتا ہوں اور اس بات کا قائل ہو گیا ہوں کہ نام میں ہی سب کچھ رکھا ہوا ہے۔دنیا میں نام ہی سب کچھ ہے۔'' ۲۴

سنتوش دراصل اس لڑکی کا نام ہے جس کی محبت میں ناول کا ہیرو گرفتار ہے۔لیکن دونوں کے مذاہب مختلف ہیں اس لیے سنتوش کی شادی کسی اور کے ساتھ کر دی جاتی ہے۔لیکن ناول کا ہیرو سنتوش کا نام نشانی کے طور پر مانگ لیتا ہے۔یوں یہ نام مصور اختیار کر لیتا ہے:

''جب لڑکپن کے ساتھی بچھڑتے ہیں تو اپنی یادوں کو بنائیے رکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی چیز بطور نشانی دے جاتے ہیں۔میں تمہیں''

میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا

''اپنا نام مجھے دے دو'' ۲۵

ناول کا ہیرو اپنی محبت کا نام تو اختیار کر لیتا ہے لیکن یہ بھی سنتوش پر بہت بھاری پڑ جاتا ہے۔ اس کے شوہر کو جب ان کی بچپن کی محبت کا علم ہو جاتا ہے تو وہ اسے کافی مارتا ہے اور اسے گھر سے نکال دیتا ہے۔ ناول کا ہیرو اب مشہور آرٹسٹ بن چکا ہوتا ہے۔ وہ سنتوش آرٹسٹ کے نام سے پوری دنیا میں جانا جاتا ہے۔ اسی دوران جب اسے بات کا علم ہوتا ہے کہ اس کی محبت کو ان سے دور ہونے کے باوجود ستایا جا رہا ہے۔ وہ در در کی ٹھوکریں کھا رہی ہے تو وہ اسے اپنے پاس بلا کر علاج و معالجہ کراتا ہے۔ لیکن صحت یاب ہونے پر سنتوش کا باپ، بھائی اور شوہر کوئی بھی اس کو اپنے گھر میں جگہ نہیں دیتے۔ ایسے میں مصور سنتوش اپنی محبت کو اپنے پاس رکھتا ہے اور اس طرح وہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو جاتے ہیں۔ اس موقع پر ناول نگار نے جذبات نگاری سے کام لیا ہے۔ چنانچہ ناول کا ہیرو کہتا ہے:

> ''مجھے اپنا بچپن مل گیا۔ لڑکپن مل گیا۔ جوانی مل گئی۔ مجھے سب کچھ مل گیا۔ ماضی، حال، مستقبل۔ وہ چیزیں بھی جنہیں میں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ بھی جنہیں پانے کی مجھے کبھی تمنا نہیں رہی۔ مجھے ابدی بہاریں ملی۔ ابدی مسرتیں ملی۔ ابدی ساتھی ملے۔ میں اپنے لوگوں کا محبوب آرٹسٹ بنا۔ محبوب شاعر بنا۔ کامرانیوں نے میرے قدم چومے۔ میں نے بجھے ہوئے مایوس دلوں میں زندگی بخشی۔ دھڑکنیں جگائیں۔ پژمردہ ہونٹوں پر پر امید زندگی کی شوخیاں بکھیریں۔ روتی ہوئی آنکھوں میں نقرئی مسکراہٹوں کے دیئے جلائے۔ پھر میرے اپنے ہونٹ مسکراتے نہیں۔ میرا اپنا دل ہنستا نہیں۔ ایک چاند کی سی زردی ہے جو میری آنکھوں میں تیرتی ہے۔ ایک قفس کی سی اداسی ہے جو ہمیشہ میں، میں اپنی یادوں بھری تنہائیوں میں اپنے روٹھے ہوئے اداس سے لمحوں میں اپنے کونگ پوش، اپنے مستقبل کو سینے سے لگائے سوچتا ہوں۔ گھنٹوں سوچتا رہتا ہوں۔۔۔ کیا میں

گنہگار رہوں؟'' ۲۶؎

ناول میں ۱۹۴۷ء میں رونما ہونے والے واقعات کا بیان بھی ملتا ہے۔ دراصل جس دوران کہانی کا ہیرو محبت کی آگ میں جلتا ہے۔ وہ سماج سے متنفر نظر آتا ہے۔ اسی دوران اس کے سامنے انسانوں کی حیوانیت سامنے آجاتی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی کی جدوجہد کے دوران ریاست جموں و کشمیر بھی فسادات اور جنگ و جدال کی آگ لپٹی نظر آتی ہے۔ پاکستان سے وادی میں داخل ہونے والے قبائلیوں نے ریاست کو تباہ و برباد کر دیا۔ دوسری طرف ہندوستان نے کشمیر کو بچانے کے لیے کم اور اپنے ساتھ ملانے کے لیے بھاری فوج بھیجی۔ ان سارے واقعات اور ساری صورتِ حال کا خاکہ ناول نگار نے کسی حد تک دیانت داری سے کھینچا ہے۔ مثال دیکھئے:

''اسی دوران اپنے وسیع و عریض ملک کے کسی کونے سے آندھی اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک ہیبت ناک طوفان کی شکل اختیار کر گئی۔ ملک کے مہذب شہروں کے تعلیم یافتہ لوگ اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ انسان درندہ بن گیا۔ اپنے ہی کلچر، تہذیب اور روایتی اخوت کا قاتل بن گیا۔ سارا ملک ایک خوفناک بھونچال کی زد میں آ گیا۔'' ۲۷؎

ناول کا پلاٹ کسی حد تک چست ہے۔ شروعات سے آخر تک ناول قاری کو تجسس میں رکھتی ہے۔ واقعات فطری انداز میں رونما ہوتے ہیں۔ کردار نگاری کے اعتبار سے بھی ناول عمدہ ہے۔ ناول میں زیادہ کردار نہیں ہیں۔ ناول کے اہم کرداروں میں سنتوش، جو ایک مصور اور شاعر ہے کافی اہمیت کا حامل ہے۔ ناول میں کئی ایسے موقعے آتے ہیں جہاں پر وہ کچھ کر سکتا تھا۔ لیکن وہ ہمیشہ سماج اور خاندانی اصولوں کو ملحوظ رکھتا ہے۔ کہیں پر یہ کردار بے عملی کا شکار بھی نظر آتا ہے۔ وہ سنتوش کی شادی کے وقت ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ سنتوش کی شادی کے بعد وہ اس کا نام اپنی تصویروں پر لکھتا

ہے۔ وہ ذرا سا بھی اس کے انجام کے بارے میں نہیں سوچتا جس کے نتیجے میں اس کی محبت سنتوش رسوا ہوسکتی ہے اور اس طرح اسے گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔ چونکہ کہانی حقیقی واقعات پر مبنی ہے اس لیے اسے جوں کا توں پیش کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ ناول غلام رسول سنتوش کی زندگی سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا اور ان کی زندگی میں ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں۔

ناول کے دوسرے اہم کرداروں میں سنتوش کا کردار بھی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ بھی سماج کے ہاتھوں مجبور ہو جاتی ہے۔ مار کھاتی ہے۔ گھر سے نکال دی جاتی ہے۔ لیکن امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتی۔ وہ مصور کو ڈھونڈ کر اس کے گھر جاتی ہے۔ وہ اس بات کا اقرار کرتی ہے کہ اگر اسے وہ نہیں اپنائے گا تو وہ موت کو گلے لگا لے گی۔

ناول میں زبان سادہ و سلیس استعمال ہوئی ہے۔ ناول نگار نے اپنے تمام ناولوں کا اسلوب سادہ و سلیس ہی استعمال کیا ہے۔ اس ناول میں منظر نگاری کے اعلا نمونے بھی ملتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ ٹھاکر پونچھی کا کامیاب ناول ہے۔

'خزاں کی خوشبو' ٹھاکر پونچھی کا ایک اہم اور دلچسپ ناول ہے۔ اس ناول کو ناولٹ کہنا بہتر معلوم ہوگا کیونکہ ناول کی ضخامت ۱۱۷ صفحات ہے۔ یہ ناول مکتبہ آشیانہ، نئی دہلی سے ۱۹۶۴ء میں پہلی بار چھپ کر شائع ہوا۔ ناول کا انتساب ٹھاکر پونچھی کے دوست پریتم سنگھ کنور کے نام سے ہے۔ انتساب میں وہ لکھتے ہیں کہ پریتم سنگھ کنور کے نام ۔۔۔ جو اپنی ایک بھولی بسری کہانی کا کہانی کار بننا چاہتا ہے۔

''خزاں کی خوشبو'' ناول ایک عورت کی ایثار اور قربانی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول کی کہانی بنواری لال نامی ایک کردار کی زبانی بیان کی گئی ہے۔ ناول کی کہانی بنواری لال اور ان کے ساتھیوں

دھرم چند، پریتم سنگھ، ساگر چند، دیال صاحب کے علاوہ چندرانی کے گرد گھومتی ہے۔ بنواری لال اور ان کے ساتھی عورت ذات کو حقیر سمجھتے ہیں۔ پورنما جسے بنواری لال دل و جان سے چاہتا ہے اس کی شادی کئی ایک وجوہات کی بنا پر کہیں اور کر دی جاتی ہے۔ پورنما کی شادی کے بعد بنواری لال کو عورت ذات سے ہی نفرت ہو جاتی ہے۔ ناول کے اس ایک اقتباس سے بنواری لال کی عورت کے تئیں نفرت کے جذبات کو ناول نگار نے بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ مثال ملاحظہ کیجیے:

''اس نے منہ کی کڑواہٹ نگلنے کی کوشش کی۔ وہ لکشمی دیوی کو پورنما کی کہانی سنانا چاہتا تھا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ مجھے عورت ذات سے ہی نفرت ہوگئی۔ اگر ماں زندہ نہ ہوتی۔ اس نے من ہی من میں سوچا۔ لیکن بات نہ کر سکا۔ کچھ بھی ہو ۔لکشمی دیوی بھی ایک عورت تھی۔ وہ خود تو عورت ذات سے نفرت کر سکتی تھی لیکن سے یہ برداشت نہ ہوگا کہ کوئی مرد عورت کے بارے میں ایسے خیالات رکھے۔''۲۸

دراصل ناول کے تمام مرد کردار عورت کے بارے میں اسی قسم کے خیالات اور جذبات رکھتے ہیں۔ ان کی نظر میں عورت بھروسے کے قابل نہیں۔ عورت کے اندر بے وفائی اور دغابازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ عورت چاہے کوئی بھی ہو وہ محبت اور ہمدردی کے قابل نہیں ہو سکتی۔

لیکن جب سیٹھ بنارسی داس ایک خوبصورت لڑکی چندرانی کو عارضی ملازم رکھتے ہیں۔ یہ لڑکی اسی دفتر میں بھیج دی جاتی ہے جہاں پر بنواری لال اور ان کے دوسرے ساتھی کام کرتے ہیں۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ بنواری لال اور ان کے ساتھی چندرانی کو کافی پسند کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی خواہش یہی ہے کہ چندرانی ان کی محبت قبول کرے۔ لیکن چندرانی ان سے کہتی ہے کہ وہ ان سب لوگوں سے یکساں پیار کرتی ہے۔ وہ کسی کا بھی دل نہیں دکھانا چاہتی۔ اسی دوران سیٹھ کی بیوی کا

انتقال ہوجاتا ہے۔ چندرانی کام پر آنا چھوڑ دیتی ہے۔ جب بنواری لال اوران کے ساتھی اس کو تلاش کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے چندرانی نے سیٹھ سے شادی کر لی ہے۔ یہاں پر بنواری لال اوران کے ساتھیوں کی دلوں میں عورت کے تئیں نفرت میں اضافہ ہوتا ہے۔لیکن ناول کے آخر میں یہ راز کھل جاتا ہے کہ چندرانی نے سیٹھ سے صرف اس لیے شادی کی تاکہ بنواری لال، دھرم چند، پریتم سنگھ، ساگر چند، دیال صاحب کی نوکریاں پکی ہوسکیں اوران کی تنخواہ میں بھی اضافہ ہوجائے۔ان کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے ناول نگار لکھتے ہیں:

''دیال صاحب نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔
''چندرانی نے سیٹھ جی سے شادی کرلی''
ساگراور پریتم سرتھام کرفرش پر ہی بیٹھ گئے۔ان کی آنکھوں میں بھی آنسوآ گئے تھے۔قدرے توقف کے بعدآنسو پونچھ ڈالے۔
''میں نے اپنی آنکھوں سے اسے دلہن کے لباس میں دیکھا۔اس نے مجھ سے خود کہا کہ آج سے تم سب کی پچاس روپے ترقی اورکل سے تم بڑے دفتر میں مستقل ملازموں کی طرح کام کروگے۔''
بنواری لال کا سر چکرا گیا۔عورت کے ایثار کی انتہا تھی۔اسے چندرانی کی باتیں یادآئیں۔جھوٹ سی لگتی تھی لیکن کتنی سچ تھیں۔اس نے واقعی سب کواپنا لیا تھا۔ سب کواپنی روح کا لمس بخش دیا تھا۔ بنواری لال کے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی۔۔۔ یہ کیسا عشق ہے۔ جواپنوں کوزندہ رکھنے کے لیے،اپنوں کا گھر آباد دیکھنے کے لیے اپنی محبت کا اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ کر غیر سے شادی کر لے۔'' ۲۹؎

ناول کی کہانی کافی دلچسپ ہے۔ناول نگار نے ہماری زندگی کے ایک اہم موضوع کواپنا کر ناول کے قالب میں ڈھالا ہے۔ناول کا پلاٹ اوسط درجے کا ہے۔کہانی شروع سے آخر تک فطری

بہاؤ میں چلتی ہے۔مختلف واقعات کوفطری انداز میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

ناول کے مرد کرار ایک جیسے خیالات رکھتے ہیں۔سب ہی عورت ذات کو قابلِ نفرت سمجھتے ہیں۔ناول کا سب سے اہم اور کامیاب کردار چندرانی ہے۔وہ بنواری لال اوران کے ساتھیوں کے خیالات کو غلط ثابت کرتی ہے۔اس کردار کو پیش کرنے میں ناول نگار نے تصنع سے کام لیا ہے۔ کیوں کہ ایک عورت آفس کے چار یا پانچ ملازموں سے کیسے محبت کرسکتی ہے۔وہ ان میں ایک سے محبت کا اظہار کرسکتی تھی اور باقی لوگوں سے وہ ہمدردی اور دوستی رکھ سکتی تھی۔لیکن ناول نگار نے اس کردار کوایسے انداز میں پیش کیا ہے کہ جیسے وہ کوئی انسان نہیں بلکہ محبت کی دیوی ہو۔وہ سب سے یکساں محبت اور پیار کرتی ہے۔کچھ خامیوں کوچھوڑ کر ناول کا یہ کردار اپنے اندر ایک کشش اور جاذبیت رکھتا ہے۔ناول کے دوسرے کردار بھی اپنی اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔زبان و بیان اور مناظر کی پیش کشی میں بھی ناول نگار کو کمال حاصل ہے۔غرض یہ ناول اپنی فنی خصوصیات کی بدولت ایک اچھا ناول محسوس ہوتا ہے۔

’چاندنی کے سائے‘ ٹھاکر پونچھی کا چوتھا ناول ہے۔یہ ناول تقریباً نایاب ہے۔راقم کو اس ناول کی ایک کاپی بڑی مشکل سے پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری سے دستیاب ہوئی۔اس ناول کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ ٹھاکر پونچھی کا ناول ہے۔ناول پر سنِ تصنیف درج نہیں ہے۔یہ ناول رسالہ بیسویں صدی دہلی سے شائع ہوا۔ناول کا انتساب ناول نگار نے اپنے دوست شمبو ناتھ بٹ حلیم کاشمیری کے نام لکھا ہے۔ناول کی ابتدا ٹی۔ایس۔ایلیٹ کی ایک نظم سے ہوتی ہے۔

ناول ’’چاندنی کے سائے‘‘ میں ٹھاکر پونچھی نے بعض اہم سماجی اور جاگیردارنہ نظام کے مسائل

کوموضوع بنایا ہے۔اس کے علاوہ اس ناول میں طبقاتی کشمکش اور سماج کے قائم کردہ فرسودہ روایات کو بھی نشانہ بنایا گیا ہے۔امیر وغریب کی تفریق کو بھی ناول نگار نے پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

ناول کی ابتدا ہی سے اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ ناول نگار کے سامنے سماجی تفریق کے مسائل سامنے ہیں۔ناول نگار نے کئی ایسے کردار تراشے ہیں جوان سماجی مسائل سے جوجتے دکھائی دیتے ہیں۔

راج ناتھ اس کہانی کا مرکزی کردار ہے اور اسی کے گرد ساری کہانی گھومتی ہے۔وہ ناول میں رونما ہونے والے ہر چھوٹے بڑے واقعے پر دکھائی دیتا ہے۔راج ناتھ خود بے سہارا ہے، لاوارث ہے لیکن وہ ہر کسی کا سہارا اور وارث بن جاتا ہے۔وہ ایک طرف زمانے کے ہاتھوں مجبور ہے اور دوسری طرف محبت میں بھی کئی بار ناکام ہو چکا ہے۔وہ پہلے بیلا کی محبت میں گرفتار ہوکر ہار جاتا ہے اور پھر نلنی کی محبت میں بھی اسے ناکامی ہاتھ آتی ہے۔جوانی میں وہ فلورنس کی محبت میں گرفتار ہوجاتا ہے لیکن یہاں پر بھی ناکامی اس کے ہاتھ آتی ہے۔چنانچہ وہ اپنی ناکامی کا اظہار کرتے ہوئے ایک موقع پر کہتا ہے:

> ''۔۔۔اب کی بار بھی ناکام ہی رہا اور اپنی ناکامیوں پر قہقے لگانے والا آج
> پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے۔کیونکہ تم نہیں فلورنس۔دوبارہ بیلا مرگئی۔دوبارہ
> میری نلنی روٹھ گئی۔تم نہیں جانتی ہو۔تم نے مجھے بھی کب جانا۔'' ۳۰؎

راج ناتھ کو اس زندگی سے نفرت ہے، اس ماحول سے نفرت ہے جہاں کوئی رشتہ نہیں، کوئی محبت نہیں، کوئی جذبہ نہیں۔صرف سونے چاندی کی بھوک ہے۔وہی زندگی ہے۔حسن ہے، وہی

رومان ہے عشق ہے اور وہی ازدواجی رشتے اچھے تصور کیے جاتے ہیں جن میں روپئے پیسے کی ریل پیل ہو۔ایسے ماحول میں اسے گھٹن ہوتی ہے جہاں انسانی جذبات اور احساسات کی کوئی قدر نہیں۔

وہ ایک معمولی کسان کا بیٹا تھا۔اس کی پہلی محبت بیلا ایک بہت بڑے زمیندار کی بیٹی۔زمیندارو ں کی بیٹیاں جاگیرداروں کے گھر جاتی ہیں۔جیسے جاگیرداروں کی لڑکیاں راجے مہاراجوں کے محلات کی زینت بنتی ہیں۔وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ بیلا ایک بڑے زمیندار کی بیٹی ہے۔اس کی صورت بھی چاند جیسی ہے۔بڑے بڑے اونچے محلات کی روشنیاں بھی اس کی منتظر ہوتی ہیں۔سماج کی دیواریں بھی اتنی اونچی اٹھ جاتی ہیں کہ انہیں پھاندنے کی ہر ایک کی جسارت ناکام رہ جاتی ہے۔ایسے میں راج ناتھ کو اپنی پہلی محبت میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس کے بعد راج ناتھ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے شہر کا رخ کرتا ہے۔وہ اپنے ذاتی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے کئی چھوٹے موٹے کام بھی کرتا رہتا ہے۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ذہنی مریض بن جاتا ہے کیونکہ اسے کوئی بھی انسان نوکری دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ایسے میں وہ در بدر کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا رہتا ہے۔

یہ ناول دراصل راج ناتھ کی ہی کہانی ہے۔راج ناتھ کافی حساس اور ذہین ہے۔سماج اور زمانے کے آہنی ہاتھ جس کا سب کچھ چھین لیتے ہیں۔وہ جس قدر عزت کا مستحق ہوتا ہے وہ اسے نہیں ملتی۔نوکری کی تلاش میں کافی تگ ودو کے بعد صرف ناکامی ہی اس کے ہاتھ آتی ہے۔وہ شرافت کا لبادہ پھینک دیتا ہے اور ایک جواری بن جاتا ہے۔جواری ہو کر بھی اس کے اندر کا حساس انسان اس سے اچھے کام ہی کرواتا ہے۔اس موقع پر اس کے خیالات کی اچھی ترجمانی کی گئی ہے۔ناول سے ایک اقتباس:

''ایک خوبصورت انسان مر گیا۔
ایک مقدس جذبہ فنا ہو گیا۔
نیکی کے راستے مسدود تھے۔ لیکن بدی کی راہیں دور تک صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے ڈھیرو استاد کو اپنا لیا۔ بدی کی راہوں کو اپنا لیا۔ اب اس کے ساتھی تھے۔ تاش کے چکنے ملائم پتے اور محبوب تھے شراب کے دور۔ زندگی اس کی نگاہوں میں حسین ہو گئی تھی۔ فلورنس سے بھی زیادہ حسین۔ بیلا سے بھی زیادہ معصوم اور نلنی سے بھی زیادہ چنچل۔'' [۳۱]

راج ناتھ کی زندگی میں اس وقت ٹھہراؤ کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں جب وہ پہلے کارگی اور پھر کلپنا کے ساتھ اپنی زندگی گذارنے کا خواہاں ہے۔ لیکن یہاں پر بھی وہ اپنی خوشیوں کو دوسروں کے لیے قربان کر دیتا ہے۔ وہ کلپنا کو ایشور داس کے ساتھ منسوب کر دیتا ہے اور خود غم زدہ ہی رہتا ہے۔ راج ناتھ کلپنا کو ہمیشہ کے لیے اپنانا چاہتا تھا۔ اسے اپنا جیون ساتھ بنانا چاہتا تھا۔ کلپنا نہیں جانتی تھی۔ وہ اسے کم ہی ملتا تھا۔ لیکن آگے چل کر وہ یہ زہر کا گھونٹ صرف اس لیے پی لیتا ہے تا کہ ایشور داس کی زندگی میں خوشیاں آئیں۔

ناول میں منظر نگاری کے عمدہ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ منظر نگاری کے فن میں ٹھاکر پونچھی کو واقعی مہارت حاصل ہے۔ وہ ہر ایک منظر اور اس منظر کی جزئیات کو بڑی باریک بینی سے پیش کرتے ہیں۔ ناول میں منظر نگاری کی کئی عمدہ مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ایک منظر ملاحظہ کیجیے جہاں راج ناتھ کے جذبات کی ترجمانی کے لیے قدرتی ماحول سے تشبیہات کے ذریعے عکاسی کی گئی ہے۔ مثال دیکھئے:

''راج ناتھ اس کی بھوری بھوری ڈوبی ڈوبی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانکتا رہا۔
شام ڈوب رہی تھی اور بڑھتے پھیلتے سائے پہاڑوں کی اوٹ میں دم روکے

کھڑے تھے۔آبشاروں کا سنگیت مدھم پڑ گیا تھا اور جھرنوں کی روانی جیسے تھم سی
گئی تھی۔ یہ دن اور رات، روشنی اور اندھیرے کے بیچ کا وہی مختصر سا لمحہ تھا جب
آسمان کی بلندیاں جھک جاتی ہیں اور زمین کی پستیاں ابھر کر ان بلندیوں کو اپنے
مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے چوم لیتی ہیں۔ یہ ملن کا وہی زندگی بخش لمحہ تھا۔اسی
لیے کائنات کی ہر ایک چیز حرکت کرتے کرتے رک گئی تھی۔'' ۳۲

ناول نگار نے ناول کو تین حصوں جیسے بچپن، لڑکپن اور جوانی میں تقسیم کیا ہے۔راج ناتھ جب اپنے بچپن کے بارے میں بات کرتا ہے تو ناول میں شعور کی روتکنیک کافی خوبصورت انداز میں نمایاں ہوتی ہے۔ناول نگار نے ماضی کی یادوں کو کافی مہارت کے ساتھ شعور کی روتکنیک میں پیش کرنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں:

''بچپن اور لڑکپن کے بیچ کے دور کی بہت ہی پیاری بہت ہی خوبصورت باتیں
راج ناتھ نے پڑھیں۔ان کی گونج اپنی دھڑکنوں میں سنی۔ان میں بوڑھے ماں
باپ کا پیار بھی تھا اور غربت کا دور بھی، جو وقت کے ساتھ ساتھ شدت اختیار کرتا
جارہا تھا۔ماں باپ اپنی تمام پونجی صرف کر کے ایک ابدی سرمائے کو بچائے رکھنا
چاہتے تھے۔یہی خواہش تھی کہ سب کچھ بک جائے۔لیکن اکلوتے بیٹے کی زندگی
سنور جائے۔خود بھوکے رہیں لیکن بیٹا زندگی کی ان بلندیوں کو چھولے۔ جہاں
تک ان کا جانا پہچانا دوسرا ابھی تک کوئی نہیں پہنچا۔'' ۳۳

ان کے یہاں منظر کشی کی بھی بڑی عمدہ تصویریں ملتی ہیں۔منظر نگاری کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے:

''زندگی کا ایک پر بہار لمحہ سرسراتا ہوا ابھرا اور راج ناتھ کی آنکھوں کے سامنے جگنو
کی طرح ٹمٹماتے ہوا تھر کنے لگا۔گھپ اندھیری رات تھی۔دو دریاؤں کی ساں
ساں کی مسلسل لے اپنے سنگم کو ڈھونڈ رہی تھی۔فلک بوس پہاڑوں کی برفانی
چوٹیاں ڈوبتی ابھرتی ایک دوسرے کا تعاقب کرتی نہ جانے کن بلندیوں، کن

پستیوں کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔'' ۳۴؎

ناول میں راج ناتھ کے ساتھ کئی اور کردار کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ان کرداروں میں ڈھیرو استاد، ایشور داس، کارگی اور کلپنا وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تمام کردار سماج کی ٹوٹتی بکھرتی قدروں کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ ڈھیرو استاد تمام جواریوں کا استاد ہے۔ وہ زندگی میں ناکام ہونے والے انسانوں کو جوے کے اسرار و رموز سکھاتا ہے۔ وہ راج ناتھ کا بھی استاد ہے۔ راج ناتھ جب زندگی میں ناکام ہوجاتا ہے تو ڈھیرو اس کی مدد کرتا ہے اور راج ناتھ کو اس بات کے لیے تیار کرتا ہے کہ انسان کی قدر پیسے سے کی جاتی ہے۔ پیسے کمانے کے لیے سب سے بہترین اور موزوں کام جوا ہے۔ اسی طرح ڈھیرو اور بھی کئی ناکام لوگوں کا استاد ہوتا ہے۔

ایشور داس ایک اخبار نویس کا بیٹا ہے۔ وہ زمانے کے ہاتھوں اور سماج کے قائم کردہ فرسودہ نظام کا شکار ہے۔ وہ ایک کہانی کار تھا۔لیکن اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کوئی نہیں کرتا ہے۔ وہ اندر سے ایک خوبصورت انسان ہے۔لیکن اس کا گذارہ لکھنے پر نہ ہوتا تھا اس لیے بھوکے پیٹ دن رات کہانیوں میں سرگرداں رہتا تھا۔

کردار نگاری اور منظر نگاری کے لحاظ سے یہ ناول کامیاب نظر آتا ہے۔لیکن کہانی میں کوئی ایسی جاذبیت اور دلچسپی نہیں جس سے اس کا شمار ریاست جموں و کشمیر کے عمدہ ناولوں میں ہو سکے۔ ٹھاکر پونچھی کی ناولوں کی خاص بات یہ ہے کہ وہ سماجی مسائل کو بے باک انداز میں بیان کرتے ہیں۔ یہی چیز ہمیں اس ناول میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ سماجی نابرابری اور سماجی استحصال اس ناول میں اہم موضوع ہے۔

حامدی کاشمیری

پروفیسر حامدی کاشمیری کا پوا نام حبیب اللہ حامدی کاشمیری ہے۔حبیب اللہ ان کا اصل نام ہے۔حامدی تخلص ہے۔ان کی پیدائش کاغذی ریکارڈ کے مطابق ۲۹ رجنوری ۱۹۳۲ء کو سرینگر کے علاقے بہوری کدل کے ایک خوشحال گھرانے میں ہوئی۔ان کے والد کا نام خواجہ محمد صدیق اور ماں کا نام خورشید بیگم تھا۔حامدی کی تعلیم دستور زمانہ کے مطابق قرآنی تعلیم سے شروع ہوئی تھی۔اس کے ایک سال بعد یعنی ۱۹۳۸ء میں انہیں بہوری کدل کے پرائمری اسکول میں داخل کرایا گیا۔اس طرح سے ان کی دینی اور دنیاوی تعلیم کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوگیا۔انہوں نے ۱۹۴۵ء میں مڈل امتحان پاس کیا۔۱۹۴۷ء کے حالات پیدا شدہ حالات اور کشمیر کے الحاق کے تنازعہ نے ہندو پاک جنگ کی صورت اختیار کرلی جس کے بعد ۱۹۴۸ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔اسی سال ایس۔پی۔کالج میں داخلہ لے لیا۔۱۹۵۴ء میں کشمیر یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام ایس۔پی کالج سری نگر سے ایم۔اے۔(انگریزی) کی ڈگری حاصل کی۔اس کے بعد انہوں نے ۱۹۵۸ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے(اردو) کی ڈگری حاصل کی۔۱۹۶۶ء میں کشمیر یونیورسٹی سے ''جدید اردو نظم پر یورپی اثرات'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔اس کے بعد ایس۔پی۔کالج میں انگریزی مضمون پڑھانے کے لئے بحیثیت لیکچرر ان کا تقرر ہوا۔۱۹۶۰ء میں ریاستی کلچرل اکادمی میں اسٹنٹ سکریٹری کے عہدے پر وہ فائز ہوئے۔۱۹۶۱ء میں حامدی کاشمیری کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈیر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یہاں وہ ۱۹۷۷ء میں پروفیسر بن گئے۔۱۹۹۰ء میں وہ کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے پر فائز ہوئے۔

پروفیسر حامدی کاشمیری تقریباً گذشتہ 65 برسوں سے اردو شعر و ادب کی خدمت میں مصروف

ہیں۔حامدی کاشمیری ہمہ جہت ادبی شخصیت کے مالک ہیں۔وہ بیک وقت شاعر،افسانہ نگار، ناول نگار،سفرنامہ نویس،سوانح نگاراور ایک نقاد کی حیثیت سے مشہور ومعروف ہیں۔ادبی زندگی کا آغاز انھوں نے شاعری اورافسانہ نگاری سے کیالیکن ان کی شہرت کا اصل سبب ان کی تنقید نگاری ہے۔ان کا شمار جدید دور کے چند بڑے نقادوں میں ہوتا ہے۔بحیثیت نقاد ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مروجہ تنقیدات میں ایک نئے تجزیاتی نظریہ تنقید کو متعارف کیا۔انہوں نے اس ضمن میں اکتشافی تنقید کی بنیاد ڈالی اور مروجہ تنقیدی نظریات کی عدم معنویت کو اجاگر کرتے ہوئے شعری متن کو توجہ کا مرکز بنایا۔ حامدی کاشمیری کی تصانیف میں چار افسانوی مجموعے، چار ناول، چھ شعری مجموعے،ایک سفرنامہ اور ایک خودنوشت سوانح کے علاوہ چوبیس تنقیدی تصانیف شائع ہوچکی ہیں۔

ان کا پہلا ناول۱۹۵۲ء میں منظر عام پر آیااور آخری۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔یعنی حامدی کاشمیری کی ناول نگاری کا دور۱۹۵۶ء سے شروع ہوکر۱۹۶۱ء پر ختم ہوجاتا ہےاس مختصر سی مدت میں 'بہاروں میں شعلے'، 'پگھلتے خواب'، 'اجنبی راستے' اور 'بلندیوں کے خواب' کے نام سے ان کے چار ناول منظر عام پرآئے۔

''بہاروں میں شعلے'' حامدی کاشمیری کا پہلا ناول ہے۔یہ ناول۱۹۵۷ء میں شاہین بک اسٹال سرینگر کشمیر سے منظر عام پرآیا۔۴۸۰صفحات پر مشتمل اس ناول کی خوبی یہ ہے کہ حامدی کاشمیری نے اس کو چھوٹے چھوٹے عنوانات کے تحت پیش کیا ہے ۔ ہرعنوان ناول کے باب کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔

یہ ایک سماجی ناول ہے۔اس میں کشمیری عوام کی زندگی کے مختلف پہلوؤں ک موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول کشمیری زندگی پر لکھا جانے والا وہ ناول ہے جس میں حقیقی زندگی کے مسائل کو

پیش کیا گیا ہے۔ ناول نگار نے یہاں کی سماجی و معاشرتی زندگی کے مسائل کے ساتھ ساتھ سیاسی صورت حال اور ڈوگرہ تانا شاہی کے خلاف تحریک کو بھی اس ناول میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ حامدی کاشمیری ناول کے آغاز میں 'حرفِ اول' کے ذریعے اسی بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس ناول میں آپ اہلِ کشمیر کی سماجی، مذہبی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کو بہت قریب سے دیکھیں گے۔ آج تک اردو میں کشمیری زندگی پر جو کچھ لکھا گیا وہ باہر کے ادیبوں کی کاوشِ فکر کا نتیجہ تھا۔ جس میں حقیقت نگاری کم اور تخیل آرائی زیادہ تھی۔ یہ ناول کشمیریوں کی سماجی زندگی کے ماضی اور حال دونوں کی تصویر کشی کرنے کے ساتھ ساتھ ایک خاص تاریخی دور کی دھڑکنوں کو سموئے ہوئے ہے۔ یہ وہ دور ہے جب یہاں کے عوام غلامی اور افلاس کے اندھیروں سے بیزار ہو کر پہلے پہلے آزادی اور مسرت کی روشنی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اور وہ اپنی جدوجہد کی بدولت منزل آزادی کے قریب آجاتے ہیں۔'' ۳۵

اس ناول میں کشمیری عوام کے مسائل اور کشمیری سماج میں پائی جانے والی برائیوں کو اجاگر کر کے ان کی اصلاح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری بھی اس ناول کو ایک سماجی ناول قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان کا ماننا ہے کہ اس ناول میں جو مسائل ملتے ہیں وہ صرف کشمیر تک محدود نہیں بلکہ ایسے مسائل تمام مشرقی ممالک میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

'''بہاروں میں شعلے' بنیادی طور پر ایک سماجی ناول ہے اور جو سماجی زندگی اور سماجی مسئلہ وہ پیش کرتا ہے وہ کشمیری مسئلہ نہیں بلکہ سارے ہندوستان و پاکستان، بلکہ اکثر مشرقی اقوام کے سماج کا مسئلہ ہے۔ جو کشمیر کے افراد کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ اس سماجی نقشے میں طبقاتی تفاوت اور کشمکش کا رنگ ابھرتا ہے۔'' ۳۶

اس ناول کو حامدی نے عشقیہ داستان کے طور پر پیش کیا ہے۔ ناول جاوید اور محبوبہ کی محبت کی کہانی پر مبنی ہے۔ جاوید ایک پڑھا لکھا، سمجھدار اور شریف لڑکا ہے لیکن وہ ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ جاوید کے والدین اس کو بہت پیار کرتے ہیں اور مالی مشکلات کے باوجود وہ اسے اعلیٰ تعلیم دلواتے ہیں۔ جاوید محبوبہ کو پرائیوٹ طور پر پڑھانے کے لیے اس کے گھر جاتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر کچھ دنوں کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے جاوید علی گڑھ چلا جاتا ہے۔ وہاں سے محبوبہ کو شادی کے لیے خط لکھتا ہے۔ جب اس بات کا پتہ محبوبہ کے والد جلال الدین کو چلتا ہے تو وہ جاوید کے گھر جا کر جاوید کے والد قادر بٹ کو بے عزت کرتا ہے اور قادر بٹ کے بیٹے کے ساتھ اپنی بیٹی کو منسوب کرنا اپنی آن بان اور شان کے خلاف سمجھتا ہے۔ وہ محبوبہ کا رشتہ حشمت اللہ کے بیٹے سے طے کر دیتا ہے۔ حشمت اللہ ایک مالدار اور امیر آدمی ہے جس نے ناجائز طریقے سے اپنے اکلوتے بیٹے سلیم کے لیے لاکھوں کی جائیداد جمع کر رکھی تھی۔ اس کا بیٹا آوارہ اور بدچلن ہے۔ مگر محبوبہ اس کے لیے رضامند نہیں ہوتی جس کی وجہ سے کئی بار باپ بیٹی میں تکرار بھی ہو جاتی ہے۔

جاوید کی والدہ جاوید کا رشتہ اپنے بھائی کی بیٹی سے کر دیتی ہے جس کے بارے میں جاوید کو کوئی خبر نہیں ہوتی۔ جب اس کا پتہ محبوبہ کو چلتا ہے کہ جاوید کا رشتہ ہو گیا ہے وہ ٹوٹ جاتی ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کی مرضی پر شادی کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ ادھر جاوید بھی تعلیم حاصل کر کے واپس آ جاتا ہے جو ان واقعات سے بے خبر تھا۔ جب اس کو حقیقت کا پتہ چلتا ہے تو وہ خط کے ذریعے اپنے رشتے سے متعلق اپنی لاعلمی کی وضاحت کرتا ہے لیکن تب تک بہت دیر ہو جاتی ہے۔

حامدی کاشمیری نے جب یہ ناول لکھا تو اس وقت ترقی پسند تحریک اپنے آخری مراحل میں تھی۔

لیکن اس کا اثر باقی تھا۔اگر چہ حامدی نے اپنی مخصوص افتادطبع کی وجہ سے اس تحریک سے وابستہ نہیں تھے مگر اس تحریک سے متاثر ضرور تھے۔کیونکہ ان کا مقصد بھی وہی تھا جو اس تحریک کا نصب العین تھا۔یعنی سماجی مسائل کی مصوری کر کے سماج کی اصلاح کرنا تھا۔جس کا اثر اس ناول میں صاف طور پر نظر آتا ہے۔ناول کے مرکزی کردار جاوید کی اس بات سے حامدی کاشمیری کے نظریئے کی وضاحت اچھی طرح ہو جاتی ہے:

> ''یہ نظم صرف میرے دل کی آواز نہیں۔لاکھوں مظلوم انسانوں کے دل کی آواز ہے۔جاوید اپنے دل نشین انداز میں کہہ رہا تھا۔ظلم، مفلسی، جہالت اور فاقہ کشی کے مارے ہوئے یہ انسان۔واقعی ان کی حالت خون کے آنسو رلاتی ہے۔'' ۳۷

حامدی کے اس پہلے ناول میں کشمیر کے اس دور کے سماجی حالات کے ساتھ ساتھ سیاسی حالات کا بھی علم ہوتا ہے۔ناول نگار نے جاوید اور محبوبہ کی عشقیہ کہانی کے ساتھ اس دور کے حالات کو محمودہ، حسین، اکرام، قادر بٹ وغیرہ کے ذریعہ پیش کیا ہے۔جب کشمیری عوام صدیوں کے خواب غفلت سے بیدار ہو کر اس وقت کے ظالم جاگیرداروں، سیٹھوں اور حکمرانوں کے خلاف آواز بلند کر رہے تھے۔اپنے حقوق کی مانگ کر رہے تھے۔مطلق العنان ڈوگرہ شاہی کے خلاف اور غلامی سے نجات پانے کے لیے کوشاں تھے۔ناول کے پس منظر میں ڈوگرہ شاہی کے خلاف کشمیر کے عوام کی جدوجہد کو موضوع بنایا گیا ہے۔ناول سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''جنت میں رہ کر بھی ہم جنت سے بیگانے ہیں۔کتنا ظلم ہے۔کتنا اندھیرا۔جاوید کے لہجے میں تلخی پیدا ہوگئی اور تھوڑی دیر کے لیے اس کے چہرے کی بشاشت ڈوب گئی۔میں یہ کہتا ہوں کیا یہ ظلم ہم پر ہمیشہ ہوتا رہے گا۔کیا ہم اسی طرح سڑتے رہیں گے۔کیا ہم کبھی اپنی تقدیر نہیں بدل سکتے؟ اس کی آواز میں

جذبات کے خلوص سے تھرتھری آ گئی۔ ہم ضرور اپنی تقدیر بدل سکتے ہیں۔ ہمیں اپنی تقدیر آپ بدلنا ہوگی۔ ہمیں غلامی اور جہالت کی زنجیروں کو توڑنا ہوگا۔ جاوید کے لہجے میں پھر مسرت چھا گئی۔ حسین کے چہرے پر بھی جذبات کا اتار چڑھاؤ نمایاں تھا۔'' ۳۸

'بہاروں میں شعلے' کا سب سے اہم عنصر حسن وعشق ہے۔ اس میں کشمیری تہذیب، فطرت اور معاشرے کے پس منظر میں عشق کی بے تابی، گہرائی، بے قراری اور حسن کی سادگی و دل آویزی کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس بات کا احساس ناول کے شروع سے آخر تک ہوتا ہے۔ یہ حسن وعشق کی بے تابی اور بے قراری سماجی اونچ نیچ کی زد میں آجاتی ہے۔ ناول نگاری کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے محبوبہ اور جاوید کی مدد سے اس دور کی سماجی زندگی کا بھرپور نقشہ پیش کیا ہے۔ جان محمد آزاد اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس ناول کی زبان شاعرانہ ہے۔ اس میں آپ نے گردوپیش کی سچی زندگی کو سادہ اور موثر طریقے میں پیش کیا ہے۔ یہاں آپ کے فن میں کوئی پیچیدگی نظر نہیں آتی بلکہ آپ نہایت معصومیت سے سرمایہ پرستی اور معاشرتی بھید بھاؤ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ آپ اہل کشمیر کی زندگی کے عکاس بن کر اس ضخیم ناول میں مصوری کی نیرنگیوں سے بھی قاری کو محظوظ کرتے ہیں۔'' ۳۹

اس کے علاوہ ناول میں مرد اساس معاشرے کو بھی طنز کا موضوع بنایا گیا ہے۔ ایسے معاشرے میں عورت کو بچے جننے اور ان کی پرورش کے علاوہ اور کسی کام کے لائق نہیں سمجھا جاتا۔ یہ صورت حال کشمیر میں آج بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ ناول نگار نے ایسے مردوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جو عورت کو بچے جننے اور پرورش کرنے تک محدود رکھتے ہیں۔ ناول کا ایک کردار شاہد شادی کے بعد بھی آوارہ گردی کرتا ہے۔ وہ کنوارے دوستوں کے ساتھ رہ کر یہ بھول جاتا ہے کہ اس کے دو بچے ہیں۔ وہ اپنی بیوی پر بچے

پالنے کی ذمہ داری ڈال دیتا ہے اور خود آوارگی زندگی بسر کرتا ہے۔

ناول ''بہاروں میں شعلے'' کردار نگاری کے اعتبار سے بھی ریاست جموں و کشمیر میں لکھے جانے والے ناولوں میں کامیاب نظر آتا ہے۔ ناول میں کئی اہم اور غیر اہم کردار ہیں جو اپنی انفرادیت اور خصوصیت لئے ہوئے ہیں۔ ناول کے مرد کرداروں میں جاوید، حسین، اکرام قادر بٹ، حشمت اللہ، سلیم اور نسوانی کرداروں میں زینب، ، محبوبہ، محمودہ، ہاجرہ کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ ناول کے مرکزی کردار جاوید کو تراشنے میں ناول نگار نے کافی محنت سے کام لیا ہے۔ اس کردار میں وہ تمام صفات ہیں جو ایک ہیرو میں ضرری خیال کی جاتی ہے۔ وہ ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا ہے لیکن وہ دل و دماغ سے کافی امیر ہے۔ وہ ڈوگرہ حکومت کے ظلم و جبر کے خلاف نظمیں لکھتا ہے۔ وہ آزادی اور انقلاب کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا تا ہے۔ وہ ایک امیر خاندان کی لڑکی محبوبہ سے محبت بھی کرتا ہے لیکن ملک کی آزادی کی خاطر محبت کو بھی قربان کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ حکمت اور دانشمندی سے کام لیتا ہے۔ ناول کے باغی کرداروں میں حسین بھی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ بھی کشمیری عوام کے اندر آزادی اور انقلاب کا جوش پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

نسوانی کرداروں میں محبوبہ ناول کا جاندار کردار ہے۔ وہ جاوید سے محبت کرتی ہے اور اس کا انتظار بھی کرتی ہے۔ وہ اپنے باپ کے سامنے آزادی اور انقلاب کی باتیں بھی کرتی ہے۔ وہ ڈوگرہ حکومت کے خلاف آواز اٹھنے والی تحریک کا خیر مقدم کرتی ہے۔ وہ سرمایہ دار خاندان سے تعلق رکھتے ہوئے بھی غریب عوام کا ساتھ دیتی ہے۔ اس طرح ناول کے باقی کردار بھی اپنی انفرادیت لیے ہوئے ہیں۔

اس ناول کی اہمیت اور انفرادیت اس لیے بھی کشمیر کے لکھے جانے والوں ناولوں میں زیادہ ہے

کہ اس میں منظر نگاری کے عمدہ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ منظر نگاری کو پیش کرنے میں حامدی کاشمیری کامیاب نظر آتے ہیں۔ وہ جس منظر کو الفاظ کے ذریعے پیش کرتے ہیں اس کی ہو بہو تصویر سامنے آجاتی ہے۔ مثال کے طور پر منظر نگاری کا ایک نمونہ دیکھئے:

> ''صبح ہو چکی تھی۔ آفتاب پوری آب و تاب کے ساتھ پہاڑ کی بلند ترین چوٹی سے سر نکال کر جھیل کی حسین آغوش میں چمک رہا تھا۔ وہ تینوں صبح کا ناشتہ کر کے جھیل کی سیر کو روانہ ہوئے۔ درختوں کی گھنی اور خشک چھاؤں میں دائیں جانب جھیل سر سبز پہاڑیوں کی آغوش میں مسکرا رہی تھی۔ سورج کی پہلی کرنیں فضا کو نورانی دھند سے رقص کر رہی تھیں۔ دور کناروں پر شاداب پتوں سے لدے ہوئے درخت انگڑائیاں لے کر نیند سے بیدار ہو رہے تھے۔ دور دور کسان کھیتوں میں کام کرنے کے لیے تیزی سے قدم اٹھا رہے تھے۔'' ۴۰

نہ صرف قدرتی مناظر کو پیش کرنے میں ناول نگار کو دسترس حاصل ہے بلکہ مکانوں اور عمارتوں کی بھی بڑی خوبی سے تصویر کشی کی ہے۔ اکرام کو جب پولیس جیل میں بند کر دیتی ہے تو جیل کا نقشہ ناول نگار نے کس خوبی سے کھینچا ہے:

> ''جیل کی بلند قامت دیواروں کے سائے آہستہ آہستہ بارکوں کو اپنی آغوش میں چھپا رہے تھے۔ کہیں کہیں کسی بارک کی چھت پر سورج کی الوداعی شعاعیں اندھیروں کا بڑھتا ہوا ریلا دیکھ کر خوف سے لرز رہی تھیں۔ سب قیدی اپنی اپنی بارکوں میں داخل ہو چکے تھے اور بارکوں سے دائیں بائیں وسیع احاطوں میں ویرانی، اداسی، خاموشی اور وحشت اکھٹے مل کر اپنے ڈیرے جما رہی تھیں۔ جیل کے اس پار لنگر میں قیدیوں کے لیے کھانا پک رہا تھا اور دھویں کے مرغولے فضا میں اٹھ کر ارد گرد چکر لگاتے ہوئے سرگیں فضاؤں میں تحلیل ہو رہے تھے۔ شام کی گمبھیر خاموشی میں جیل کے گیٹ پر پہرہ دینے والے ملٹری والوں کی صدائیں

رک رک کر بلند ہو جاتیں۔ خاموشیاں تھوڑی دیر کے لیے تھرتھرا کر رہ جاتیں اور
خوف اور دہشت کے بھوت دور تک رقص میں آجاتے۔'' ۴۱

کشمیر جس کی خوبصورتی دنیا بھر میں مشہور ہے۔ جہاں ہر کوئی زندگی میں ایک بار آنا چاہتا ہے۔ شاعروں اور ادیبوں نے کشمیر کی تعریف میں زمین و آسماں تک کو ایک کر دیا ہے۔ سردی کے موسم میں ہونے والی برف باری کا ذکر خصوصیت سے کیا جاتا ہے۔ برف کو کشمیر کے لیے کسی معجزہ سے کم خیال نہیں کیا جاتا۔ لیکن برف باری کی وجہ سے غریب اور مفلس عوام کی حالت کیا ہوتی ہے اس کی طرف کوئی نہیں دیکھتا۔ برف باری غریب اور مفلس عوام کے لیے مصیبت کا نام ہے۔ اسی حقیقت کا اظہار ناول نگار نے اس ناول میں جگہ جگہ کیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''برف باری کا پہلا دن سبوں کے لیے خاص کر بچوں کے لیے کتنی مسرت اور استعجاب لاتا ہے۔ لوگ اس دن عموماً ڈھل جھیل کی مچھلیاں خریدتے ہیں۔ غریب لوگ بھی حسب المقدور اس موقع پر خوشیاں مناتے ہیں۔ حالانکہ مفلسوں کے لیے برف باری کا یہ دن نئی نئی مصیبتوں اور مشکلوں کا سبب بن جاتا ہے۔ ان کی جھونپڑیاں کبھی کبھی برف کے بوجھ تلے دب جاتی ہیں۔ ان کے نہتے اور ننگے معصوم بچے سردیوں کی ٹھٹھری ہوئی راتوں میں یخ بستہ ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک ٹوٹی پھوٹی کانگڑی کے لیے ترستے ہیں۔ تن ڈھانپنے کے لیے ان کے پاس گرم کپڑے نہیں ہوتے۔ برف پر ننگے پاؤں چل کر ان کے پاؤں سردی سے پھول جاتے ہیں۔ ان میں زخم ہو جاتے ہیں۔ اور ان زخموں سے پیپ بہتی رہتی ہے۔'' ۴۲

مکالمہ نگاری میں بھی ناول نگار نے کافی مہارت سے کام لیا ہے۔ مکالمے مختصر، سادہ، سلیس، برجستہ اور برمحل استعمال ہوئے ہیں۔ زبان و بیان کی چاشنی و اسلوب کی سادگی کی بدولت ہم کہہ سکتے

ہیں کہ حامدی کاشمیری کا یہ ناول فنی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔

''اجنبی راستے'' حامدی کاشمیری کا دوسرا ناول ہے۔ یہ ناول ۱۹۶۳ء میں شاہین بک اسٹال سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ یہ ایک ہلکا پھلکا ناول ہے۔ ایک عام سی کہانی کو ناول نگار نے ناول کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور اس میں کسی حد تک وہ کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ اس ناول میں حامدی نے کشمیری عوام کی زندگی کے ایک اہم سماجی مسئلے بچپن کی شادی کو موضوع بنایا ہے۔ لیکن اس سماجی مسئلے کو پیش کرتے ہوئے کئی اور مسائل کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ اس ناول کے بارے میں پروفیسر شکیل الرحمان لکھتے ہیں:

> ''یہ حقیقت ہے کہ حامدی کاشمیری کے ناولوں میں فلسفہ سے زیادہ فن اور فن کی باریکیوں سے دلچسپی ہے۔ اس ناول میں غم کے نغموں سے وہ جتنے متاثر ہیں شاید اس سے پہلے اتنے متاثر نہ تھے۔ حقیقت کے تاریک پہلو پر ان کی نظر گہری ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ امید کی شعاعیں ڈالتے جاتے ہیں۔ ان کی طبیعت حساس ہے۔ آدمی کو شکست کھاتے اور مختلف قوتوں سے ٹکراتے دیکھ کر وہ تلملا جاتے ہیں۔ یہ ناول دراصل ایک آئینہ ہے جس میں مختلف پرچھائیوں کا عکس ہے۔ اس آئینے کے سامنے سے کچھ ایسے کردار گزرتے ہیں جنھیں ہم پہچانتے ہیں۔'' ۴۳؎

''اجنبی راستے'' میں کشمیر کے ایک متوسط طبقے کے ایک مسلم گھرانے کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس طبقے میں محبت کی جو قدر و قیمت ہے، خودداری کا جو عنصر ہے، تضاد کی جو صورت ہے اور توہمات کے جو بت ہیں وہ صاف طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ متوسط طبقے کی گھریلو زندگی کے بے تکلف ماحول کو اس ناول میں ہم بہت قریب سے دیکھ سکتے ہیں۔ یہ ناول نگار کا کمال ہے کہ وہ

اپنے کرداروں کو عام زندگی اور عام ماحول کا نمائندہ بناتے ہیں۔ان کے کردار متوسط طبقے کے مرد و زن ہیں جن سے ہم اچھی طرح آگاہ ہے۔ یہاں پر جو مسائل ملتے ہیں وہ کشمیر کے متوسط طبقے کے مسائل ہیں۔

اس ناول میں ناول نگار نے ایک ایسی سماجی برائی یعنی بچپن کی شادی کو موضوع بنایا ہے۔رحمٰن اورساجی دو کردار ہیں جن کی شادی کمسنی میں کروادی جاتی ہے لیکن یہ شادی کامیاب ثابت نہیں ہوتی بلکہ دوانسانوں کی زندگی کو جہنم بنادیتی ہے۔اور ساتھ ہی ساتھ اس شادی نے دو گھروں کی خوشیاں بھی چھین لی حالانکہ اس کی اجازت نہ تو مذہب دیتا ہے اور نہ ہی قانون۔

اس ناول میں حامدی نے بدلتے ہوئے زمانے سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ جہاں لڑکیاں کالج میں تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے۔شادی بیاہ میں وہ کسی قسم کی زور زبردستی کو نہیں مانتی۔ ساتھ ہی لڑکے اور لڑکی کا ایک دوسرے کو پسند کرنے اور پیار و محبت کرنے کے معاملے کو بھی اس ناول میں پیش کیا گیا ہے۔اس بارے میں ناول سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو جہاں قادر خاں رفیقہ کی رحمٰن کو پسند کرنے کے معاملے پر حیرت کرتا ہے:

> ''قادر خان کئی دنوں کے بعد شاہ پور واپس آیا۔اور ہفتہ بھر سلطان خان کی بات پہ سوچتا رہا۔اسی بات نے اسے چکرا دیا تھا۔اس کے خیالات کو ایک زبردست ٹھوکر لگ چکی تھی۔اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سوتے میں کسی نے اس کے سر پر ایک بڑا پتھر دے مارا ہو۔وہ ہڑبڑا کر چونک اٹھا تھا۔کیا رفیقہ کی بھی یہ خواہش ہے کہ وہ رحمٰن سے شادی کرے؟ عجیب بات ہے۔زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔ پہلے تو لڑکے یا لڑکی کو شادی کے دن تک یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ شادی ہو رہی ہے۔سب کچھ ماں باپ اور گھر کے دوسرے بزرگ کرتے تھے۔لیکن سلطان

خان نے سچ کہہ دیا کہ اب وہ بات نہیں رہی۔'' [۴۴]

ناول کا پلاٹ سیدھا سادہ اور عام فہم ہے۔ کہانی بیانیہ اور واحد متکلم والی تکنیک میں بیان کی گئی ہے۔ کہانی میں کوئی خاص کشش نہیں لیکن موضوع کے اعتبار سے یہ ناول کافی اہم ہے۔ ناول میں کئی اہم اور غیر اہم کردار ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار رحمان ہے۔ وہ پڑھا لکھا نوجوان ہے، امیر خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ اپنے باپ عزیز میر کا کاروبار سنبھالتا ہے۔ لیکن اس کی شادی بچپن ہی میں ساجی کے ساتھ کر دی گئی تھی۔ شادی کے ایک ہفتہ کے اندر ہی وہ اپنی بیوی سے بیزار ہو جاتا ہے۔ اس کی بیوی کافی تیز مزاج عورت ہے۔ اس کردار کے ذریعے ناول نگار نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ایک پڑھا لکھا انسان بھی بچپن کی شادی سے تباہ و برباد ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ناول میں رفیقہ کا کردار بھی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ گاؤں کی لڑکی ہے لیکن وہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے شہر جاتی ہے۔ تعلیم کا شوق اسے گاؤں سے شہر پہنچا دیتا ہے۔ وہ رحمان سے پیار بھی کرتی ہے۔ لیکن جب اسے اس بات کا پتہ چل جاتا ہے کہ رحمان پہلے ہی سے شادی شدہ ہے تو وہ ٹوٹ جاتی ہے لیکن وہ آنکھیں بند کر کے باتوں کو تسلیم نہیں کرتی بلکہ حقیقت جاننے کو کوشش کرتی ہے۔

ناول میں غلام علی کا کردار بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ شہر میں رہتا ہے اور رفیقہ کا رشتہ دار ہے لیکن وہ رفیقہ کو اپنی بیٹی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ نئے زمانے کا انسان ہے۔ وہ عقلمند اور ذی فہم ہے۔ وہ رفیقہ کی تعلیم جاری رکھنے کی وکالت کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ رحمان اور رفیقہ کے درمیان پنپنے والے پیار سے بھی بیزار نہیں ہے۔ وہ ان دونوں کی شادی کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ شادی سے لڑکے اور لڑکی کی پسند و ناپسند کو ضروری سمجھتا ہے۔ وہ اپنے بھائی کو، جو رفیقہ کی شادی کے

خلاف ہے، سمجھاتے ہوئے کہتا ہے:

> ''دیکھئے، مذہب میں بھی یہ بات جائز نہیں۔قرآن شریف میں آیا ہے کہ لڑکی اورلڑکے کی باہمی رضامندی کے بعد ہی شادی ہوسکتی ہے۔آنحضرتؐ کی مثال سامنے ہے۔انھوں نے خدیجہ الکبریٰ کو دیکھ کران سے نکاح کیا تھا۔ بہر حال میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ رحمان اور رفیقہ دونوں ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہوں تو آپ کا کیا رویہ رہے گا۔'' ؂۴۵

لیکن آگے چل کر اس کے رویئے میں غیر معمولی تبدیلی آتی ہے۔وہ رحمان سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ اپنے بھائی قادرخان کو اس شادی کے لیے منالے۔لیکن جب اس کا اپنا بیٹا علی گڑھ سے پڑھائی مکمل کر کے واپس آجاتا ہے تو وہ رفیقہ کو اپنے بیٹے غلام حسین کی بیوی اور اپنی بہو کے روپ میں دیکھتا ہے۔

ناول میں ریاست جموں وکشمیر کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بھی پیش کیا گیا۔ کشمیر میں کافی ہاؤس کافی اہمیت کا حامل ہے۔ چونکہ یہاں کے لوگ چائے کے کافی شوقین ہے۔ چائے کے ساتھ سیاسی معاملات سے متعلق کافی بحثیں ہوتی ہیں۔اس طرف ناول میں کچھ یوں اشارہ اس کیا گیا ہے:

> ''ہوٹل میں کافی رونق اور گہما گہمی تھی۔ٹیبلوں پر کالجوں کے پروفیسر، ریڈیو آرٹسٹ، اخبارنویس اور حاکم لوگ چائے پیتے پیتے باتیں بھی کررہے تھے۔کچھ لوگ اخباروں کا مطالعہ کر رہے تھے۔کچھ لوگ بہت انہاک اور گرم جوشی سے عالمی سیاسیات پر تبادلہ خیالات کررہے تھے۔'' ؂۴۶

پلاٹ، کردارنگاری اور مکالمہ نگاری کے علاوہ منظرنگاری کے لحاظ سے بھی یہ ناول کامیاب نظر آتا ہے۔ناول نگار نے مناظر کو پیش کرنے میں مہارت کا ثبوت دیا ہے۔منظرکشی اتنی حقیقی و دلکش ہوتی

ہے کہ پورا ماحول آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور قاری خود کو اس منظر میں محسوس کرتا ہے۔اس کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے:

''خزاں کے آخری دن تھے۔درختوں کی ننگی شاخیں دن بھر یخ بستہ دھند سے ہم آغوش رہتیں۔میدانوں، باغوں، کھیتوں اور پگ ڈنڈیوں پر درختوں کے گرے ہوئے پتے انبار در انبار جمع ہو چکے تھے۔ہواؤں کے جھونکے لٹی ہوئی بہاروں کا ماتم کر رہے تھے۔گاؤں کے کتے دن بھر اونگتے رہتے اور کبھی بڑ بڑا کر بھونکنے لگتے۔جیسے وہ کسی بھوت کا منحوس سایہ دیکھ لیتے۔کسان دن بھر اپنی تاریک جھونپڑیوں میں بیٹھے حقہ گڑگڑاتے رہتے۔اس سال کی فصل کی خرابیوں کا ذکر کرتے یا آنے والے جاڑے اور برف کے طویل موسم کی دقتوں کا شمار کرتے۔آسمان ہیبت ناک نظر آرہا تھا۔سورج سیاہ بادلوں میں غائب ہو چکا تھا۔ ہر طرف پراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔'' ۴۷

مجموعی اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس ناول کی کہانی عام سی کہانی ہے لیکن مناظر کی دلکشی، زبان و بیاں کی چاشنی اور مکالموں کی پیش کشی میں ناول نگار نے کمال دکھایا ہے۔غرض حامدی کاشمیری نے اس ناول میں فنی باریکیوں کا خاص خیال رکھا ہے۔

''بلندیوں کے خواب'' حامدی کاشمیری کا آخری ناول ہے۔یہ ناول ۱۹۶۰ء میں منظر عام پر آیا۔دوسوستر صفحات پر مشتمل اس ناول کو اٹھائیس حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ناول کا آغاز ایک نظم سے ہوتا ہے۔اس ناول کو بھی حامدی کاشمیری نے عشقیہ داستان کے طور پر پیش کیا ہے۔

اس ناول میں پہاڑوں، بادلوں اور ہواؤں کے طوفانی پہلو کو پیش کیا گیا اور دکھایا گیا ہے کہ انسان فطرت کے قہر وغضب کا کس طرح شکار ہو جاتا ہے۔اس میں انسان کو قدرت کے آگے بے بس اور مجبور دکھایا گیا۔ساتھ ہی اس میں انسان کی ہمت و کاوش کے ذریعے فطرت کے طوفانی پہلو سے

نبرآزمانے ہونے کے مناظر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ وہ پہاڑوں کو عبور کرتا اور برفیلی آندھیوں سے اپنا راستہ نکالتا ہے لیکن انسانی سماج میں جو خرابیاں ہیں جو اونچ نیچ ہے جو استحصال ہے وہ اس کے خوابوں اور ارادوں کو پامال کر دیتا ہے۔ انسان فطرت پر تو قابو پالیتا ہے مگر وہ سماجی برائیوں کو رفع نہیں کر سکتا اور غم والم کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہی ناول کا موضوع ہے۔

ناول کی کہانی کچھ اس طرح ہے کہ رفیق جو اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ رشیدہ نامی لڑکی سے والہانہ محبت کرتا ہے۔ ایک دن رشیدہ اپنے محبوب سے کہتی ہے میرے گھر والے ہماری شادی کے لیے رضامند نہیں ہوں گے۔ کیوں کہ اس کے گھر والے اس کے رشتے کے لیے ایک ایسا لڑکا چاہتے ہیں جو زیادہ پڑھا لکھا ہو۔ یہ سن کے رفیق رشیدہ کو پانے کے لیے مزید تعلیم حاصل کرنے لکھنؤ چلا جاتا ہے۔

رفیق لکھنؤ سے ایم۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد سری نگر کے لیے روانہ ہوتا ہے۔ جموں پہنچتے ہی وہ سری نگر کے لیے گاڑی کا ٹکٹ خرید لیتا ہے۔ صبح سویرے گاڑی پر سوار ہو جاتا ہے اور گاڑی سرینگر کی طرف چل پڑتی ہے۔ وہ بٹوت پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں گاڑیاں رکی ہوتی ہیں۔ رفیق اور اس کے دیگر ساتھیوں کی بس بھی وہاں رک جاتی ہے کیوں کہ انھیں پتہ چلتا ہے کہ راستہ خراب ہے۔ برف باری زوروں سے ہو رہی ہے۔ آگے جانے کا کوئی امکان نہیں رہتا۔ اس لیے سبھی مسافر اپنے بستر اور باقی سامان کو لے کر ہوٹلوں اور ڈاک بنگلوں کی طرف چلے جاتے ہیں۔ رفیق کو رہائش کے لیے جگہ نہ ملنے پر وہ سردار لڑکوں کے ساتھ اپنا بستر لے کر گردوارے میں چلا جاتا ہے۔ ایک رات وہاں گزارنے کے بعد وہ اور اس کے ساتھی باقی دن ڈاک بنگلہ کے ہال میں گزارتے ہیں۔ رفیق کے ہمسفر پرویز ایڈیٹر، انور صاحب، سمار چند، مدراس سے آئی ہوئی ایکٹرس، غلام محمد اور اس کی بیوی اور انجنیئر اختر

وغیرہ کے ساتھ اور بھی کئی مسافر تھے مگر ان میں سے انجنیئر اختر بس میں نہیں بلکہ اپنی جیپ میں آتا تھا۔راستہ بند ہونے کی وجہ سے اُسے بھی ڈاک بنگلہ میں رکنا پڑا اور یہاں رفیق کی اس کے ساتھ ملاقات ہوتی ہے۔ یہاں ان کو کچھ دن اکھٹے گزارنے کا موقع ملتا ہے۔

رفیق کی جیب خالی ہو جاتی ہے اور وہ اپنی گھڑی فروخت کر کے اپنے گزارے کے لیے کچھ روپیے وصول کرتا ہے۔مگر اُسے ان حالات میں بھی رشیدہ کی یاد ستاتی ہے اور وہ سوچتا ہے کہ اگر میں پرندہ ہوتا تو اڑ کر ان پہاڑوں سے ہوتا ہوا سرینگر پہنچ جاتا اور رشیدہ سے ملاقات کرتا لیکن خرچے کی پریشانی اور محبوبہ کی جدائی کو برداشت کرتے ہوئے بھی وہ دوسروں کی مدد کرتا ہے۔غلام محمد اور اس کی بیوی کا خرچہ اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔

اسی طرح ایک دن رفیق ڈاک بنگلہ سے نکل کر کھانا لینے کے لیے دین محمد کے ہوٹل پر جاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ دین محمد کا نوکر خلیل بے سود پڑا تھا وہ بیمار تھا کوئی بھی اس کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا ۔رفیق نے جب اس کی یہ حالت دیکھی تو اسے رحم آتا ہے اور وہ دین محمد کو ڈاکٹر لانے کو کہتا ہے لیکن وہ رضا مند نہیں ہوتا تو رفیق خود ہی برف کے سینے کو چیرتے ہوئے ڈاکٹر کے پاس پہنچتا ہے اور پورا حال سناتا ہے۔مگر ڈاکٹر اسے مشورہ دیتا ہے کہ اُسے یہیں لے آؤ۔رفیق کی جدوجہد کے بعد ڈاکٹر تیار ہو جاتا ہے اور رفیق اس کا سامان اٹھا کر آگے چل پڑتا ہے اور جلدی جلدی ہوٹل پہنچ کر لوگوں کو راستہ چھوڑنے کے لیے کہتا ہے۔جب رفیق اور ڈاکٹر خلیل کے پاس آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ اس دنیا کو خیر آباد کہہ چکا ہے۔

حامدی کاشمیری کے ناولوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حامدی ناولوں کے ذریعہ کشمیری سماج اور معاشرے میں پائی جانے والی برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا عزم رکھتے

ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں سماج اور معاشرے کا اٹوٹ حصہ بن گئے ہیں۔حامدی نے حیات انسانی کے اوجھل اور ظاہری گوشوں پر جس طرح قلم اٹھایا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔انھیں اگر کسی مسئلے کو عوام سے متعارف کرانا مقصود ہوتا ہے تو اس مسئلہ کی داخلی صورت کی اتھاہ گہرائیوں میں جھانک کر دیکھتے ہیں۔ان کے ناول کشمیر کی مذہبی اور تہذیبی زندگی کے مرقع پیش کرتے ہیں۔حامدی کاشمیری کے نزدیک ملک وقوم سے بڑھ کر انسانیت کا جذبہ ہے۔ان کے خیال میں انسانیت ہی ایک ایسی شئے ہے جسے بڑائی کا شرف حاصل ہے۔ان کے ناولوں میں عصری سماج اور اس کے سلگتے ہوئے مسائل بیک وقت یکجا ہو گئے ہیں۔

غرض کے ناولوں میں ہمیں انسانی زندگی کا عکس صاف نظر آتا ہے۔انھوں نے اپنے ناولوں میں صرف تخیلی دنیا کو نہیں سجایا بلکہ تخیل اور حقیقت دونوں سے کام لیتے ہوئے ایسا فنکارانہ انداز اختیار کیا ہے جس سے حقیقی زندگی کی تصویریں نظر آتی ہیں۔

پلاٹ کے اعتبار سے ان کے ناول 'پگھلتے خواب' 'اجنبی راستے' اور 'بلندیوں کے خواب' منظّم اور مربوط ہیں جب کہ 'بہاروں میں شعلے' کا پلاٹ مرکب ہے۔ان کے ناولوں کی پلاٹ نگاری میں جغرافیائی حقیقت اور مقامی رنگ کی عکاسی ملتی ہے۔انھوں نے داستان اور رومانی ناول کی طرح مقامات کے بیان میں دماغی اختراع سے کام نہیں لیا ہے۔انھوں نے جموں وکشمیر کے خوبصورت مقامات، جھیلوں، پہاڑوں، باغوں اور دریاوں وغیرہ کے صحیح نام اور سچی تصویریں پیش کی ہیں، جو قاری کے مزاج کی ہم آہنگی میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ہر فنکار پلاٹ کی تعمیر میں اپنے گرد و پیش سے مواد فراہم کرتا ہے۔حامدی نے بھی اپنے ناولوں کے پلاٹ کی تعمیر میں وادی کشمیر کا سہارا لیا ہے۔

حامدی کاشمیری کے ناولوں میں کردار نگاری کا تعلق ہے تو انھوں نے اپنے ناولوں میں جو کردار

پیش کئے ہیں وہ اسی معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔جس میں وہ خود رہتے ہیں۔یہی سبب ہے کہ ان کے ناولوں کے کردار حقیقی زندگی سے قریب معلوم ہوتے ہیں۔ان کے تخلیق کردہ کرداروں میں جاوید،محبوبہ، رشیدہ، رفیقہ، رفیق، جلال الدین، رحمان، قادر بٹ وغیرہ اہم ہیں۔مصنف نے ان کرداروں میں جذبات،احساسات اور نفسیات غرض ہر پہلو کو سامنے لایا ہے۔حامدی نے اپنے تخلیق کردہ کرداروں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔اس لیے ان کے عیوب اور محاسن کو اجاگر کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتے۔حامدی کے ناولوں میں کردار نگاری کو موثر بنانے کی شعوری کوشش نظر آتی ہے اور جس میں انھیں کامیابی بھی ہوئی ہے۔مگر وہ ایسا زندہ وجاوید کردار تخلیق نہیں کر سکے جس کو زیادہ دنوں تک قارئین اپنے ذہنوں میں محفوظ رکھ سکیں۔

مکالمہ نگاری کا جائزہ لیا جائے تو یہاں پر بھی حامدی کاشمیری کامیاب نظر آتے ہیں۔ان کے ناولوں کے مکالمے موزوں،الفاظ مناسب اور فقرے ڈرامائی عناصر سے مزین ہیں۔ان کے مکالمے دلچسپ اور کرداروں کے حسب حال ہیں۔انھوں نے نہ صرف دیہاتی وشہری، پڑھے لکھے اور ان پڑھ کے مکالموں میں احتیاط برتا ہے بلکہ مذہب اور سوسائٹی کو بھی مدنظر رکھا ہے۔ان کے مکالموں سے کردار کے خیالات، طبقے اور معیار زندگی کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔مثلاً ’’ ‘‘ سے ایک مکالمہ جس میں سلطان رحمان کی شرافت پر شک کرتا ہے اور ایک باپ کی حیثیت سے اپنی بیٹی کے لیے اچھے لڑکے کا انتخاب کرنا چاہتا ہے جس کی وجہ سے سلطان اور رفیقہ کے والد کے درمیان گفتگو ملاحظہ کیجیے جس سے والد کی نفسیاتی کیفیات کا بخوبی علم ہوتا ہے:

’’یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن۔۔۔لیکن‘‘

’’آپ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ معاملہ کیا ہے؟‘‘

''سلطان! بات یہ ہے کہ وہ مجھے شریف لڑکا نہیں معلوم ہوتا!''

''کیا کہہ رہے ہیں، شریف ہونے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟''

''یہی۔ یہی کہ اس میں شرم وحیا نہیں۔ مولوی صاحب کہتے ہیں کہ جس آدمی میں

حیا نہیں، اس کے پاس ایمان نہیں!''

''یہ درست ہے لیکن۔۔۔''

''بات یہ ہے کہ تاجی نے کہا ہے کہ _____ کہ وہ_____ وہی رحمان بیٹی

رفیقہ سے اکیلے میں ملتا

ہے۔ تم ہی بتاؤ یہ کس مذہب میں جائز ہے؟''

''اوہو، تو اتنی سی بات ہے! سلطان خان مسکرایا۔ اُس کے مصنوعی دانت نمودار

ہوئے''

''تو کیا یہ معمولی بات ہے عجب_____''

دیکھئے بھائی صاحب! رحمان کی طرف سے آپ خواہ مخواہ بدظن ہوئے

ہیں!'' ۴۸؎

ماحول کی عکاسی کی بنیاد پر اگر ہم حامدی کے ناولوں کا جائزہ لیں تو اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ انھوں نے ماحول کی عکاسی میں بڑی ہنرمندی اور چابکدستی سے کام لیا ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں اسی ماحول کا احاطہ کیا ہے جس سے ان کی وابستگی ہے یا جس سے ان کا گہرا مشاہدہ رہا ہے۔ اس لیے انھوں نے جس ماحول کی تصویر کشی کی ہے اس میں فطری پن پایا جاتا ہے۔ ان کے ناولوں کا پس منظر کشمیر ہے۔ اس لیے ان کے ناولوں میں کشمیر کے ماحول کی ہوبہو عکاسی ملتی ہے۔

یہاں کی تہذیب، یہاں کا سماج اور یہاں کے کلچر کے ساتھ ساتھ وادی کشمیر کے خوبصورت اور دلکش مناظر فطرت یہاں کی جھیلوں، برفیلے پہاڑوں، کھلتے پھولوں، ندیوں، جھرنوں، سرسبز میدانوں اور خوبصورت جنگلوں کی تصویر کشی میں مہارت کا ثبوت دیا ہے۔کشمیر کے شالیمار باغ کی خوبصورتی کو بیان کرتے ہوئے لکھتے وہ اس کی یوں منظر کشی کرتے ہیں:

''کار شالیمار کے گیٹ کے سامنے رکی اور وہ دونوں کار سے اتر کر شالیمار کے اندر چلے گئے۔دائیں بائیں متنوع رنگوں کے مہکتے ہوئے پھولوں کے قافلے قطاروں میں مسکرارہے تھے اور خوش لحن پرندوں کے چہچہے موسیقی کی لہریں بکھیر رہے تھے۔دائیں سمت ہرے بھرے گھانس کے کنارے میوہ دار درخت شگوفوں سے لدے ہوئے تھے اور ہوا میں نکہت ورنگ تحلیل ہورہا تھا۔چاروں طرف چھائی ہوئی خواب اور خاموشی میں فواروں کا سنگیت ماحول کی سرشاری میں اضافہ کررہا تھا اور کسی فوارے سے کھیلتے ہوئے کسی حسین اور شوخ وشنگ دوشیزہ کا نقرئی قہقہہ خاموش فضا میں نغمے بکھیر دیتا۔'' ۴۹؎

حامدی ایک جہاندیدہ اور ماہر نفسیات فنکار ہیں۔ان کے ناولوں میں نفسیاتی تجزیوں کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ان کی تیز نگاہیں سماج کے ہر طبقے، ہر فرد، مرد عورت، بوڑھے بچے، جوان غریب، امیر کے تحت الشعور تک جاتی ہیں۔انھوں نے جنسی نفسیات کے گرہوں کو بھی کھولا ہے مگر ان میں عریانی اور ابتذال نہیں ہے وہ جب کسی کردار کی نفسیات کا تجزیہ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کردار کی نبض پر ہاتھ رکھے ہوئے ہیں اور اس کے دل کی دھڑکنوں کو سن رہے ہیں۔مثلاً رفیقہ کے والد کے گذر جانے پر اس کی حالت اور اس کی نفسیاتی کیفیت کی بہترین عکاسی کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''باپ کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد رفیقہ کی زندگی بے حد تلخ ہوگئی

تھی۔اُسے ایسا معلوم ہورہا تھا جسے وہ اپنا ہمدرد کہہ سکے۔چاچا اُن کے گھر نہ آتے تھے۔وہ اپنے آپ کو اکیلی محسوس کرتی۔اُس کا کوئی بھی تو نہ تھا۔اس خیال سے اس کی روح تڑپ اٹھتی اور سوچتے سوچتے وہ پریشان ہوجاتی۔وہ اپنی زندگی کا طویل تنہا سفر کیوں کر طئے کرسکتی ہے؟اُس کی زندگی کا بھیانک خلاء کیسے پورا ہو؟اور پھر وہ مایوسی کے اندھیروں میں ڈوب جاتی۔'' ۵۰؎

زبان و بیان کے معاملے میں بھی حامدی کاشمیری نے بڑی مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ان کے ناولوں میں زبان کی سلاست اور قناعت پائی جاتی ہے۔انھوں نے ناولوں کے کرداروں کی مناسبت سے زبان کا استعمال کیا ہے جس ناول میں حقیقت نگاری فضا پر قائم ہوجاتی ہے۔انھوں نے ناول میں فارسی اور عربی کے مبہم اور ثقیل الفاظ سے مبراء ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جب قاری ان کے ناولوں کا مطالعہ کرتا ہے تو زبان و بیان کی چاشنی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔انھوں نے موقع ومحل کے لحاظ سے محاروں اور ضرب الامثال کے علاوہ خوبصورت تشبیہات واستعارات کا بھی استعمال کیا ہے جس سے ان کی تہہ داری اور دلکشی کا بھی پتہ چلتا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے کہیں کہیں زبان کے شاعرانہ استعمال کے ساتھ انگریزی الفاظ کا بھی استعمال کرکے اپنی تحریر میں شگفتگی اور جاذبیت پیدا کی ہے۔

حامدی اگرچہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں تھے لیکن وہ ایک ایسے ادیب ہیں جو سماج میں اصلاح اور بہبود کے خواں تھے۔اس لیے ان کے ناول سماجی ومعاشی مساوات اور اشتراکی مقاصد کے تحت لکھے گئے ہیں۔سماجی و معاشی مسائل کے علاوہ پلاٹ کی سادگی، کرداروں کی پیش کشی، مکالموں کی برجستگی اور چستی کے علاوہ کرداروں کی نفسیاتی کیفیات کی عکاسی اور زبان و بیان کی سادگی وسلاست اور دلکشی کی بدولت ان کے ناول کشمیر کے کامیاب ناولوں میں شمار ہونے کے مستحق ہیں۔

غرض اس عہد میں جو ناول لکھے گئے ہیں ان میں زیادہ تر ناول بظاہر عشقیہ موضوعات کے تحت لکھے گئے ہیں لیکن باوجود اس کے ان میں بعض سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی مسائل کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔ اس عہد کے ناول کردار نگاری کے اعتبار سے بھی اہم ہیں کیوں کہ اس عہد میں لکھے جانے والے ناولوں کے کردار جیتے جاگتے اور حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں زندگی کی حرارت موجود ہے۔ وہ ہمارے سماج کے فرد محسوس ہوتے ہیں۔ مکالمہ نگاری ہو یا کرداروں کے جذبات واحساسات اور ان کی نفسیاتی کیفیات کی عکاسی میں بھی اس عہد کے ناولوں میں بہترین مثالیں ملتی ہیں جو کرداروں کی شخصیت اور ان کے ماحول سے مطابقت رکھتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اس طرح اس عہد میں لکھے گئے ناول کسی خاص سیاسی مقصد کے تحت نہیں لکھے گئے لیکن اپنے عہد کے تہذیبی، سماجی ومعاشی مسائل کو ضرور پیش کرتے ہیں۔ اس عہد میں لکھے گئے ناولوں میں تکنیک کے تجربے بھی نظر آتے ہیں۔ غرض اس عہد میں جو ناول لکھے گئے ہیں وہ اپنے عہد کے مسائل کی پیش کشی میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

حوالے:

۱: Frontline. March 9th 2012
۲: انتساب، اورانسان مرگیا، رامانند ساگر
۳: دیباچہ از خواجہ احمد عباس، اورانسان مرگیا، رامانند ساگر، ص۱۳۔۱۴
۴ : ایضاً، ص۲۶
۵: اردوناول آزادی کے بعد، اسلم آزاد، ص۱۵۴
۶: اورانسان مرگیا، رامانند ساگر، ص۱۲۵
۷: ایضاً، ص۱۳۷
۸: ایضاً، ص۷۰
۹: تذکرہ معاصرین (جلد۳)، مالک رام، ص۱۴۱
۱۰: ریاست جموں وکشمیر کے اردو مصنفین، جان محمد آزاد، ص۴۴۱
۱۱: ایضاً،ص۴۴۰
۱۲: رات کے گھونگھٹ، ٹھاکر پونچھی، ص۱۲
۱۳: ایضاً، ص۱۲
۱۴: ایضاً، ص۲۰
۱۵: ایضاً، ص۴۳
۱۶: ایضا، ص۳۷
۱۷: ریاست جموں وکشمیر کے اردو مصنفین، جان محمد آزاد، ص۴۴۰
۱۸: شمع ہر رنگ میں جلتی ہے، ٹھاکر پونچھی، ص۲۶
۱۹: ایضاً،ص۴۰
۲۰: ایضاً،ص۸۹
۲۱: ایضا،ص۹۰
۲۲: ایضاً،ص۱۰۲
۲۳: قفس اداس ہے، ٹھاکر پونچھی، ص۸
۲۴: ایضاً، ص۳۶
۲۵: ایضاً، ص۵۳

۲۶: ایضاً، ص ۲۰۸
۲۷: ایضاً، ص ۳۷
۲۸: خزاں کی خوشبو، ٹھاکر پونچھی، ص ۴۲
۲۹: ایضاً، ص ۱۱۷
۳۰: ایضاً، ص ۹
۳۱: ایضاً، ص ۴۵
۳۲: ایضاً، ص ۲۰
۳۳: ایضاً، ص ۱۸
۳۴: ایضاً، ص ۲۳
۳۵: دیباچہ از پروفیسر عبدالقادر سروری، بہاروں میں شعلے، حامدی کاشمیری، ص ۵
۳۶: بہاروں میں شعلے ،حامدی کاشمیری،
۳۷: بہاروں میں شعلے، حامدی کاشمیری، ص ۲۴
۳۸: بہاروں میں شعلے، حامدی کاشمیری، ص ۲۸
۳۹: ریاست جموں و کشمیر کے اردو مصنفین، جان محمد آزاد، ص ۴۶
۴۰: بہاروں میں شعلے، حامدی کاشمیری، ص ۲۷
۴۱: بہاروں میں شعلے، حامدی کاشمیری، ص ۳۷۱
۴۲: بہاروں میں شعلے، حامدی کاشمیری، ص ۳۸
۴۳: پیش لفظ از شکیل الرحمان، اجنبی راستے، حامدی کاشمیری، ص ۸
۴۴: اجنبی راستے، حامدی کاشمیری، ص ۵۷
۴۵: اجنبی راستے، حامدی کاشمیری، ص ۵۶
۴۶: اجنبی راستے، حامدی کاشمیری، ص ۹۰
۴۷: اجنبی راستے، حامدی کاشمیری، ص ۲۴۱
۴۹: بہاروں میں شعلے، حامدی کاشمیری، ص ۹۶
۵۰: اجنبی راستے، حامدی کاشمیری، ص ۱۹۲

باب چہارم:

ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول:
۱۹۶۰ء تا۱۹۸۰ء

جیسا کہ پچھلے باب میں ذکر آ چکا ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول کی باضابطہ ابتدا ۱۹۴۷ء کے بعد ہوتی ہے۔۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۰ء تک نہ صرف یہاں بلکہ پورے ہندوستان و پاکستان کے فنکار اس سانحے سے متاثر ہوکر لکھتے رہے۔ریاست جموں وکشمیر کے فنکار وادیب بھی ۴۷ء کے سانحے سے متاثر ہوکر تقسیم کے واقعات کو اپنے ناولوں کا موضوع بنانے کوشش کی۔

۱۹۶۰ء تک آتے آتے ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ ساتھ ریاست جموں وکشمیر کے حالات میں کچھ بہتری آئی تھی۔اگرچہ کشمیر پر ہندوستان اور پاکستان دونوں مما لک نے اسے دو حصوں میں تقسیم کر کے اپنی حکومت قائم کی تھی لیکن یہاں کے حالات میں کسی حد تک ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ لوگ کئی سوسالوں کی غلامی اور محکومی کے بعد امن اور ترقی کی راہ پر گامزن تھے۔لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی اپنی جگہ کافی اہمیت کی حامل ہے کہ مسئلہ کشمیر اپنی جگہ پر موجود تھا۔

دوسری طرف دیکھا جائے تو اس دور میں ترقی پسند تحریک اپنے آخری مراحل میں تھی۔لیکن ریاست جموں وکشمیر میں اس تحریک کے اثرات ۱۹۶۰ء کے بعد بھی نظر آتے ہیں۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے فنکاروں کے سامنے ابھی بھی وہ مسائل موجود تھے جو ترقی پسند تحریک کے دور میں تھے۔ یہاں کے سیاسی حالات میں اگرچہ کسی حد تک تبدیلی آئی تھی لیکن یہاں کے سماجی،

معاشی ومعاشرتی اور مذہبی مسائل ابھی بھی موجود تھے۔ایسی صورت حال میں ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء تک لکھے جانے والے ناولوں میں یہی مسائل نظر آتے ہیں۔

اس دور میں لکھے جانے والے ناولوں کی ایک اور اہم خصوصیت تکنیک میں نئے نئے تجربے ہیں۔اس دور کے کئی ناولوں میں شعور کی رو کے علاوہ ڈائری اور خطوط کی تکنیک میں کئی ناول لکھے گئے ہیں۔یہاں مختلف ناول نگاروں کے حوالے سے اس دور کے اہم ناولوں کا تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

علی محمد لون

علی محمد لون کی پیدائش ۲۷ر ستمبر ۱۹۲۶ء کو سری نگر کے درگجن علاقے میں ہوئی۔ان کے والد کا نام عبدالرحمان تھا۔سری نگر اور گردوپیش کی خوبصورتی نے ان کی ذہنی نشوونما میں اہم رول ادا کیا۔بچپن سے لکھنے پڑھنے کی طرف ان کا گہرا لگاؤ تھا۔اس بارے میں وہ خود کہتے ہیں:

> ''آٹھویں جماعت تک آتے آتے میں نے طلسم ہوش ربا کا بیشتر حصہ، ڈپٹی نذیر احمد اور شرر کے ناول، پریم چند اور سدرشن کی کہانیاں سبھی کچھ پڑھ لیا تھا۔کالج میں آنے سے پہلے میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک سے متعارف ہو چکا تھا۔'' ۱

علی محمد لون نے پرآشوب دور دیکھا۔انہوں نے ان حالات کا گہرا اثر قبول کیا۔انہوں نہ صرف ہندوستان بلکہ عالمی شہرت یافتہ ادیبوں کا مطالعہ کیا جس کی وجہ سے وہ ادب کے اسرار ورموز سے واقف ہوئے۔آگے چل کر اس مطالعے نے ان کی ادبی تحریروں کو جلا بخشی۔

علی محمد لون ریاست جموں وکشمیر میں ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔انہوں نے عالمی سطح کے ادیبوں کا مطالعہ کیا تھا۔دوسری طرف وہ سماج کو بدلنا چاہتے تھے۔ان کے افسانوں

اور ڈراموں میں یہی جذبہ کارفرما دکھائی دیتا ہے۔

علی محمد لون نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانے سے کیا۔ان کا پہلا افسانہ 'بچے' ماہنامہ آج کل، دہلی میں شائع ہوا۔آگے چل کر وہ ریڈیو کشمیر سے وابستہ ہو گئے۔ریڈیو کے ساتھ وابستہ ہونے کے بعد وہ ڈرامے لکھنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے کئی بہترین ڈرامے تحریر کئے۔ ان کا پہلا ڈراما 'گھروندے' کافی مقبول ہوا۔اس کی اصل وجہ سچے واقعات کی عکاسی تھا جسکی وجہ سے انھیں لوگوں کی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔لیکن انھوں نے مضبوط ارادے رکھے اور ڈراما نگاری جاری رکھی۔اس بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے میں جان محمد آزاد لکھتے ہیں:

''انہوں نے جو پہلا اردو ڈراما لکھا وہ نشر ہو کر کافی مقبول ہوا۔کشمیر کے مانجھیوں کی زندگی پر مبنی ان کا لکھا ہوا ڈراما 'گھروندے' جونہی نشر ہوا تو اس نے تہلکہ مچا دیا۔سینکڑوں لوگوں نے ریڈیو اسٹیشن کے باہر مظاہرہ کیا لیکن اس حوصلہ شکن واقعہ نے پر جوش اور باعزم علی محمد لون کو ناامید نہیں کیا بلکہ اس کی ہمت اور مضبوط ہوئی۔'' ۲

علی محمد لون کا سب سے کامیاب ڈراما 'سیا' ہے۔اس ڈرامے کے ہر موڑ پر علی ان کی فنی مہارت کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ ایک تاریخی ڈراما ہے اور اس کا مرکزی کردار 'سیا' ہے۔'سیا' کشمیر کی تاریخ میں ایک بہترین انجینئر کے طور پر جانا جاتا ہے۔سیا نے وادی کشمیر کو سیلابوں سے بچانے کے لیے ایک بہترین کارنامہ انجام دیا ہے جس کی مثال آج بھی دی جاتی ہے۔

اردو افسانہ اور ڈراما نگاری میں کامیابی کے ساتھ ہی انہوں نے اردو میں ایک ناول 'شاید ہے تیری آرزو' بھی لکھا۔ یہ ناول بھی علی محمد لون کی فنی چابکدستی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہاں ان کے اس ناول پر بحث ہو گی۔

''**شاید ہے تیری آرزو**'' ان کا پہلا اور آخری ناول ہے۔ یہ ناول جے۔ کے۔ بک ہاؤس جموں سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا جو ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

ایک تصور یہ ہے کہ انسان کی تخلیق اُس کی ذات پات، دین ودھرم اور اونچ نیچ کی بنیاد پر نہیں ہوئی ہے۔ یہ سب اصول وضوابط انسانی سماج کے بنائے ہوئے ہیں۔ ''شاہد ہے تیری آرزو'' بھی اسی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ ہمارے سماج میں جہاں دین ودھرم، ذات پات، رنگ ونسل اور اُونچ نیچ کی بنیادوں پر انسانوں میں تفریق کیا جاتا ہے۔ اس امتیاز سے افراد میں محبت، ہمدردی، خلوص اور انسان دوستی کا جذبہ سرے سے ہی ختم ہو گیا ہے۔ اس ناول کے مرکزی کردار ''بالا'' اور ''جوالا'' سماجی کٹھپتلی بن کر اپنی ہی محبت کے بھنیٹ چڑھ جاتے ہیں۔ ناول نگار نے اس ناول میں اسی نظریہ کو پیش کیا ہے کہ جب تک دنیا میں بھید بھاؤ اور دین ودھرم کی دیواریں رشتوں کے درمیان حائل رہیں گی تب تک انسان کے دل میں رشتوں کی اہمیت کا احساس مفقود رہے گا۔

یہ ناول ایک ڈراما نگار علی احمد کی کہانی ہے جو تھیٹر کی سرگرمیوں کے سلسلے میں کشمیر سے دلی آجاتا ہے۔ ''شاہد ہے تیری آرزو'' کی کہانی دلی کے اس علاقے سے شروع ہوتی ہے جس کی فضا اور جس کی طرز زندگی بداخلاقیت کی غلاظت سے غلیظ ہو چکی ہے۔ احمد علی (راوی) چوں کہ کشمیر کے رہنے والے ہیں اور دلی میں ایک ڈراما کمپنی میں بہ سلسلۂ ملازمت اپنے دوست حمید کے توسط سے اُن کے گھر میں رہتے ہیں، جہاں صرف اُن کا نوکر ''بالا'' (اصل نام اقبال) رہتا ہے۔ لون دلی کے اُس علاقے کے ماحول اور فضا، طرز زندگی اور تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں جہاں شریف النفس انسانوں کو بھی بدکردار، بدمعاش اور بدچلن قرار دیا جاتا ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں کے بازاروں کی رونق و چمک دن میں نہیں بلکہ رات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

ناول کی شروعات میں کئی چیزوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ایک یہ کہ شہر کی زندگی میں ملنساری اور آپسی بھائی چارے کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ یہاں ہر کوئی اپنے آپ سے مطلب رکھتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ زندگی تنگ ہوتے ہوتے لوگوں کے ذہن بھی تنگ ہوتے جاتے ہیں۔جس کی وجہ سے بد کرداری اور بدفعلی اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ یہاں نہ صرف ہر کوئی رنڈیوں کی بات کرتا ہے بلکہ رنڈیوں کا باضابطہ میلہ لگایا جاتا ہے جہاں رات بھر شہر کے شریف لوگ رنڈیوں کا ناچ گانا دیکھنے آتے ہیں۔

لون نے ناول کے پسِ پردہ شہر کو ایک بڑی ذلیل چیز سے تعبیر کیا ہے جہاں انسان اپنی انسانیت کھو بیٹھتا ہے، جہاں انسان اپنے دل سے ہمدردی، رواداری اور آپسی بھائی چارے سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔یقیناً انسان ایسے دلدل میں پھنس جاتا ہے جہاں وہ انسانی خصائص کو بھول جاتا ہے اور درندگی وحیوانیت کا روپ دھار لیتا ہے۔ بالا بھی ایک بھنگن کے عشق کے دلدل میں پھنس گیا تھا لیکن ایک بھنگن ہی کیوں؟ یہ اپنے آپ میں ایک بڑا سوال ہے۔ بالا کو بچپن میں اُس کے ماں باپ کے انتقال کی وجہ سے پیار نہ ملا تھا۔ دوسری طرف اُس کے ماموں کی مار پیٹ نے بالا کو اور سنگ دل بنا دیا۔لیکن اب ایک بھنگن میں اُسے وہ پیار نظر آیا جس کی کمی اُس کی زندگی میں رہ گئی تھی۔ جس کی وجہ سے اُسے زندگی نہایت ہی خوشگوار محسوس ہو رہی ہے۔

ناول کے بین السطور میں لون اس بات کو ذہن نشین کراتے ہیں کہ گاوں ہو یا شہر، انسان کسی نہ کسی غم میں مبتلا ہوتا ہے۔ سریندر اور اطہر جو کہ راوی کے ساتھ ڈراما کمپنی میں کام کرتے ہیں۔ سریندر ایک طرف اپنے پیدائشی وطن لائل پور سے بچھڑنے کا غم لیے ہوئے ہیں اور اطہر اپنی جنم بھومی لاہور سے بچھڑنے کے غم میں مبتلا ہے اور راوی خود بالا کے غم میں کہ اس کی زندگی ایک ایسے

دلدل میں پھنس گئی ہے جہاں سے اس کا نکلنا مشکل ہے۔لیکن راوی ایک ناصح کے طور یہ باور کراتے ہیں کہ اگر انسان انہیں غموں کے نہاں خانوں میں گم ہوتا رہے تو دنیا سے قہقہے چھین جائیں گے اور مسکراہٹیں ختم ہوجائیں گی بلکہ درد میں اضافہ ہوگا۔لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ انسان کے جھوٹے اطمینان، آسودگی اور سکون کے پیچھے دکھوں کا ایک پہاڑ چھپا ہوتا ہے۔ اگر انسان کسی فعل بد میں مبتلا ہے تو اُس کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ضرور رہتی ہے۔ جوالا ہی کو لیجیے، وہ ایک جھونپڑی میں اپنے شوہر کے ہمراہ رہتی ہے۔لیکن اپنی عصمت کو بیچ کر اپنے شوہر اور بچے کا پیٹ بھرتی ہے۔لیکن اس کے باوجود بھی اُس کا شوہر اُس پر ظلم وتشدد جاری رکھتا ہے۔

علی محمد لون اس ناول کے ذریعے اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ جب انسان پر خارجی و نفسیاتی حالات و واقعات کا بوجھ بڑھ جاتا ہے تو اُسے دنیا بے مصرف معلوم ہوتی ہے۔ جوالا پر اُس کے شوہر کا ظلم، بالا کی بے سمت جوانی کیوں کہ وہ ایک ایسی عورت سے عشق کر بیٹھتا ہے جو ایک تو شادی شدہ ہے دوسرے یہ کہ وہ ایک ہندو ہے اور تیسری بات یہ کہ وہ اپنی عصمت بیچتی تھی۔ اطہر اپنے وطن کا غم لیے ہوئے ہے اور سریندر زندگی کے جینے کے سلیقے سے بیزار اور شیتل کو دھوکہ دینے کے احساس نے اُس میں ایک ایسی کسک پیدا کر دی تھی جس کی وجہ سے وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔

ناول میں علی محمد لون نے گاوں اور شہر کی تہذیب وتمدن کا موازنہ جوالا کے شوہر منو چمار کی موت کے ذریعہ کیا ہے۔ منو چمار کی موت جہاں ہوتی ہے وہاں آس پاس اس کی موت کا کہیں ذکر بھی نہیں ہوتا ہے۔یعنی شہر کی خاصیت یہی ہے کہ وہاں کوئی بھی بڑا واقعہ ہی پیش کیوں نہ آئے کسی کے کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔ کیوں کہ شہر کی زندگی پُر شور اور تیز رفتار ہوتی ہے۔اس کے برعکس گاؤں

کے لوگ بڑے ہی ملنسار، ہمدرد اور ملنے جھلنے والے ہوتے ہیں۔

سماج میں چند لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کے کردار کا پتہ اپنے اندازے کے سے لگاتے ہیں۔ جو کبھی کبھار نقصان دہ بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اپنی طبیعت اور من مانی سے لوگوں کے حق میں فیصلے بھی صادر کرتے ہیں۔ شیتل جو کہ سریندر سے محبت کرتی ہے لیکن کئی مردوں سے شناسائی کی بنیاد پر اس کے کرادر پر شک کی نگاہیں ٹکی رہتی ہیں اور اُس پر بدکرداری کی مہر ثبت کر دی جاتی ہے۔ ناول نگار بتانا چاہتے ہیں کہ زندگی ایک ڈراما ہے اور سماج میں بسنے والے لوگ اس کے کرادر۔ لیکن سماج کے چند لوگ اس ڈراما کے خالق کے طور پر لوگوں کے حق میں ٹھیک اُسی طرح فیصلے صادر کرتے ہیں جیسے ایک ڈراما نگار اپنے کرداروں کے حق میں۔ لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے کہ بُرے سے بُرے انسان کو اس بات کا احساس ہوجاتا ہے کہ کہیں نہ کہیں اُس سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہے اور وہ اپنی غلطی کو سدھارنے کے مواقع ڈھونڈتا رہتا ہے۔ شیتل کے حق میں چند لوگوں نے یہ رائے قائم کر لی تھی کہ وہ ایک بدکردار اور بدچلن عورت ہے جس نے اپنے چہرے پر شرافت کا میک اپ لگایا ہوا ہے۔ لیکن اُسے بھی اس بات کا احساس ہوجاتا ہے کہ اُس نے سریندر کو دھوکہ دیا ہے جس کے پچھتاوے نے اُسے سریندر سے معافی مانگنے پر مجبور کیا اور وہ سریندر سے شادی کے لیے تیار ہوجاتی ہے۔

لون نے سریندر اور شیتل کی Love Marriage کے پس پردہ اُن کے دفتر میں کام کرنے والے شرما اور پدما کی Love Marriage کا حوالہ دیتے ہوئے Love Marriage کی ناکامی کا احاطہ کیا ہے۔ لون کا تعلق سرزمین کشمیر سے ہے۔ آج بھی Love Marriage کو اہمیت نہیں دی جاتی ہے، کیوں کہ مانا جاتا ہے کہ اس طرح کی شادی کی عمر زیادہ نہیں ہوتی اور اس طرح سے

بنائے گئے رشتے کمزور ہوتے ہیں جن کے جلدی ٹوٹنے کا احتمال رہتا ہے۔

ناول میں جولا کا کردار کافی اہم ہے۔ جولا نہایت ہی نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی ایک بھنگن ہے۔ وہ لوگوں کے گھروں میں جا کر جمادارنی کا کام کرتی ہے۔ لیکن راوی کا جولا کے گھر جانا اور بالا سے رشتے کی بات کرنا اس کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے کہ ذات پات، بھید بھاؤ اور اونچ نیچ کی بنیاد پر افراد میں تفریق کرنے کے پیچھے اس کائنات کے تخلیق کار کی نہیں بلکہ سماج کی کارفرمائی ہے۔ راوی جو خود احساس برتری کا شکار ہے لیکن ایک بار اُنھیں کو بھی اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ جب بنانے والے نے کوئی تخصیص نہیں کی تو اس تفریق میں ہم انسان اتنی دلچسپی کیوں دکھاتے ہیں۔ ناول نگار سماج کے اُس ناسور کی طرف انگشت نمائی کرتے ہیں جس نے افراد میں ذات پات، رنگ و نسل اور اونچ نیچ کی بنیاد پر تفریق کی ہے۔ جس سے سماج اپنی تہذیبی و ثقافتی ساکھ کھو بیٹھتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ انسانی رشتوں کو نبھانے میں جب دین و دھرم حائل ہو جاتا ہے تو اُن رشتوں کی عمر یا تو کم ہوتی ہے یا پھر رشتے بننے سے رہ جاتے ہیں، جیسے جولا اور بالا کا رشتہ۔ حالاں کہ ایک دوسرے سے محبت کرنے کے باوجود بھی وہ ایک دوسرے کے نہیں ہو سکے کیوں کہ جولا ایک تو ہندو تھی اور دوسرے یہ کہ وہ ایک نچلی ذات سے تعلق رکھتی تھی۔ بالا مسلمان تھا لیکن وہ ہندو بننے کے لیے بھی تیار ہو جاتا ہے مگر جولا اپنی ذات پات، دین و دھرم اور سماجی اصولوں کے لیے بالا کو بھینٹ نہیں چڑھانا چاہتی ہے اور اسی لیے اس رشتے سے انکار کرتی ہے۔

ناول نگار نے انسانی رشتوں کے درمیان حائل ہونے والے کٹر سماجی اصولوں کے ساتھ ساتھ قانون پر بھی تنقید کی ہے۔ قانون ایک بھنگن کو سندی طور پر نچلی ذات سے تعلق رکھنے والی قرار دے سکتا ہے لیکن اُسے سماج میں عزت نہیں دلا سکتا۔ قانون جولا کے بچے کو ایک بھنگن کا بچہ کاغذی طور پر

ثابت کرسکتا ہےلیکن اُسے اپنے والدین کے سائے سے دور کرنے والے سماج کے سخت گیر اصولوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے۔یعنی سماجی اصولوں کے ساتھ ساتھ قانون بھی کہیں نہ کہیں سماج میں بسنے والے افراد میں تفریق کرنے کا رول ادا کرتا ہے۔لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب سماج اور قانون کے یہ بندھن ٹوٹ جاتے ہیں اور انسان ایک ایسا راستہ اپنانے پر مجبور ہو جاتا ہے جہاں پر اُسے باغی قرار دیا جاتا ہے۔ بالا کو یہ تجویز ملتی ہے کہ یا تو وہ جولا کو بھگا کر لے جائے یا پھر وہ اپنا دھرم بدلے۔سماجی اور قانونی اصول وضوابط سے بالاتر ہو کر ایک باغیانہ راستہ اپنانے کے پیچھے جولا کے اُس نوزائید بچے کا مستقبل تھا؛ جسے ابھی یہ بھی نہیں معلوم کہ اُس کا باپ کون ہے۔

مذہب تبدیل کرنے یا جولا کو بھگا کر لے جانے کی تجویز اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر انسان سماج کے ان فرسودہ اصولوں کو مٹا دینا چاہتا ہے تو اُسے ہمت سے کام لینا ہوگا اور بزدلی اور ڈر کو دل سے دور کرنا ہوگا۔ کیوں کہ ذات پات، رنگ ونسل اور اونچ نیچ کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان فرق کرنے والے اصول ہمت جٹا کر ہی مٹائے جاسکتے ہیں۔

ناول کے بین السطور میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ انسان میں چاہے کتنی بھی خامیاں کیوں نہ ہوں، ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اُسے اپنی خامیوں کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ ایک نیک سیرت انسان بننے کی کوشش کرتا ہے۔ راجو جو کہ ایک بدتمیز اور بداخلاق اور بدزبان ہے لیکن بالا کے بیمار ہونے کے بعد جس طرح وہ اُس کی تیمارداری کرتا ہے اُس سے اُس کے اندر کی اچھائی صاف دکھائی دیتی ہے۔ سریندر جس کو آخر میں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ اُس نے شیتل کے ساتھ دغا بازی کر کے ایک غلط کام انجام دیا ہے، بالا کا دل بھی راجو کی اچھائی دیکھ کر پگھل جاتا ہے۔ دراصل کسی بھی انسان کے تئیں اندازہ لگانا بہت ہی مشکل ہے کیوں کہ ایک حرکت، ایک معمولی بات یا پھر ایک واقعہ کسی بھی انسان

کے تئیں لگائے گئے اندازے کو غلط ثابت کر سکتا ہے۔ناول نگار یہ بات ذہن نشین کراتے ہیں کہ انسان کے دل میں نفرت، محبت، حسد، دشمنی، اور ہمدردی و دوستی کا مادہ ایک ساتھ ہوتا ہے۔لیکن اُس پر اُس کے نفسیاتی و مادی حالات و واقعات کی بنیاد پر اچھے یا بُرے ہونے کی لیبل لگائی جاتی ہے۔

ناول کا اختتام جولا کی خودکشی پر ہوتا ہے۔ جو اس دنیا میں تب دوبارہ جنم لینے کی خواہاں ہے جب اس دنیا میں دین و دھرم کی دیوار بالا اور اُس کی محبت کے درمیان مٹ جائے گی۔ جب اس سماج میں سبھی ایک سمان ہوں گے۔ جولا اپنے بچے کے لیے یہ پیغام چھوڑ جاتی ہے کہ وہ جب بڑا ہوگا تو سماج کے اُن کٹر پن اصلوں کے خلاف جنگ کرے اور اسے اس دنیا سے مٹا دے۔تب جا کے سبھی انسان ایک سمان ہو سکتے ہیں۔ایک اقتباس جولا کے کردار سے متعلق ملاحظہ کیجیے:

> ''نہیں نہیں۔ میں تب تک اس سنسار میں جنم نہیں لوں گی جب تک دین دھرم کی دیوار بالا ور جوالا کے بیچ کھڑی رہے گی۔ یہ دیوار نہ رہے گی تو جنم لوں گی اور بالا سے ملوں گی۔ جب آؤں گی۔ جب سبھی ایک سمان ہونگے۔ بالا یہاں آؤ میرے سامنے۔۔۔۔ بالا اس جنم میں میں نے کیوں تمہیں اپنا سوامی مانا ہے۔ منا کو میرے بعد سنبھال لینا۔ یہ تمہارا بچہ ہے۔کنسٹپل صاحب۔ میں تمہارے سامنے اپنا بچہ بالا کو سونپ رہی ہوں۔اس کی رکھشا کرے گا۔اسے پالے گا، پوسے گا، بڑا بنائے گا اور سکھائے گا کہ اس کی ماں نے جس چیز کے کارن پران دئے۔اس سے یدھ کرے۔اسے سنسار سے مٹا ڈالے۔تبھی سب منش ایک ہوں گے اور تب ہی میں جنم لے کر اس سنسار میں آؤں گی۔نہیں تو کبھی نہیں آؤں گی۔کبھی نہیں۔کبھی نہیں۔'' ۳

مندرجہ بالا اقتباس ناول کا مرکزی نقطہ بھی ہے کہ رشتوں کے درمیان جب بھید بھاؤ، دین و دھرم، ذات پات، اونچ نیچ اور سماجی اصول در آتے ہیں تو انسان کی معنویت مسخ ہو کر رہ جاتی ہے۔

’شاہد ہے تیری آرزو‘فنی تناظر میں بھی ایک اچھا ناول قرار دیا جاسکتا ہے۔ناول کا پلاٹ عمدہ اور مربوط ہے چوں کہ ناول کا راوی ایک ڈراما نگار ہے اسی لئے ایک آدھ جگہ فن ڈراما نگاری کی طرز پر لکھے گئے حصے کی وجہ سے پلاٹ میں تھوڑا سا جھول نظر آتا ہے۔

جہاں تک مکالمہ نگاری کی بات ہے تو مکالمہ نگاری کے وہ تمام اصول اپنائے گئے ہیں جن میں ناول کی کامیابی مضمر ہے۔کرداروں کے ذریعے ایسے مکالمے ادا کیے گئے جن سے کردار کے پڑھے لکھے یا ان پڑھ ہونے کی تصدیق ہو جاتی ہے۔نوکر بالا کے ذریعے ایسے ہی مکالمے ادا کیے گئے جیسے ایک نوکر کی زبان ہوتی ہے اور جوالا کے ذریعے بھی ایسے ہی مکالمے ادا کیے گئے جیسے ایک بھنگن ادا کر سکتی ہے۔

زبان و بیان کے اعتبار سے بھی ناول ایک مکمل تخلیق پارہ نظر آتا ہے۔اس میں ہندی اور انگریزی الفاظ خوب استعمال ہوئے ہیں ۔اسلوب نگارش صاف اور سلیس ہے، ثقیل لفظیات کے استعمال سے احتراز کیا گیا ہے۔جملوں کو کئی جگہوں پر ادھورا چھوڑا گیا ہے جو ایک طرف قاری میں تجسس برقرار رکھتا ہے اور دوسری طرف اُسے سوچنے کا بھی موقع فراہم کرتا ہے۔بہر کیف مذکورہ ناول فنی و موضوعاتی طور پر ایک کامیاب فن پارہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

وِجے سوری

وجے سوری کی پیدائش ۱۹۴۲ء میر پور پاکستان میں ہوئی اور ان کا انتقال مئی ۲۰۰۴ء میں جموں میں ہوا۔ان کے والد رام لال سوری اور ماں برج رانی نے ۱۹۴۷ء میں آزادی اور فسادات کے بعد میر پور سے جموں ہجرت کر کے یہیں سکونت اختیار کی۔تب سے یہیں کے ہو کے رہ گئے۔گو یہ کہہ

سکتے ہیں کہ وجے سوری بچپن ہی میں ہماری تاریخ کے سب سے بڑے المیہ سے دوچار ہوئے اور یہی المیہ ان کی تحریروں میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

انہوں نے جموں سے ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کی۔لیکن اسکول میں پڑھائی لکھائی سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہوں نے آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کر کے پانچ سال کا وقفہ لیا۔ اس دوران وہ اپنے والد کے ساتھ دوکان پر بیٹھا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز ریڈیو سے کیا۔لیکن ریڈیو کے ساتھ ساتھ فکشن سے بھی ان کا گہرا تعلق اور لگاؤ رہا ہے۔ افسانے پڑھنے کی لگن ان کے اندر ابتدا ہی سے تھی اور ہر اچھے افسانے نگار کو وہ ذوق و شوق سے پڑھتے تھے۔ اسی لگن نے انہیں ایک کامیاب افسانہ نگار بنا دیا۔ اس کے علاوہ اسٹیج اور ڈرامے سے بھی انہیں خاص دلچسپی تھی۔ اس بارے میں ان کے ایک دوست نریندر ناتھ سوز لکھتے ہیں:

> ''اسٹیج ڈرامے کا شوق اسے اسکول کے زمانے سے ہی تھا اور وہ رفتہ رفتہ ایک کامیاب اسٹیج آرٹسٹ بن گیا۔ اسی کامیابی کی وجہ سے اسے سانگ اینڈ ڈراما ڈیویژن، بھارت سرکار میں ملازمت مل گئی اور ڈراما انسٹرکٹر کی پوسٹ پر اس کا تقرر ہوا۔ کئی ٹی۔ وی سیریلز میں بھی اس نے کام کیا اور کئی ٹی سیریل خود بھی لکھے۔ گویا کہ وجے سوری ہر فن مولا بن گیا اور ہر شعبے میں مقبول ہو گیا۔''[۴]

جیسا کہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ وجے سوری نے اپنی ادبی زندگی کی شروعات افسانے سے کی۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''آخری سودا'' ہے جسے قارئین نے کافی سراہا۔ ان کے افسانوں میں زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں نہایت خلوص سے کہی گئی ہیں۔ زبان کی مٹھاس اور جذبے کی صداقت پر محنت کی گئی اور افسانوں کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے اصل موضوع کو مسخ نہیں ہونے دیا گیا۔

''**کاغذ کی ناؤ**'' وجے سوری کا پہلا ناول ہے۔انھوں نے اپنی قلیل ادبی زندگی میں چند اچھی کہانیاں دینے کے بعد ناول نگاری کی شروعات کی اور اپنا پہلا ناول 'ایک ناؤ کاغذ کی' قارئین کے سامنے پیش کر اپنی فنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔اس ناول میں کردار نگاری کی عمدہ مثالیں دیکھنے کو ملتی ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ یہ ناول ہائی وجے پبلیکیشنز کی وساطت سے ۱۹۶۵ء میں پہلی بار چھپ کر شائع ہوا اور بے حد کامیاب ہوا۔اس ناول میں وہ تمام عناصر پائے جاتے ہیں جن کا ایک کامیاب ناول میں پایا جانا ضروری ہے۔

ناول ''ایک ناؤ کاغذ کی'' دراصل ایک ادیب، ایک قلم کار پال کی محبت کی ناکامی کی داستان ہے۔لیکن ناول نگار نے اس عام سی کہانی کو ایسے انداز اور انفرادیت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ آخر تک کہانی میں دلچسپی کا عنصر باقی رہتا ہے۔ پال جو ایک ادیب ہے اور ناول اور شاعری میں کافی دلچسپی رکھتا ہے ۔ اس کے اندر تخلیقی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ کالج کے زمانے سے اپنی ایک انفرادیت اور پہچان بنا لیتا ہے۔ وجے سوری نے ناول میں پال کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ صرف پال ہی کا نقشہ معلوم نہیں ہوتا بلکہ ہمارے ملک کے تمام ادیبوں پر اسے چسپاں کیا جاسکتا ہے:

> ''پال بذاتِ خود ایک ادیب تھا اور اس کی بھی وہی حالت تھی جو عموماً اس ملک کے ادیبوں کی ہوا کرتی ہے۔ پال کی ادبی زندگی کا آغاز کالج کے زمانے میں ہوا تھا۔ اس زمانے میں وہ شاعری کیا کرتا تھا۔لیکن خود ہی آہستہ آہستہ وہ نثر کی طرف مائل ہوتا گیا۔لیکن وہ کالج کا زمانہ تھا اور یہ زندہ رہنے کے لئے جدوجہد کا دور۔ پال کے اب تک چار ناول شائع ہو چکے تھے۔ دنیائے ادب میں اس کا نام بھی تھا۔لیکن نام ہی تو سب کچھ نہیں۔ اسے ہر ناول کا معاوضہ دوسو روپیہ کے قریب ملتا ہے جو اس مہنگائی کے زمانے میں بہت قلیل رقم تھی اور پھر ناول بھی تو

روز نہیں لکھے جاتے اور پھر نہ ہی یہ مغرب ہے جہاں ایک ناول نگار ایک ناول لکھ
کرتا حیات اقتصادی پریشانیوں سے نجات پا جاتا ہے۔'' ۵

لیکن کالج کے دوران ہی پال ایک امیر زادی جوالا کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ جوالا پال کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔ وہ ایک دولت مند لڑکی تھی اور کار کے بغیر کبھی کالج نہ آتی تھی۔ پال اس کے برعکس ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ غریبی میں انسان کے پاک جذبات کی کس طرح توہین ہوتی ہے اس کا اندازہ ناول پڑھ کر اچھی طرح ہو جاتا ہے۔ جوالا پال اور اس کے دل میں پنپ رہے پاکیزہ جذبات کو اس لئے ٹھکرا دیتی ہے کیونکہ اسے اس بات کا ڈر ہے کہ زمانہ کیا کہے گا اگر اس نے پال جیسے معمولی انسان کی محبت قبول کر لی۔ دوسری طرف پال دنیا کے لوگوں کے بنایا ہوئے ان فرسودہ رویات کو نہیں مانتا جن کی رو سے حساب سے محبت اپنے رتبہ کے حساب سے ہونی چاہیے۔ چنانچہ اپنے خیالات کے گھیرے میں گھرا رہتا ہے اور خود سے کئی سوال کرنے لگتا ہے مثلاً ایک اقتباس دیکھئے:

''وہ سوچتا رہا... کیا اس کی محبت اس کے جذبات کو صرف اس لئے ٹھکرا دیا گیا ہے
کہ وہ مفلس ہے۔ برسوں سے ایک ہی سوٹ میں کالج آ رہا ہے اور باقی لڑکوں
کی طرح وہ کنٹین میں ایک ہی نشست میں دس دس روپے خرچ نہیں کر سکتا۔ اور
کیا یہ دولت مند ہم غریبوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے رہیں گے؟ کیوں یہ لوگ
صدیوں سے ہم غریبوں کو کچل دینے کے درپے ہیں؟ کیوں آخر کیوں؟ ۶

لیکن جوالا پال کی محبت کے سامنے پگھل جاتی ہے وہ بھی اس سے پیار کرنے لگتی ہے۔ چونکہ جوالا کا والد سیٹھ امرناتھ جب پال سے ملتا ہے تو وہ کو ذلیل کرتا ہے۔ جوالا اپنے والد سے ناراض ہو کر پال کے ساتھ کلکتہ بھاگ جاتی ہے۔ یہاں پال اور جوالا مندر میں شادی کر لیتے ہیں۔ پال یہاں پر

بہت کوشش کرتا ہے کہ اسے کوئی نوکری مل جائے مگر قسمت اس کا ساتھ نہیں دیتی۔ یہاں پر کہانی ایک نیا موڑ لیتی ہے۔ جوالا جو ناز ونعم میں پلی بڑی ہے یہاں اسے کئی کئی دن بھوکہ رہنا پڑتا ہے۔ ایسے میں جوالا کو محبت پر سے بھروسہ اٹھ جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے کہتی کہ اگر اسی کا نام قربانی اور امتحان ہے تو وہ باز آئی ایسی محبت سے۔ ایسے میں وہ اپنے والد کو ایک خط لکھتی ہے۔ اس کا والد پولیس کی مدد سے پال کو گرفتار کرواتا ہے اور اپنی لڑکی جوالا کی شادی کہیں اور کر دیتا ہے۔ ناول کا اختتام ایک عدالت کے مقدمے پر ہوتا ہے جہاں پال جوالا کو اغوا کرنے کا الزام اپنے سر لیتا ہے اور یوں اسے پانچ سال کی سزا ہوتی ہے۔

غربت اور مفلسی کے علاوہ ناول میں سماجی برائی جیسے جہیز کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ پال اپنی بہن کی شادی کرانے کے بارے میں جب بھی سوچتا ہے اسے جہیز اس کی بہن کی شادی کے بیچ بڑی رکاوٹ کے روپ میں نظر آتی ہے۔ ناول سے ایک اقتباس بطور مثال ملاحظہ کیجیے:

> ''جوالا کا چہرہ خوشی میں دمک رہا تھا۔ لیکن اب وہ بھی خاموش تھی اور پال کرسی میں بیٹھا سر جھکائے سوچ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں انتشار تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ابھی اسے شادی کرنے کا کیا حق تھا جب کہ اس سے پانچ سال بڑی بہن کنواری بیٹھی تھی۔ بہن کا خیال آتے ہی وہ دوسری سوچ میں گم ہو گیا۔ مگر وہ بہن کی شادی کرتا بھی تو کیسے۔ اس کے سامنے جہیز کا سوال ایک دیو بن کر آ کھڑا ہوتا۔ جہیز۔ کتنا گندہ اور ذلیل بیوپار ہے یہ؟ حکومت نے ڈاوری بل بنا ڈالا ہے۔ ڈاوری بل۔ کون مانتا ہے اس ڈاوری بل کو۔ نہ جانے کب اس ملک کے لوگوں کا اس بات کا احساس ہوگا کہ یہ سب سے بڑا گناہ ہے۔...بھگوان جانے کب اس ملک کے لوگ اس ذلیل رواج کو ختم کریں گے۔'' ۷

ناول کا پلاٹ صاف اور اکہرا ہے۔ کہانی میں کوئی جھول نہیں۔ پال اور جوالا کے علاوہ کئی ایک

کردار ہمارے سامنے آتے ہیں اور جن کی اہمیت ناول میں ضمنی ہے۔ مکالمہ نگاری اور منظر نگاری کے لحاظ سے بھی یہ ناول کامیاب نظر آتا ہے۔ زبان و بیان اور اسلوب کافی متاثر کن ہے۔ مجموعی طور پر ناول ''ایک ناؤ کاغذ کی'' وجے سوری کا بہترین ناول ہے اور کشمیر کی ناول نگاری کی تاریخ میں اسے اپنی خصوصیات کی بدولت کافی اہمیت حاصل ہے۔

غلام رسول سنتوش (۱۹۲۹ء

غلام رسول سنتوش کے آبا واجداد مہاراجہ گلاب سنگھ کے زمانے میں دسل پورہ تحصیل پٹن، ضلع بارہ مولہ سے ہجرت کر کے نالہ مار کے کنارے چنکرال محلّہ حبہ کدل سری نگر میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ غلام رسول سنتوش کے والد کا نام غلام محمد ڈار تھا۔ جولاہے کا کام ان کو وراثت میں ملا تھا۔ تاہم وہ محکمہ پولیس میں بطور کانسٹیبل ملازم ہو گئے تھے اور ملازمت کی وجہ سے اکثر اپنے گھر سے باہر رہا کرتے تھے۔ سنتوش کی ماں کا نام سعیدہ بیگم تھا۔ ۱۹ر جون ۱۹۲۹ء کی صبح غلام رسول ڈار کی ولادت محلّہ ڈب تل سرینگر میں ہوئی۔ ۱۹۴۵ء سنتوش نے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا لیکن پھر وہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ سنتوش نے ایک معمولی رنگ ساز کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ سائن بورڈوں اور گاڑیوں پر رنگ چڑھانے کا کھردرا کام بالآخر ان کیلئے زندگی میں نکھار کا ذریعہ بن گیا۔ ۱۹۵۲ء میں ''انجمن ترقی پسند فنکاراں جموں وکشمیر، Progressive Writers Association of Jammu and Kashmir'' کے ممبر بن گئے اور اس طرح سے دنیائے فن کے طویل سفر کا آغاز کیا۔ ۱۹۵۴ء میں بخشی غلام نے سنتوش کو مصوری کی تربیت حاصل کرنے کی غرض سے

مہارجہ سیاجیراو یونیورسٹی بڑودہ بھیج دیا۔ سرکار کی طرف سے ان کو ماہانہ ڈیڑھ سو روپئے وظیفہ ملنے لگا۔ بڑودہ میں شعبہ مصوری کے سربراہ این۔ ایس۔ بیندرے تھے۔ سنتوش نے ان کی رہنمائی میں دو سال تک کام کیا۔ دو سال کے اس مختصر عرصے میں سنتوش مشہور فنکار بن گئے۔ مصوری کے میدان میں آگے بڑھنے کے لئے سنتوش نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ جہاں وہ کئی عالمی شہرت کی آرٹ گیلیریوں سے وابستہ ہو گیا۔ جن کے اہتمام سے ان کی تصویروں کی نمائش ملک کے بڑے شہروں کے علاوہ بیرون ملک کے اہم شہروں میں بھی منعقد ہوئی۔

''سمندر پیاسا ہے'' غلام رسول سنتوش کا پہلا اور آخری ناول ہے۔ غلام رسول بنیادی طور پر ایک مصور تھے۔ لیکن اردو زبان و ادب سے انہیں گہری دلچسپی تھی اور اسی دلچسپی اور وابستگی نے ان سے ''سمندر پیاسا ہے'' ناول لکھوایا۔ یہ ناول انھوں نے ۱۹۶۵ء میں لکھا۔ ناول لکھنے کی وجوہات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ ایک جگہ خود لکھتے ہیں:

> ''ایک دن پرائمر ہوٹل میں علی محمد لون نے مجھ کہا ''اردو میں نہیں لکھ سکوں گا''۔ میں نے اُسی وقت ناول لکھنے کا ارادہ باندھ لیا۔ بڑودہ نے مجھے 'سمندر پیاسا ہے' ناول کا موضوع دیا۔'' ۸؎

چنانچہ انہوں نے اردو ناول نگاری کے میدان میں قدم رکھا مگر وہ مصوری میں بھی مصروف رہے اور اسی وجہ سے وہ اس صنف نثر کی طرف زیادہ توجہ نہ کر سکے۔ غلام رسول سنتوش نے اگر چہ اردو میں صرف ایک ہی ناول لکھا۔ لیکن اس ناول سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے اندر وہ تمام صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھی، جن کا پایا جانا ایک ناول نگار میں ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ ایک مصور تھے اور اکثر اوقات تصویریں بنانے میں مصروف رہتے تھے۔ اس وجہ سے یہی مصوری اس ناول میں

اول تا آخر چھائی ہوئی ہے۔ناول کے قریب قریب تمام کردار مصوری سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

''سمندر پیاسا ہے'' کے نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں پر کئی کردار ایسے ہوں گے جن کی پیاس بجھتے ہوئے بھی بجھتی نہیں ہوگی۔ ناول میں رومان اور ہوس پرستانہ جذبات کی عکاسی بہترین انداز میں کی گئی ہے۔ناول پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ یہ کہانی مصنف کی زندگی سے بہت حد تک میل کھاتی ہے۔

اس ناول میں واحد متکلم کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ایسی تکنیک میں ناول نگار کسی انجانے کردار کی وساطت سے ناول کو آگے بڑھاتا ہے۔ واحد متکلم ہی ناول میں تمام کرداروں کا تعارف کراتا ہے اور تمام واقعات میں وہ موجود رہتا ہے۔اس ناول میں مصنف ناول کے ہر ایک واقعے سے کسی نہ کسی طرح جڑا ہوا ہے اور تمام ناول اسی کے گرد گھومتا ہے۔

غلام رسول سنتوش اپنے ناول 'سمندر پیاسا ہے' میں زندگی کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ واقعات اور کردار تمام بنیادی محرکات کے ساتھ اجاگر ہوتے ہیں۔ حالانکہ زندگی اتنی وسیع ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں کو پیش کرنا مشکل ہے۔لیکن وہ اس مشکل امر سے بخوبی عہدہ برآ ہوتے ہیں۔کسی بھی پس منظر کو ابھارنے میں انہوں نے کرداروں سے کام لیا ہے۔انھوں نے مصوری کی مدد سے ناول کے کرداروں کی زندگیاں عیاں کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

ریاست جموں وکشمیر کے ناولوں میں اس ناول کی اہمیت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کیوں کہ اس میں پہلی بار شعور کی رو **Stream of Consciousness** تکنیک کی ہلکی سی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ دراصل شعور کی رو تکنیک میں ہم کرداروں کی خارجی زندگی سے زیادہ ان کی داخلی زندگی سے متاثر ہوتے ہیں۔ کرداروں کی داخلی زندگی کے اسرار و رموز وہی فنکار اجاگر کرسکتا ہے جو

اس فن میں مہارت رکھتا ہو۔ چنانچہ ایسا لگتا ہے کہ سنتوش اس گُر سے اگر چہ پوری طرح نہیں ،لیکن پھر بھی کسی حد تک واقف ہیں۔انہوں نے ناول میں کرداروں کی خارجی زندگی کے بجائے درونِ ذات کی پرتوں کو بڑی فنکاری سے کھولا ہے۔غلام رسول سنتوش نے پوری توجہ اس پر صرف نہیں کی۔اگر وہ ایسے کرتے تو وہ شعور کی رو تکنیک میں عمدہ نمونے پیش کر سکتے تھے۔لیکن پھر بھی جہاں تک ان سے ہوسکا،کرداروں کی نفسیات کو اجاگر کرنے میں انہوں نے کافی محنت کی۔

سنتوش کا ناول ’سمندر پیاسا ہے‘ ان کی زندگی اور ان کے فن دونوں کا عکس ہے۔ یہ فنکار کی اپنی اصطلاحوں میں اپنی سرگزشت بھی ہے۔ چنانچہ وہ ناول کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ’’سمندر پیاسا ہے‘‘ میرا پہلا ناول ہے۔اس سے پہلے میں نے کشمیری اور اردو میں کہانیاں لکھی ہیں جن میں دوسروں کے چہروں کو اپنے آئینے سے دیکھنے کی جسارت کی ہے۔لیکن میں نے ’سمندر پیاسا ہے‘ میں اپنے چہرے کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ناول میں جو کردار ہیں وہ میرے جانے پہچانے ہیں۔مدّتوں میرے دل کے قریب رہے ہیں۔ جو واقعات ہیں وہ حقیقی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا تعلق براہِ راست میری زندگی سے بھی ہے۔ ناول میں میری زندگی کی بلندیاں اور پستیاں بھی ہیں اور تلخ و شیریں تجربے بھی جو انسان میں جینے کی تحریک بخشتے ہیں۔‘‘ 9

اس اقتباس سے اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ناول غلام رسول کی زندگی سے کافی حد تک ملتا ہے۔ناول پڑھتے ہوئے بھی اس کا اندازہ ہوتا ہے۔اس ناول میں کئی ایسے واقعات ہیں جو واقعی ان کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ ناول کی کمزوری نہیں بلکہ خوبی ہے کیونکہ اچھا ناول زندگی سے قریب ہوتا ہے اور یہی خوبی اسے داستان سے الگ کرتی ہے۔حقیقی زندگی سے قریب ہونے کے

باوجود بھی ناول نگار نے بہترین انداز سے کہانی کو ترتیب دیا ہے۔

کردار نگاری کے اعتبار سے ناول ''سمندر پیاسا ہے'' کسی حد تک کامیاب نظر آتا ہے۔ ناول میں کئی کردار ہے۔ جن میں سے کچھ اہم ہیں اور کچھ غیر اہم۔ لیکن ناول کے سبھی کردار ہماری طرح گوشت پوست والے انسان ہیں۔ جو ہماری طرح زندگی کے کئی مراحل سے گزرتے ہیں۔ کبھی غمگین بھی ہوتے ہیں اور کبھی خوش بھی۔ ناول کے کردار کسی نہ کسی طرح زندگی کی تلخ حقیقتوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔

ناول کا مرکزی کردار خود مصنف ہے۔ تمام واقعات کسی نہ کسی طرح اس سے جڑے ہوئے ہیں۔ ناول کے تمام واقعات میں وہ موجود رہتا ہے۔ یہی کردار پورے ناول پر چھایا ہوا نظر آتا ہے اور دوسرے کرداروں سے ہمارا تعارف کراتا ہے۔

ناول پڑھتے ہوئے ایسا گمان ہوتا ہے کہ اس کردار کے پسِ پردہ ناول نگار خود بول رہا ہے۔ یہ کردار دراصل مصور کا ہے اور تصویریں بنانے میں اسے بے حد دلچسپی ہے۔ اپنی پہلی محبت چھن جانے کے بعد وہ ہمیشہ اپنی ہی سوچوں میں ڈوبا رہتا ہے۔ دراصل جس لڑکی کو اس نے کبھی چاہا تھا اُس کی شادی اس کے گھر والوں نے اس کی مرضی کے خلاف کہیں اور کردی۔ جس کے نتیجہ میں وہ اُداس رہنے لگا۔ اسی لئے اگرچہ کئی لوگ اسے اپنانا چاہتے ہیں لیکن وہ کسی کو اپنانے کا تصور نہیں کرتا۔ پورے ناول میں یہ کردار نفسیاتی الجھنوں کا شکار رہتا ہے۔ وہ اپنے ماضی کو بھولنا چاہتا ہے مگر نہیں بھول پاتا اور ماضی کی یادیں اس کے دل ودماغ میں آخر تک رہتی ہے۔ اپنے محبت کے جذبات اور نفسیاتی صورتحال کی عکاسی مصنف یوں کرتا ہے:

''یہ حقیقت تھی کہ میں نے اس لڑکی سے پیار کیا تھا۔ بچپن میں ہم اکٹھے کھیلتے تھے

۔ ہمارا پیار ایک ساتھ پل کر جوان ہوا۔ جوانی اپنے ساتھ نام لائی، مذہب لائی اور ہم دونوں کو سماج کے آہنی ہاتھوں نے الگ کر دیا۔ اس لئے کہ ہم دونوں کے نام مختلف تھے۔ مذہب مختلف تھے۔ سماج مختلف تھے۔ ہندو سماج، مسلمان سماج اور ایک دن اس کی شادی ہوگئی۔ آنسوؤں میں گھلی ہوئی مہندی ہاتھوں پر رچے ہوئے وہ اپنے گھر کو چھوڑ کر چلی گئی۔ مجھے روتا ہوا چھوڑ کر چلی گئی۔ میری خوشیاں اپنے ساتھ لے گئی۔ مستقبل کے سہانے محل کو کھنڈر بنا کر چلی گئی۔ اب میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ایک بے معنی سا وجود تھا۔'' ۱۰

اپنی محبت چھن جانے کے بعد وہ اکثر اداس رہنے لگا۔ مصوری میں اس کے دن اور راتیں گزرتی گئیں۔ کئی لوگوں سے اس کا سامنا ہوا۔ جیسے شکنت، ہاجرہ، کلپنا، کانتا۔ ہر ایک نے اسے سہارا دینے کی کوشش کی لیکن وہ کسی کو اپنا نہ سکا۔ وہ کسی سے اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکا کیوں کہ وہ محبت کی جنگ میں پہلے ہی ناکام ہو چکا تھا۔

یہ کردار نہ صرف ایک بہترین مصور ہے بلکہ اس کے اندر ہر ایک انسان کے لئے محبت اور ہمدردی کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ وہ ہر موقعے پر انسان دوستی کی باتیں کرتا ہے۔ وہ لوگوں کے پیدا کردہ رسم و رواج کو قبول نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اکثر مقامات پر بغاوت پر اتر آتا ہے۔

ناول کے اس کردار کو تراشنے میں غلام رسول سنتوش نے کامہارت سے کام لیا ہے۔ ایک طرف ناول کا ہیرو ناکامیٔ محبت کے صدمے سے کافی دکھی ہے تو دوسری طرف اس میں زندگی جینے کا حوصلہ بھی باقی ہے۔ وہ اپنی ماں، ہاجرہ اور اپنے چھوٹے بھائیوں کو پالنے کے لئے کافی محنت کرتا ہے۔ اس کی محنت رنگ لاتی ہے اور وہ بہترین مصور بن جاتا ہے۔ شہرت پانے کے باوجود بھی وہ اپنی ماں اپنے بھائیوں، ہاجرہ اور دوسرے یار دوستوں کو نہیں بھولتا۔ بلکہ برابر ان کے دکھ درد اور خوشیوں

میں شریک ہوتا ہے۔

ناول کا دوسرا اہم کردار ہاجرہ ہے۔ ہاجرہ کا بچپن کھلی فضاؤں میں گزرتا ہے لیکن جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اس کی زندگی میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ہاجرہ کا تعارف ناول میں اس انداز میں پیش کیا گیا ہے:

''ہاجرہ میری پھوپھی کی لڑکی تھی۔ غریب ماں کی غریب اولاد، جو وقت سے پہلے ہی جوان ہو جاتی ہے۔ زمانہ جنہیں دکھ درد دے کر پہلے ہی بوڑھا بنا دیتا ہے۔ یا روگی بنا کر مرنے کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔'' [11]

ہاجرہ سرتاسر ایثار و قربانی کا مجسمہ ہے۔ اس کردار میں کشمیر کی عام کم تعلیم یافتہ لڑکیوں کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ جن کے اندر محبت اور ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور دوسری چیز شرم وحیا ہے۔ ہاجرہ شرم وحیا کا مجسمہ ہے اور اسی وجہ سے اس کی زبان کبھی بھی کھلنے نہیں پاتی۔ ہاجرہ اندر ہی اندر محبت کے الاؤ میں جلتی رہتی ہے مگر شرم وحیا کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتی۔ چونکہ لڑکیوں کا اپنی پسند سے لڑکے کو چننا اور پھر اس سے شادی کرنا مسلم سماج میں گناہ تصور کیا جاتا ہے اور اسی لئے ہاجرہ بھی یہ گناہ کرنے سے کتراتی ہے۔ لیکن دوسری طرف اس محبت کی شدت کی وجہ سے وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔

ناول نگار نے اس ناول کے ذریعے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح سماج کے قائم کردہ غلط تصورات ایک انسان کی جان لیتے ہیں۔ غلام رسول سنتوش کا یہ ناول دراصل کشمیر کے لوگوں کے غلط تصورات اور توہمات کے خلاف ایک احتجاج بھی ہے۔ کیونکہ انہیں غلط تصورات سے ہی ہاجرہ اپنے دل کی بات کبھی بھی زبان پر نہیں لاتی۔

ناول میں شکنت کا کردار ایک الگ پہچان لئے ہوئے ہے۔آ خر تک قاری کی ہمدردی اس کے ساتھ برابر رہتی ہے۔ وہ ناول کے ہیرو کو اپنانا چاہتی ہے لیکن ہیرو اپنی پہلی محبت کے حصار سے باہر نہیں آ تا۔جس کی وجہ سے شکنت کو مجبوراً تنہائی کی زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ ناول کے کچھ اور اہم کرداروں میں پشپا، کانتا، آ شا، جیوتی، ستیش، ترلوک اور بوڑھا پاگل وغیرہ شامل ہیں۔

غرض کہ اس ناول کے یہ تمام کردار غیر صحت مند سماج کی عکاسی کرتے ہیں۔اس ناول کے تمام نسوانی کردار کسی نہ کسی طرح مصیبت اور پریشانیوں میں مبتلا ہے۔مرد کرداران نسوانی کرداروں سے دلچسپی رکھنے کے باوجود ان کے دکھ درد میں نہ چاہتے ہوئے بھی اضافہ کرتے ہیں۔ ناول نگار نے نسوانی کرداروں کے ذریعے کشمیر میں اس دور کی ہندو اور مسلم عورتوں کے مقام و مرتبے کی صحیح تصویر کشی کی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جانے کتنے استاد ایسے ہیں جو اپنے شاگردوں کی معصومیت کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

ناول ''سمندر پیاسا ہے'' میں غلام رسول سنتوش نے مکالمہ نگاری کے عمدہ نمونے پیش کئے ہیں۔ناول کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں مکالمہ نگاری پر دسترس حاصل ہے۔انہوں نے کرداروں کی زبان سے وہی مکالمے ادا کروائے جو بالکل ان کے شایان شان ہیں۔اس ناول کی مکالمہ نگاری کو سراہتے ہوئے فاروق نازکی لکھتے ہیں:

> ''ناول 'سمندر پیاسا ہے' میں مکالمے نہایت چست ہیں اور بیانیہ میں عام فہم
> انداز اختیار کیا گیا ہے۔جس سے قاری کی دلچسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔'' ۱۲

جیسے کہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ ناول بیانیہ انداز میں ہے۔ جب کوئی فنکار یہ انداز اختیار کرتا ہے تو اس کی ذمہ داریاں اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔ اُسے کرداروں سے ایسے مکالمے ادا

کروانے ہوتے ہیں جن سے قاری ان کی نفسیات یا داخلی زندگی سے واقف ہو جائے۔ غلام رسول سنتوش کسی حد تک یہاں پر کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے کرداروں سے ایسے مکالمے ادا کروائے ہیں کہ قاری ان کی داخلی وخارجی زندگی دونوں سے واقف ہو جاتا ہے۔

منظر نگاری کے اعتبار سے جب ہم ناول 'سمندر پیاسا ہے' کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ غلام رسول سنتوش نے منظر نگاری کے بہترین نمونے پیش کئے ہیں۔ انہوں نے ایسے مناظر کی تصویر کشی کی ہے جو واقعے سے کافی حد تک مماثلت رکھتے ہیں۔ انہوں نے قدرتی مناظر کی پیش کشی میں بھی کمال دکھایا ہے۔

ناول کی ابتداء سینی ٹوریم سے ہوئی ہے۔ جہاں تپِ دق کے کئی مریض زیر علاج ہیں۔ غلام رسول سنتوش نے سینی ٹوریم کی تصویر کشی اس انداز سے کی ہے کہ سینی ٹوریم ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے:

> ''پستی میں جھیل جاگ رہی تھی۔ بلندی پر سینی ٹوریم سو رہا تھا۔ جہاں مدقوق سانسیں رکی ہوئی تھیں۔ آنکھیں کمرے کی چار دیواری سے ٹکرا ٹکرا کر تھک چکی تھیں۔ سوچیں منجمد۔ سینی ٹوریم کے نشیب وفراز میں قبرستان کی سی خاموشی اور موت کا سناٹا تھا۔'' ۱۳

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ غلام رسول سنتوش کا ناول ''سمندر پیاسا ہے'' فنی اعتبار سے کشمیر میں لکھے گئے ناولوں میں اہمیت کا حامل ہے۔

جان محمد آزاد

جموں وکشمیر کی ناول نگاری کی تاریخ میں جان محمد آزاد کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کی

پیدائش ۴ فروری ۱۹۴۸ء کو سری نگر کے پائین علاقے میں ایک خوش حال گھرانے میں ہوئی۔ جان محمد کے والد کا نام محمد سلطان تھا۔ وہ پیشے سے ایک اچھے اور کامیاب تاجر تھے اور اخبار بینی کا شوق رگ رگ میں بھرا تھا۔ ان کی والدہ نرم دل و نرم گفتار اور نیک سیرت خاتون تھیں۔ وہ میڈل پاس تھیں۔ علمی ذوق ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ جان محمد کے مطابق ان کی والدہ کلاسیکی ادب جیسے گلستان بوستان، مثنوی مولانا روم اور دوسری چیزیں انہماک سے پڑھا کرتی تھیں۔

جان محمد آزاد بچپن ہی سے ایک ذہین طالب علم تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول سری نگر سے حاصل کی۔ بارہویں جماعت کا امتحان انہوں نے امتیازی نمبرات سے پاس کیا اور سائنس کے مضامین میں بی۔ ایس۔ سی کی ڈگری حاصل کی۔ چونکہ جان محمد آزاد کے والد نے اپنے کاروبار کے سلسلے میں کشمیر کے کئی علاقوں اور دیہاتوں کا سفر کیا۔ اس دوران جان محمد آزاد بھی کئی بار ان کے ساتھ رہے اور یوں جان محمد آزاد کو قدرت کے ازلی حسن اور فطرت کی رنگا رنگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

جان محمد آزاد نے اپنے ادبی سفر کی شروعات افسانہ ''جمی'' لکھ کر کی جو کالج میگزین ''بادام واری'' میں شائع ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے کئی ایک افسانے لکھے۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ ''آشیاں سے آسماں تک'' چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ اس مجموعے میں شامل کہانیاں اس دور میں تخلیق کی گئی ہیں جب قدرت نے غم و آلام اور آزمائش کی سوغاتیں ان کی جھولی میں ڈال دیں۔ انھوں زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بڑی ہنر مندی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔

ان کے ادبی سفر کا آغاز اگرچہ افسانہ نگاری سے ہوا لیکن ناول نگاری ان کا خاص میدان رہا ہے۔ انھوں نے اردو ادب کو کئی بہتریں ناول دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے شاعری میں بھی

طبع آزمائی کی ہے۔ان کا شعری مجموعہ ''الوداع موسمی پنچھی'' چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ادبی حلقوں میں اس کی خاصی پذیرآئی ہوئی ہے۔ان کے اشعار پڑھ کران کی تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ زبان صاف ستھری زبان اور جملوں کی ساخت خوبصورت اور متاثر کن ہے۔مضامین اور طرزِ اسلوب عمدہ اور الفاظ کی ترتیب وتنظیم نہایت دلکش ہے۔

ریاست جموں وکشمیر کے ناول نگاروں میں جان محمد آزاد کا نام کافی اہمت کا حامل ہے۔جیسا کہ پہلے ہی بیان کیا جاچکا ہے کہ انہوں نے ریاست کے مختلف لوگوں کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے ناولوں میں زندگی کی تلخ حقیقتوں اور نشیب وفراز،غریبی و مفلسی اور یہاں کے عوام پر ہورہے ظلم و جبر اور ان کی لاچاری ومجبوری وغیرہ کو موضوع بنا کر فنی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کے ناول جہاں موضوعاتی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں وہیں فن اور تکنیک کے لحاظ سے بھی خاصے کامیاب ہیں۔

جان محمد آزاد کا پہلا ناول ''**وادیاں بھلا رہی ہیں**'' ہے۔یہ ناول ۱۹۸۰ء میں پہلی بار شائع ہوا۔اس کے بعد انہوں نے اپنے ادبی سفر کو بڑی محنت اور لگن سے جاری رکھا اور کئی ناول لکھے۔ ان کا دوسرا ناول 'کشمیر جاگ اٹھا' جو ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔'ظلمات کے مسافر' ان کا تیسرا ناول ہے اور یہ ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔یہ ناول انہوں نے انگریزی سے ترجمہ کیا ہے۔ان کا چوتھا ناول 'برفیلے لمحوں کا جنگل' ہے اور یہ ۱۹۹۵ء میں پہلی بار شائع ہوا۔

۱۲۸ صفحات پر مشتمل یہ ناول تین حصوں پر مشتمل ہے جس میں پہلا حصہ لالہ صحرائی، دوسرا برف باری کی رات، تیسرا حصہ بہار کی دستک کے عنوان سے ہے۔پہلے حصے میں چار ابواب، دوسرے حصے میں تین ابواب اور آخری حصے میں دو ابواب ہیں۔اس طرح یہ ناول نو ابواب پر مشتمل ہے۔ناول کا

پیش لفظ ریاست جموں وکشمیر کے جانے مانے ادیب اور ناول نگار حامدی کاشمیری نے لکھا ہے۔

''وادیاں بلا رہی ہیں'' وادی کشمیر کے مشہور و معروف روز نامہ 'آفتاب' میں قسط وار شائع ہوا کرتا تھا۔ ناول میں جان محمد آزاد نے کرشن چندر کے زیرِ اثر کشمیر کے ایک پہاڑی علاقے 'کاغان' کو موضوع بنا کر یہاں کے لوگوں کی شکست و ریخت کو بیان کیا ہے۔ اس ناول میں سماج کے مختلف طبقوں کے درمیان تصادم، کوہستانی علاقہ کے لوگوں کی سادگی، خلوص، خوابوں اور آرزؤں کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے۔ ناول نگار نے کشمیر کے خوبصورت مناظر کے ساتھ ساتھ کشمیر کے دور دراز اور بچھڑے ہوئے لوگوں کی زندگی کے مسائل کو دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ ظلم اور استحصال کے اس دور میں شہر کے ٹھیکہ دار کس طرح سادہ اور ان پڑھ لوگوں کا استعمال کرتے ہیں۔ اس ناول میں اس مسئلے کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ ناول کے دیباچے میں حامدی کاشمیری اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جان محمد آزاد نے کرشن چندر کے زیرِ اثر کشمیر کے کوہستانی علاقے 'کاغان' کے پس منظر میں سماجی زندگی کے تضاد اور شکست و محرومی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ یوں تو آپ کا موضوع کوئی جدت نہیں رکھتا......طبقاتی نظام کی چیرہ دستیوں کا بیان اور معصوم اور سادہ لوگوں کے خوابوں، حسرتوں اور آرزؤں کی کہانی......شہناز کی یتیمی اور بے کسی، اس کی کافر جوانی، جوانی کے شیرین خواب، اس کے شباب پر پڑتی ہوئی ہوس کا رنگا ہیں اور نجم الثاقب کے روپ میں اس کے خوابوں کی تکمیل، ایک سیدھی سی عام سی معصوم کہانی ہے۔ لیکن مصنف نے اس کہانی کو پہاڑوں، جنگلوں اور وادیوں کے بدلتے ہوئے موسموں کے متنوع رنگوں، سایوں اور روشنیوں میں تحلیل کر کے اس کی شعری تعبیر کی ہے اور یہی اسے جاذب النظر بناتا ہے۔'' [۱۴]

جان محمد آزاد نے اس ناول میں کاغان کے لوگوں کے نفسیاتی رجحان کے ساتھ ساتھ ان کے سماجی اور مادی حالات کو بھی پیش کیا ہے۔ یہاں کے لوگ تعلیم کے نور سے آراستہ نہیں تھے اس لئے دوسرے علاقوں کے لوگ انہیں جاہل اور گنوار سمجھتے تھے اور حکومت نے بھی اس علاقے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر یہ علاقہ پسماندہ رہا ہے اور یہاں کی ایک خوبصورت لڑکی سارہ کو بیگ خاندان کے لوگ اپنی بہو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور یوں وہ کاغان پہنچ کر غربت کی زندگی گزارنے پر مجبور کی جاتی ہے۔ سارہ کے سسرال والوں کے مطابق کاغان کی غلیظ بستی سے آئی ہوئی کوئی گنوار لڑکی بیگ خاندان کی بہو نہیں بن سکتی۔ اس طرح سے ناول نگار نے سماج میں پنپ رہی انھیں رسومات کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس زمانے سے آج تک جاری وساری ہیں۔

جان محمد آزاد نے اس ناول میں زندگی کے بعض تلخ حقائق کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ جمیلہ اور شاہ عالم جب کئی سال بعد اس راز سے آشنا ہو جاتے ہیں کہ ان کے یہاں اولاد پیدا ہونے والی ہے تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا لیکن یہی خوشی اس وقت مایوسی میں تبدیل ہو جاتی ہے جب شاہ عالم زمین گروی رکھ کر سکندر شاہ سے قرض لیتا ہے اور اس طرح اس کے مزاج میں کڑواہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔

جان محمد آزاد نے ڈوگرہ راج میں طبقاتی کشمکش کو بڑی خوبصورتی سے اس ناول میں پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی کشمیر کے خوبصورت مناظر کی قلمی تصویریں بھی بہترین انداز میں کھینچی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس خوبصورت وادی میں جو ظلم و بربریت کا دور چل رہا ہے اسے بھی نمایاں کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ شہناز کو اگرچہ بیگ منزل میں تمام سہولیات میسر تھیں لیکن کاغان کی پسماندہ وادی کے لوگوں کی تصویر ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے رہتی ہے۔ یہ لوگ رات دن ایک کر کے خواجہ

سکندر شاہ کا قرض ادا کرتے تھے لیکن مرنے کے بعد بھی ان کے بچوں کو معلوم ہوتا ہے کہ اصل ابھی باقی ہے۔شہناز ان لوگوں کی حالت بدلنے کی کوشاں رہتی ہے اور آخر نجم الثاقب کی مدد سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی ہے اور اس طرح جان محمد آزاد نے ناول کا خاتمہ ظلم کی شکست اور حق کی فتح پر کرتے ہیں۔

ناول میں جان محمد آزاد نے ساہوکاروں کے ظلم اور استحصال کا نقشہ جن الفاظ میں کھینچا ہے اس سے ان کی شخصیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔آزاد کے مطابق یہ ساہوکار مقروض کو چارہ کھلا کر زندہ رکھتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ ان کی غذا کم کر دیتے ہیں۔اس طرح یہ مظلوم قوم اپنی زمین اور جائیداد چند سکھوں کے عوض گنوا بیٹھتے ہیں۔جمیلہ کے یہاں جب ایک بیٹا جنم لیتا ہے تو شاہ عالم مہمانوں کی خاطر تواضع کے لئے سکندر شاہ سے دو برسوں کے فصل کے عوض رقم ادھار لیتا ہے۔جب یہ غریب لوگ دو وقت کی روٹی کے لئے تڑپتے رہتے ہیں وہیں ساہوکار خواجہ سکندر شاہ ان کو لوٹ کر اپنی تجوریاں بھرتا ہے۔اس طرح وہ ان لوگوں پر ظلم و جبر کی انتہا کرتا ہے۔لیکن آخر کار اپنے گناہوں تلے دب کر اس کی موت واقع ہوتی ہے۔

اس ناول کے پلاٹ میں کوئی خاص کشش اور ربط نہیں۔ناول میں کئی کردار غیر اہم ہیں۔ناول ''وادیاں بلا رہی ہیں'' جان محمد آزاد کا پہلا ناول ہونے کی وجہ سے فنی اعتبار اس میں چند خامیاں در آئی ہیں۔کیوں کہ تخلیق کار کی پہلی تخلیق میں کچھ نہ کچھ خامیاں رہ جاتی ہیں۔یہی حال جان محمد آزاد کا ہے۔ان کے یہاں بھی اس ناول میں یہ خامیاں دکھائی دیتی ہے۔

''کشمیر جاگ اٹھا'' جان محمد آزاد کا دوسرا ناول ہے۔اس ناول میں بھی جان محمد آزاد نے اپنے پہلے ناول کی طرح کشمیر کے ایک دور افتادہ علاقہ کو موضوع بنایا ہے۔اس ناول میں مطلق

العنانیت کے تاریک ترین دور میں استحصال اور جبریت کے ہاتھوں مظلوموں اور بے زبان انسانوں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔

یہ ناول اردو مرکز سری نگر سے ۱۹۸۴ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ ۱۳۱ صفحات پر مشتمل اس ناول کا انتساب ناول نگار کے الفاظ میں 'کشمیر کے نوا ہائے جگر سوز کے ساز کو چھڑنے والے مسیحا کے نام' ہے۔ ناول کے آغاز میں اس وقت کے وزیر اعلی ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے 'پیغام' کے عنوان سے اپنے تاثرات پیش کئے ہیں۔ انہوں نے ناول کی ادبی قدر و قیمت متعین کرنے سے گریز کرتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ ناول ہماری سیاسی، سماجی اور تہذیبی تسلسل اور جد و جہد کی داستان ہے۔ ناول کا پیش لفظ ڈاکٹر برج پریمی نے اور تعارف پروفیسر محمد زماں آزردہ نے لکھا ہے۔ حرف اول کی عنوان سے حامدی کاشمیری کی تحریر ملتی ہے جس میں انہوں نے اس ناول کے حوالے سے اپنے تاثرات پیش کئے ہیں۔

ناول کے پلاٹ اور کہانی میں کوئی پیچیدگی نظر نہیں آتی لیکن موضوع متاثر کن ضرور ہے۔ کشمیر کے ایک دور افتادہ گاؤں میں ایک معمولی خاندان کو موضوع بنا کر ناول نگار نے ڈوگرہ دور کی درد بھری زندگی کی عکاسی ہے۔ دلاور لون گھر کے حالات اور ڈوگرہ حکمرانوں کے ظلم و جبر سے تنگ آ کر گھر بار چھوڑ دیتا ہے اور شہر کا رخ کرتا ہے۔ اس کی بیوی ماہتاب پر گھر کی ساری ذمہ داری آن پڑتی ہے۔ وہ دن بھر کھیتوں میں کام کرتی ہے لیکن فصل کی کٹائی پر اس کی محنت اور کمائی پر مہاراجہ اور اس کے کارندے ہاتھ صاف کر دیتے ہیں اور اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہتا تھا۔ ماہتاب کے گھریلو حالات اور شکستہ صورتحال کی تصویر کشی کرتے ہوئے جان محمد آزاد لکھتے ہیں:

''ماہتاب آج ساری صبح دور فضاؤں میں تکتی رہی۔ اس کا ذہن مردہ خیالات

کے بوجھ میں دب گیا تھا۔ .....اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہو۔ کیونکہ آج اس کے خون پسینے سے حاصل کئے گئے اناج کا بٹوارہ ہوگا۔ .....گاؤں کے مقدم کے جھونپڑے میں جہاں حشمت خان ٹھہرا ہوا تھا، بال تل کے لوگ ایک ایک کر کے جمع ہو رہے تھے۔ جاگیردار کے کارندے کو سلام کہنے۔ وہ اس کے سامنے سربسجود تھے۔ ماہتاب نے سینے میں اٹھتی ہوئی آہ کا گلا گھونٹنا چاہا لیکن یہ خیال اس کے لئے سوہانِ روح بنا ہوا تھا کہ ابھی ابھی پیداوار کا بٹوارہ ہوگا اور اس کے کھلیانوں کی اناج تقسیم کر دی جائے گی جس کو اگانے میں اس نے بے پناہ عرق ریزی کی، جس کو اپنے خونِ جگر سے سینچا۔ جس پر اس نے ہل چلانے پڑے۔ بیج نونے پڑے۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اس کے ثمرہ میں کیا دیر لگتی ہے۔ ایک حصہ مہاراجہ بہادر کا، ایک حصہ زمیندار پنڈت نارائن جو کا اور ایک حصہ زمیندار کے کارندے حشمت خان کا۔ اتنی محنت کے بعد محنت کا مینار بتدریج نیچے نظر آتا رہتا ہے۔ محنت بے کار نظر آتی ہے۔'' ۱۵

دلاور لون کے گھر سے بھاگ جانے کے بعد گاؤں کے نمبردار کے کارندے حشمت خان کی نظریں جب پہلی بار ماہتاب کو دیکھتی ہیں تو حوس کا بھوت اس کے سر پر سوار ہو جاتا ہے اور وہ ماہتاب کی مجبوری اور بے کسی کا بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے۔ دلاور لون شہرِ سری نگر میں تلاشِ معاش کے سلسلے میں تو گئے تھے لیکن یہاں کی حالت دیکھ کر اسے اور بھی مایوسی ہوتی ہے کیونکہ ڈوگرہ مہاراجوں کے دور میں سری نگر کی حالت بھی انتہائی غیر تھی۔ ناول سے ایک اقتباس دیکھئے جہاں دلاور لون کے ساتھ جو سلوک ہو رہا تھا وہ اس ڈوگرہ دورِ حکومت کی حقیقی تصویر کو پیش کرتے ہیں:

''دلاور کو سنتری کے اس ذلت آمیز سلوک سے افسوس نہیں ہوا تھا۔ رنگ اور شیش محل میں رہنے والے راجکمار بھلا اور کیا دے سکتے ہیں۔ یہاں تو چاروں طرف بھوک ہی بھوک منڈلا رہی تھی۔ لوگ چاول کے ایک ایک نوالے کے لئے تڑپ

تڑپ کر جان دے رہے تھے۔ زندگی طویل اور سنسان راتوں کی طرح بھیانک
اور بے کیف تھی۔ شہر کے ساتھ اس نے کیسی الف لیلوی باتیں منسوب کی تھیں
لیکن یہاں تو بھوک گندگی اور غلاضت کی حکمرانی تھی۔'' ۱۶

ماہتاب اس وقت کافی پریشان ہوجاتی ہے جب اسے پتہ چلتا کے کہ وہ حشمت کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ لیکن یہاں پر اس کی ایک سہیلی گلابی اس کے لئے کچھ جڑی بوٹیوں کا انتظام کرتی ہے اور بچہ پیدا ہونے سے پہلے ہی مر جاتا ہے۔ ایک طرف یہاں ماہتاب کسی قدر مطمئن تھی کہ مصیبت اور بدنامی سے چھٹکارا ملا لیکن دوسری طرف وہ اپنے آپ کو قاتل تصور کرتی ہے۔ یہاں پر ناول نگار نے اس کے جذبات کی بہترین تصویر کشی کی ہے۔ مثال دیکھئے:

''نہ جانے کیسے کیسے خیال سر ابھارتے ہیں۔ کبھی خیال آتا ہے کہ میں نے ایک
گناہ کو چھپانے کے لئے دوسرے بڑے گناہ کا ارتکاب کر ڈالا۔ جرم کا آخری
نشان مٹا کر بدنامی، خوف اور خدشوں کے اندھیرے تو چھٹ گئے اور اطمینان کی
روشنی ہر طرف پھیل گئی لیکن نہ جانے کیسا اندھیرا ہے۔ گلابی۔ جو میرے دل و
دماغ پر چھایا جا رہا ہے۔ کیا یہ میرا جذباتی انتشار ہے۔ آہ۔ میرا بچہ۔ میرے
اپنے گوشت اور خون کی تخلیق۔ نرم نرم گوشت کا ایک ننھا منا وجود۔ وہ ابھی کل
تک میری کوکھ میں سمایا ہوا تھا اور آج میرے ہاتھ بھی خالی ہیں اور گود بھی۔'' ۱۷

وقت گذرتا جاتا ہے اور دلاور لون واپس نہیں لوٹتا۔ ماہتاب اب بوڑھی ہو چکی ہے۔ ان کا لڑکا نادر اب کھیتوں میں کام کرتا ہے۔ لیکن اس کے چھوٹے بھائی گل ریز سے اس کی نہیں بنتی تھی جس کی وجہ سے گھر میں نفرت انگیز ماحول رہا کرتا۔ ماہتاب اب نادر کی شادی خورشی سے کرانے کے بعد اپنی اندھی بیٹی پمپوش کو ایک بوڑھے سے بیاہ کراتی ہے جس کی وجہ سے پمپوش کی امنگیں ہمیشہ کے لئے مر جاتی ہے۔ ماہتاب کا چھوٹا لڑکا گل ریز گھر سے بھاگ کر شہر کا رخ کرتا ہے اور وہ کشمیر کی آزادی کے

لئے باغی بن جاتا ہے۔ واپس آنے پر وہ انقلاب اور استحصال کی باتیں کرتا ہے جسے یہاں کے لوگ نہیں سمجھ پاتے۔ یہاں اپنے گاؤں بال تل میں وہ لوگوں سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

''بھائیو، ہم کشمیر کے مظلوم کسان، محنت کش، صدیوں کی غلامی، استحصال، لوٹ کھسوٹ اور ظلم تشدد سے تباہ و بے حال ہیں۔ ہم اپنے ہل کی نوک پر زمین کی چھاتی کریدتے ہیں۔ اپنے تھکے تھکے پاؤں سے اسے ہموار کرتے ہیں، سنوارتے سجاتے ہیں، امنگ سے جھوم کر بیج بوتے ہیں۔ پودے اگتے ہیں۔ سورج تپتا ہے۔ لہلہاتے کھیت سنہرے ہو جاتے ہیں۔ امید اور خوشی میں مستغرق کسان فصل کاٹنے لگ جاتے ہیں۔ زمین ہماری محنت سے سرور ہو کر سونا اگل دیتی ہے اور ہم رنگین خوابوں میں ڈوب جاتے ہیں۔..... لیکن ہمارے یہ خواب جاگیر دار زمیندار اور ان کے حواریوں کے بھینٹ چڑھتے ہیں۔ ہمارے یہ خواب ادھورے رہ جاتے ہیں۔ ہم ایک بار پھر ننگے اور بھوکے رہتے ہیں۔......
ہم جاگیر دار شاہی کے سامنے سر بسجود ہو جاتے ہیں۔ ہمیں مغلوں، پٹھانوں اور سکھ مہاراجوں نے سالہا سال تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا۔'' ۱۸

ناول کا اختتام کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ الحاق پر ہو جاتا ہے۔ ناول نگار نے اگر چہ اسے نئی صبح کہا ہے لیکن کشمیر کے لئے یہ نئی صبح ثابت نہیں ہوئی۔ الحاق اس وعدے پہ کیا گیا تھا کہ حالات میں بہتری کے ساتھ ہی یہاں رائے شماری کرائے جائے گی اور پھر لوگوں کی مرضی سے کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کیا جائے گا کہ آیا وہ ہندوستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان یا پھر آزاد۔ ہندوستان کے پہلے وزیرِ اعظم نے کشمیر کے لوگوں اور یہاں کے محبوب رہنما شیخ محمد عبداللہ سے لال چوک میں اقرار کیا تھا کہ کشمیریوں کو رائے شماری کا موقع دیا جائے گا۔ لیکن پھر ہندوستان کی قیادت اس وعدے سے مکر گئی اور کشمیری ابھی تک اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ یہاں رائے شماری کرائی جائے۔

ڈاکٹر برج پریمینے اس ناول پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے جن خیالات کو پیش کیا ہے اس سے اس ناول کے موضوع کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''کشمیر......صدیوں کی غلامی سے جھلسی ہوئی سرزمین، جس کی بے بسی بانہوں میں مغل عہد سے لے کر ڈوگرہ عہد تک برابر پامال اور غلام در غلام لوگ اونگھتے رہے ہیں ہمیشہ نظر انداز ہوئی ہے۔ بیشتر رومان پرست فنکاروں نے یہاں کو خواب آلود فضاؤں، برفیلے پربتوں، نیلی جھیلوں کی گیرائیوں اور حسین گھاٹیوں سے اپنے فن کی قوس وقزح سجائی۔ انہوں نے افلاس کے مارے پپوٹوں پر تھرکتے ہوئے خواب دیکھے، نہ دھڑکتے ہوئے دلوں کی آہٹیں سنیں اور نہ ہی اس آتش فشاں کی حدت کو محسوس کیا جو ان کے بے حس وجود میں کھول رہا تھا۔ پردیسی اور ان کے بعد یہاں کے بعض فنکاروں نے اس طرف پہلی بار توجہ کی۔ جان محمد آزاد کے ناول 'کشمیر جاگ اٹھا' کا موضوع اس اعتبار سے اہم ہے کہ انہوں نے نہ صرف یہاں کے دلآویز حسن کی حشر سامانی کی تصویر کھینچی ہے بلکہ اس سیاسی، سماجی اور معاشی آشوب کو بھی پیش کیا ہے جس نے افلاس، ناداری اور بے کسی کی لکیروں سے ان کی تقدیر کو سیاہ کر دیا تھا۔ آزاد نے شہروں اور قصبوں سے دور 'تھا جواس' کے حسین دھندلکوں کے دامن میں پھیلے ہوئے بال و تل اور اس کے گردونواح کو پیش کیا ہے اور یہاں کی معصوم اور بے ریا زندگی کے پاکیزہ دامن پر ڈوگرہ شاہی کے جاگیردارانہ نظام کے خونین رقص کو اپنے خونِ جگر کے رنگ سے پینٹ کیا ہے۔ آزاد نے شہر کے ہنگاموں سے دور اس بستی کا وہ پہلو دکھایا ہے جو نظروں سے اوجھل ہے۔ انہوں نے اپنے قلم کی نوک سے ان آنسوؤں کو موتیوں کی طرح چن لیا ہے جس میں صدیوں کا ملال چھپا ہوا ہے لیکن آزاد کا قلم صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا وہ اس بدلتے ہوئے شعور کو بھی پیش کرتا ہے جس نے کشمیر کی تقدیر بدل دی۔'' [19]

جان محمد آزاد کا یہ ناول وادی کے ادبی حلقوں میں موضوع بحث رہا اوراس کے کئی ایک ایڈیشن چھاپنے پڑے۔اس ناول میں مصنف نے کشمیر کے پہاڑوں، سرمئی جنگلوں،سرسبز وادیوں اور رواں آبشاروں کے پسِ منظر میں انسانیت کے ان دکھوں اور محرومیوں کی عکاسی کی ہے جو صدیوں تک ان کا مقدر بنی رہی۔

ناول 'کشمیر جاگ اٹھا' میں جان محمد آزاد نے مظلومیت اور محرومیت کے شکار اور ڈوگرہ راج کے جاگیردارانہ نظام میں سسکتی ہوئی کشمیری قوم کی کہانی کو موضوع بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ڈوگرہ راج کے کشمیری عوام پر ظلم و جبر کو اس ناول میں بڑی ہی خوبصورتی لیکن درد بھرے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مہتاب کو اس ناول کا مرکزی کردار بنا کر جان محمد آزاد نے اس کے عزائم کے ساتھ ساتھ اس دور کے خونین مناظر کو پیش کیا ہے جب مظلومیت اس قوم کا مقدر بن چکی تھی۔محمد زماں آزردہ نے اس ناول پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا:

> ''جان محمد آزاد نے نصف صدی قبل کشمیر کے ان مظلوم لوگوں کی کہانی اس ناول میں پیش کی ہے جو جاگیردارانہ نظام کی وجہ سے صحیح زندگی سے یکسر محروم تھے۔ ڈوگرہ شاہی کے جبر واستبداد کے نقوش اس ناول میں بڑی محنت سے پیش کئے گئے ہیں۔ ماہتاب اس مظلومیت ، گھٹن اور محرومیت کی پیکر ہے۔ یہ محرومیت زندگی کے ہر دور میں اس کا پیچھا کرتی ہے۔ جیسے یہ کوئی دیوتا کی بددعا ہے۔مگر اس بددعا کا توڑ اس محرومیت کا خاتمہ ماہتاب کی امیدوں میں ہے۔ان امیدو ں کی تعبیر گل ریز ہے۔ جو تحریکِ آزادی کے مجاہد کے رول ادا کر کے یہاں کی محرومیت کے اندر امید کی روح پھونک دیتا ہے۔'' [۲۰]

جان محمد آزاد کشمیر کے ان ادیبوں میں سے ہے جن کی پہلی محبت وطن ہے۔ وطن سے محبت کا

احساس ان کی ہر تحریر میں ملتا ہے۔اس ناول میں ان کا کشمیر کے تئیں محبت کا جنون دکھائی دیتا ہے۔ کشمیر کے حوالے سے اب تک جتنے بھی ناول لکھے گئے ہیں ان میں کشمیر کے مسائل کے بجائے ہر طرف اور ہر وقت خوبصورتی کو موضوع بنایا گیا ہے۔لیکن جان محمد آزاد نے ان مناظر اور کرداروں کے قرب کو قریب سے دیکھا وراس طرح ان کی اندرونی کیفیت اوران کی مظلومیت کو پیش کر کے ان کے حقیقی مسائل کی قلمی تصویریں پیش کی ہیں۔

جان محمد آزاد کے اس ناول میں مختلف حقیقتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔انسان جو بنیادی طور پر آزاد معلوم ہوتا ہے اسے غلامی کا طوق پہنایا جاتا ہے۔عورت جو قدرت کا حسین شاہکار ہے ہر جگہ مظلوم، بےکس اور بےبس کیوں ہے؟ کیا اس کی مجبوری ومظلومی ازلی وابدی ہے؟ یا فطری خواہشوں، بنیادی ضرورتوں اوراس کے ماحول کا نتیجہ ہے؟ وادیٔ کشمیر سے متعلق اس ناول میں جو پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں ان میں قدرت کی فیاضی، مناظر کی دلکشی،ظلم واستحصال کی انتہا اوروہ انسانی حسن ہے جس کی بنیاد خود بخود اس ناول کو شاعرانہ اسلوب عطا کرتی ہے۔اس ناول میں پہاڑی علاقے کے سادہ لوح، ان پڑھ،غریب مزدور اور کسان ہیں جن کی دوستی اور دشمنی کی طرح محبت بھی ایسی طوفانی اور جذباتی ہوتی ہے کہ ان کے رشتے داستانوں کے مثالی کرداروں سے جا ملتے ہیں۔تیسری حقیقت وہ طبقہ اعلی ہے جو تعداد میں کم تر اور طاقت میں اس حد تک برتر ہے کہ غریب لوگ ان کو اپنا خدا مانتے ہیں۔جن کی محنت سے عاری جسم، لذت کوشیوں کی آماجگاہ بنتے ہیں۔ یہاں تخریبی قوتیں، قبائلی معاشرہ، زرعی معیشت پر کلی انحصار، متبادل معاشی رشتوں کا فقدان اور جاگیردارانہ نظام ہے جن کے غلبے نے اس حسین وادی کو ایسے بازار میں تبدیل کیا ہے جہاں ہر شئے اپنے اظہار کے جرم میں تاوان ادا کرتی ہے۔ چونکہ جان محمد آزاد کی پہلی محبت وطن ہے اس لئے وہ ماضی کی ان تلخ یادوں کو بھول نہیں

پاتے اوران ہی تلخ حقیقتوں کوالفاظ کا جامہ پہنا کرفنی تقاضوں کے ساتھ اس ناول میں پیش کر دیتے ہیں۔اس ناول کے دیباچے میں وہ خودرقم طراز ہیں:

> ''کشمیر جاگ اٹھا تاریخ کے صفحات پر بہتے ہوئے خون کی لالی ہے۔ مجھ سے اکثر دوستوں نے پوچھا کہ ہمیں اس بات کے لئے مجبور کیا جارہا ہے کہ جو کچھ گزر چکا ہے اس کو اپنی آنکھوں کے سامنے پھر سے زندہ ہوتے دیکھیں۔ جسے پہلے بھگت چکے ہیں اسے پھر سے بھگتیں۔ان زخموں کو پھر سے کیوں ہرا کریں جو اب مندمل ہو چکے ہیں۔ میں ان سے بھلا کیا کہتا......؟ مجھے معلوم ہے کہ بہت سے لوگوں کے آنسواب تک خشک نہیں ہوئے ہیں کیونکہ میں ماضی کے لئے نہیں بلکہ مستقبل کے لئے روتا ہوں۔'' ۲۱

ناول اپنے موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے کامیاب نظر آتا ہے۔ واقعات میں کوئی الجھاؤ نہیں ہے۔کہانی احسن طریقے سے آگے بڑھتی ہے اور تجسس کا عنصر برقرار رہتا ہے۔کردارنگاری بھی فنی تقاضوں کے مطابق نظر آتی ہے۔کئی اہم اور غیر اہم کرداراس ناول میں نظر آتے ہیں لیکن ماہتاب اس ناول کا مرکزی کردار ہے جو بقولِ ڈاکٹر برج پریمی کے مظلومیت، ایثار، صبر، قناعت اور اولوالعزمی کی علامت ہے۔ جو ہر دکھ، ہر درد اور ہر ظلم کا مقابلہ بڑی بہادری سے کرتی ہے۔اس کے وجود کا ایک ایک ریزہ جاگیرشاہی میں پسے ہوئے بےحس معاشرے کی چیرہ دستیوں کی داستان ہے۔

گل ریز اس ناول کا اہم کردار ہے جو نئی نسل کی نمائندگی کرتا ہے۔ناول کے دوسرے کرداروں میں دلاورلون، حشمت خان، خورشی، مام دین، گلابو، قادرلون بھی اپنی اپنی اہمیت لئے ہوئے ہیں اور آزاد نے ان کرداروں سے اس معاشرت کی کہانی رقم کی ہے جو کئی صدیوں سے ظلم و جبر کی چکی میں پستی ہی جارہی ہے۔ڈاکٹر حامدی کاشمیری ناول کی کردارنگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''کشمیر جاگ اٹھا' میں جان محمد آزاد نے کشمیر کے ایک دورافتادہ اورخوابیدہ جنگلی علاقے میں مطلق العنانیت کے تاریک ترین دور میں استحصال اور جبریت کے ہاتھوں مظلوم اور بے زبان انسان کی کہانی بیان کی ہے۔ ماہتاب اس کا خاوند دلاورلون، گھوڑ سوار کارندہ حشمت، ساس، نادر اور گل ریز سب اسی جبر وتشدد کے دور کے نمائندے ہیں۔انہوں نے ماہتاب کے کردار کی گہرائی میں ممتا کی عظمتوں کو ابھارا ہے۔بعض کردار نیم روشن سایوں کی طرح ابھرتے ہیں۔لیکن پورے ناول میں فطرت کا کردار بھی ایک زندہ تغیر آشنا اور ہم زاد و ہمدم کردار کی طرح خاموشی سے اپنا رول ادا کرتا ہے۔'' ۲۲

غرض جان محمد آزاد نے اس ناول میں غریب طبقہ کی مظلومی اور دکھ وتکلیف کو پیش کرتے ہوئے ان کے مستقبل کے لئے فکر مند نظر آتے ہیں۔کردار نگاری، مکالمہ نگاری، منظر نگاری کے علاوہ اسلوب کی دلکشی اور زبان و بیان پر ناول نگار کی قدرت سے اندازہ ہوتا ہے یہ ایک عمدہ اور کامیاب ناول ہے۔

''برفیلے لمحوں کا جنگل'' جان محمد آزاد کا تیسرا ناول ہے۔ یہ ناول ۱۹۹۵ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ناول کا انتساب ناول نگار نے اپنے بچوں کے نام کیا ہے۔ یہ ناول ریاست جموں وکشمیر کی ناول نگاری میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ یہ ایک جاسوسی ناول ہے جس کا مرکزی کردار صنوبر ہے۔اس ناول میں فنی چابکدستی، احساس کی گہرائی اور زبان و بیان پر دسترس کے اعلی نمونے ملتے ہیں۔

''برفیلے لمحوں کا جنگل'' ایک جاسوسی ناول ہے۔ ناول کا موضوع ان کے پہلے دو ناولوں سے ہٹ کر ہے۔اس ناول میں ایک بین الاقوامی زیرِ زمین گینگ کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے۔اس گینگ کی

سر پرستی صیہونی خفیہ ایجنسی موساد کرتا ہے۔اس گینگ کا بگ باس کے۔کے ہے جو ہر وقت لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں مہارت رکھتا ہے۔اس گینگ نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز کشمیر کے ایک صحت افزا مقام گلمرگ کو بنایا ہے۔اس جگہ کا انتخاب اس لئے کیا جاتا ہے کہ یہاں دنیا کے مختلف حصوں سے لوگ سیاحت کے لئے آتے ہیں۔غیر قانونی منشیات کی تجارت اس گینگ کا خاص بزنس ہے۔

موساد نے اٹیمی دھماکہ بنانے کے ایک فارمولے کے لئے ایک سینڈیکیٹ کی خدمات حاصل کیں۔اس فارمولہ کے موجد ڈاکٹر ہنری گولڈ اور ڈاکٹر منیب ہیں۔ڈاکٹر ہنری موساد کے ہاتھوں بکنے سے نکار کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے افراد خانہ کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔اس کے بعد ڈاکٹر منیب بھی اس فارمولے کو بچانے کے چکر میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔اب موساد گم شدہ فارمولہ کی تلاش میں گلمرگ میں ہلاکتوں کا سلسلہ شروع کرتی ہے۔اب انٹرپول کی طرف سے راحیل کو کشمیر روانہ کیا جاتا ہے۔

راحیل کشمیر آنے سے قبل صنوبر کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے اور دونوں کی شادی طئے ہو جاتی ہے۔اسی دوران صنوبر کو جینٹ کی طرف سے ایک خط ملتا ہے جس میں وہ صنوبر کے لئے ایک بڑا راز چھوڑ دیتی ہے اور اس راز کو پانے کے لیے انٹرل پول اور بگ باس کافی کوشش کرتے ہیں۔پھر یہاں جب راحیل انٹرل پول کے آفیسر کی حیثیت سے ان سے ملتا ہے تو وہ یہ راز افشا کرتی ہے اور یوں ناول کا اختتام ہوتا ہے۔جاسوسی ناول ہونے کی وجہ سے ناول میں دلچسپی کا عنصر شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے۔

ناول کا مرکزی کردار مقتول ڈاکٹر منیب کی بیٹی صنوبر ہے۔اپنے وطن سے دور رہ کر بھی اس کی

محبت اس کے قلب وجگر میں رچی بسی ہے اور وہ کشمیری طرزِ زندگی کو نہیں بھولتی۔ وہ بناوٹی دنیا میں گھٹن اور الجھن محسوس کرتی ہے۔ مغرب میں پرورش پانے کے باوجود اس نے اپنے آپ کو وہاں کی برائیوں سے دور رکھا تھا۔ وہ شراب، جوا، ڈانس وغیرہ میں حصہ نہیں لیتی تھی اس لئے ہاسٹل کے لڑکے اور لڑکیاں اسے 'ہیولی سنو' کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ بڑی بہادری سے راحیل سے مل کر اس گینگ کا پردہ فاش کرتی ہے جس نے یہاں قتل وغارت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ وہ کشمیر کی ان لڑکیوں کی نمائندگی کرتی ہے جو کشمیر سے باہر رہ کر اپنی روایات اور اپنے وطن کو بھولتی نہیں۔ اس کردار کو تراشنے میں ناول نگار نے بڑی مہارت سے کام لیا ہے۔

صنوبر کے علاوہ راحیل کا کردار بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ کہانی میں صنوبر اور راحیل کا کردار ناول کو فطری انجام کی طرف لے جاتا ہے۔ راحیل اصل انٹر پول میں ایک آفیسر ہے لیکن صحافتی سرگرمیوں میں اس لئے دلچسپی رکھتا ہے تاکہ عوام میں اعتبار قائم رہے۔ اس کے علاوہ کے۔ کے بھی ناول کا کافی اہم کردار ہے۔ وہ ایک عام شہری کے روپ میں ایک بڑے گینگ کی سربراہی کرتا ہے۔ اس کا مقصد منشیات اور دوسرے کالے دھندوں کو فروغ دینا ہے۔ زندگی میں اتنے جرائم کا مرتکب ہو چکا ہے کہ اس کی فہرست نہیں گنوائی جاسکتی ہے۔ مصنف نے اس کردار کو بھی بڑی چابکدستی سے تراشا ہے۔ یہ ایسے لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جو عوام میں ہمیشہ شریف اور ہنس مکھ دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کے باطن میں شیطان ہوتا ہے اور ایسے لوگوں کی کسی بھی سماج میں کمی نہیں۔ ناول کے کئی اور کرداروں میں شہہ میری، ریگی، جینٹ، مسز میتھیوز، میجر ملکانی، ٹریسی، سارہ وغیرہ بھی اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں۔

جان محمد آزاد کے ناولوں کی سب سے بڑی خوبی عمدہ منظر نگاری ہے۔ اس ناول میں گلمرگ اور

شہر سرینگر میں ڈل جھیل کے عمدہ مناظر پیش کئے گئے ہیں۔ کہیں کہیں پہ ایسا گمان ہوتا ہے کہ ناول نگار کے سامنے ناول پیش کرنے کا ایک ہی مطلب ہے اور وہ ہے منظر نگاری۔ یہ اگرچہ ناول کی خامی ہے کہ ناول نگار اصل موضوع سے ہٹ کر منظر نگاری میں الجھ جائے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ایک کامیاب ناول کے لئے عمدہ منظر نگاری کافی ضروری ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر ناول نگار نے کافی عمدگی سے منظر نگاری پیش کی ہے۔ ناول سے چند ایک مثالیں ملاحظہ کیجیے:

> ''بڈ شاہ نام کے حسین شکارے میں بیٹھتے ہی آنٹی نے صنوبر کو گرم گرم آملیٹ اور چائے پیش کی۔ شکارا چپو کی تال پر آگے بڑھنے لگا۔ سفیدوں اور چناروں کی لمبی قطاریں جھیل کے کنارے بڑھ رہی تھیں۔ صنوبر جھیل کی سحر کاری میں کھوگئی۔ وہ شکارے کے رنگین گدے کے ایک کنارے پر آئی اور اپنا ایک ہاتھ شکارے سے باہر نکالا۔ اس کی نازک انگلیاں پانی کی سطح پر کھنچے تاروں کو چھیڑ کر ایک دھن پیدا کر رہی تھیں۔ دور ڈل کی وسعتوں کے درمیان مٹی کی لکیر کی طرح ایک پگڈنڈی نظر آ رہی تھی۔ جس پر اکا دکا لوگ خراماں خراماں چلتے ہوئے شالیمار اور نشاط باغ کی طرف جا رہے تھے۔''

> ''باہر کی شب کا سکوت اپنے شباب پر تھا۔ جینٹ نے سوئٹ کی بجلی گل کر دی۔ برآمدے میں چاندنی کا جو دریا بہہ رہا تھا وہ اب ماند پڑ چکا تھا کیونکہ چاند آسمان میں دور کہیں بادلوں تلے کھو چکا تھا لیکن نیچے حدِ نظر تک پھیلی ہوئی برف پوش ڈھلانیں بے حد سنسان لگ رہی تھیں۔ اس نے آتش داں کے پاس آ کر اپنے ہاتھ اور اپنے پاؤں گرم کئے اور پھر پاس کے صوفے میں دھنسی ہوئی صنوبر کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔'' ۲۳

مندرجہ بالا مثالوں سے ان کی منظر نگاری کی عمدگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ غرض موضوع، پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، منظر کشی اور اسلوب و بیان کی دلکشی کی وجہ سے ان کے ناول ریاست

جموں وکشمیر کی ناول نگاری میں کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ان کے ناول موضوع اور فن دونوں اعتبار سے یہاں کی ناول نگاری کی تاریخ میں بیش قیمت اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عبدالغنی شیخ

جیسا کہ پہلے ہی ذکر کیا چکا ہے کہ ریاست جموں وکشمیر تین صوبوں پر مشتمل ہے۔ان تین صوبوں میں صوبہ لداخ ریاست جموں وکشمیر کا ایک اہم صوبہ ہے۔اس صوبے میں اردو زبان وادب کے لئے حتی المقدور کوششیں ہورہی ہیں۔یہاں کئی قلم کار اپنا خونِ جگر صرف کر کے اردو شعر وادب کے سرمایہ میں اضافہ کررہے ہیں۔لداخ سے تعلق رکھنے والے قلم کاروں میں عبدالغنی شیخ کافی اہمیت کے حامل ہے۔

عبدالغنی شیخ نے نہایت بہادری اور وقت اور حالات کے پے در پے مسائل کو نہایت حوصلہ اور جرات مندی سے اپنی کہانیوں کا جزو بنایا ہے اور دنیائے ادب میں نام کمایا۔انہوں نے لداخ جیسے دور دراز خطے میں رہ کر اپنی تحریری کاوشوں کو جاری رکھا۔یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ لداخ میں چند ہی لوگوں نے تصنیف وتالیف کام انجام دیا ہے۔

عبدالغنی شیخ کی پیدائش ریاست جموں وکشمیر کے خوبصورت لیکن سرد ترین صوبے لداخ میں ۵/ مارچ ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔عبدالغنی شیخ نے یہیں پرورش پائی۔ان کے والد کا نام غلام قادر شیخ تھا جن کے آباواجداد ذریعہ معاش کی تلاش میں کشمیر سے ترک سکونت اختیار کر کے لیہہ لداخ میں مقیم ہوگئے۔ بچپن ہی سے غلام قادر شیخ کو بڑے مصائب ومشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔والد صاحب نے ایام زندگی میں کسی پنجابی تاجر سے قرض لیا تھا جس کی ادائیگی مقررہ وقت پر نہ ہوئی لہذا یہ نوبت مکان پر آ گئی۔

عبدالغنی شیخ نے ابتدائی تعلیم لیہہ کے مقامی اسکول سے حاصل کی ۔ وہ کافی ذہین تھے اور دسویں جماعت کا امتحان سکنڈ ڈویژن سے پاس کیا۔اس کے بعد انہوں نے کشمیر یونیورسٹی سے ادیب فاضل اور بی۔اے آنرس کے امتحانات امتیازی نمبرات کے ساتھ پاس کئے۔انہوں نے ۱۹۷۶ء میں راجستھان یونیورسٹی سے ہسٹری میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔اس کے علاوہ انہوں نے انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمونیکیشن ، دہلی سے صحافت میں پانچ ماہ کی ٹریننگ بھی حاصل کی۔عبدالغنی شیخ نے کئی بین الاقوامی سمیناروں میں لداخ کی تاریخ وثقافت وغیرہ پر اپنے مقالے پیش کئے۔ان ممالک میں فرانس، انگلینڈ ، سوئزر لینڈ ، ترکی ، جرمنی ، ڈنمارک ، برازیل ، سنگاپور ، پاکستان ، ایران ، ہالینڈ اور سعودی عرب وغیرہ شامل ہیں۔

عبدالغنی شیخ ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ان کی شخصیت کے کئی ایک پہلو ہیں۔وہ بیک وقت مورخ ہیں اور تبصرہ نگار بھی۔سوانح اور خاکہ نگار بھی۔ادیب اور سائنسی علوم کی معلومات فراہم کرنے والے استاد بھی،سفرنامے اور فلسفہ تعلیم پر نظر رکھنے والے،اخبارات کے لئے کالم اور ریڈیائی بات چیت ،فیچر، ٹی،وی سیریل اور اسکرپٹ لکھنے والے بھی۔غرض انہوں نے لگ بھگ ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔پھر بھی ایک جگہ پر اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ' آپ یہ نہ سمجھئے کہ قلم کا ہر فن جانتا ہوں ۔مجھے اپنی عملی بے مائیگی کا احساس ہے۔میں اپنی اوقات جانتا ہوں۔البتہ جو کچھ لکھتا ہوں سوچ سمجھ کر لکھتا ہوں اور تحقیق کر کے لکھتا ہوں۔ میں جس بات سے متاثر ہوتا ہوں اس میں قارئین کو بھی شامل کرنا چاہتا ہوں۔

کشمیر کے ادب نواز نور شاہ، دیپک بدکی ، حامدی کاشمیری، آنند لہر، وریندر پٹواری، دیپک کنول وغیرہ جیسے اردو کے اہم افسانہ نگاروں کی طرح عبدالغنی شیخ کا نام بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔انہوں

نے لداخ جیسے برفیلے علاقے میں اردو فکشن کو زندہ رکھا اور اپنی کہانیوں میں لداخ کے اطراف میں بکھری ہوئی زندگی اور زندگی سے وابستہ ان گنت واقعات وحالات کو ایک منفرد اسلوب میں سیمٹ کر پیش کیا۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''زوجیلا کے آر پار'' ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا اور ادبی حلقوں میں اس کی کافی پذیرآرائی ہوئی۔اس کے بعد ان کا پہلا ناول 'وہ زمانہ' ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔آگے چل کر انہوں نے اور بھی کامیاب افسانوی مجموعے لکھے۔۱۹۷۸ء میں انہوں نے اپنا دوسرا ناول ''دل ہی تو ہے'' لکھا۔

عبدالغنی شیخ کی کہانیوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے شہر اور دیہات دونوں زندگیوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔وہ اپنی ہر کہانی اور ناول کے لئے بہت غور وفکر اور بے حد توجہ کے ساتھ منصوبہ بندی کرتے ہیں۔انسان کی امنگوں اور آرزؤں سے وہ پوری طرح واقف ہیں۔نہ صرف افسانہ کی تکنیک پر ان کو عبور حاصل ہے بلکہ ناول کی پیش کش میں بھی وہ مہارت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔وہ مبہم اور غیر واضح بیانات سے پرہیز کرتے ہیں۔ان کے یہاں بیجا عبارت آرائی بھی نہیں ہے۔بلکہ وہ اپنے افسانوں اور ناولوں کو سیدھے سادے انداز میں پیش کرتے ہیں۔

ان کا ناول ''وہ زمانہ'' بنیادی طور پر ایک تاریخی ناول ہے۔اس ناول میں ۱۹۴۷ء سے پہلے کے لداخ کی معاشرتی، ثقافتی زندگی کے علاوہ آزادی کے بعد لگ بھگ تین دہائیوں کے دوران رونما ہونے والی تبدیلیوں کو مزاحیہ اور دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ناول میں کوئی پلاٹ نہیں ہے بلکہ مختلف واقعات کو بالترتیب اکیس ابواب میں یکے بعد دیگرے پیش کیا گیا ہے۔اس ناول کی کہانی کو مصنف نے صیغہ واحد متکلم میں تاریخی اعتبار سے بیان کیا ہے۔

ناول کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں لداخ کی خوب پذیرآئی کی گئی ہے۔جس

میں قدیم وجدید لداخ کی تہذیب، تمدن، رہن سہن، طرزِ معاشرت، تعلیم وتربیت، رسم ورواج وغیرہ سے متعلق بھرپور جانکاری حاصل ہوتی ہے۔ اس ناول کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ناول نگار نے گزشتہ ایک صدی سے زیادہ مدت کے دوران لداخ میں ہونے والے اہم واقعات اور تغیر وتبدل کو افسانوی انداز میں پیش کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس میں حقائق کا خاص خیال رکھا گیا ہے اس لئے اس ناول کو لداخ کے ادبی حلقوں میں بالخصوص نے کافی سراہا ہے۔

مصنف نے اپنے ذاتی مشاہدات، تجربات اور براہِ راست رابطے سے حاصل کردہ چونسٹھ سے زائد کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ عبدالغنی شیخ اس ناول کے پیش لفظ میں اس بارے میں یوں لکھتے ہیں:

> ''وہ زمانہ' جو ایک ناول بھی ہے اور ایک تاریخ بھی جس کی تخلیق میں ذاتی مشاہدات، یاداشتوں اور متعدد لوگوں اور بزرگوں کے احوال کے بیان کے علاوہ لداخ پر لکھی گئی چونسٹھ سے زائد کتابوں سے استفادہ حاصل کیا گیا ہے۔'' ۲۴

عبدالغنی شیخ کا دوسرا ناول 'دل ہی تو ہے' ہے۔ یہ ناول انہوں نے ۱۹۷۸ء میں لکھا۔ یہ ایک رومانوی ناول ہے۔ اس میں ناول نگار نے تاریخی واقعات کو سیدھے سادھے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس ناول میں ناول نگار نے تخیل کی مدد سے واقعات میں رنگ آمیزی کی ہے اور انہوں نے لداخ کے تاریخی عناصر کو ایک نفیس نمونے میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ اس کے لئے انہوں نے رومانیت سے بھرپور ماحول کا سہارا لیا ہے۔ عبدالغنی شیخ کو دراصل بچپن سے ہی تاریخ سے دلچسپی تھی۔

عبدالغنی شیخ نے اس ناول میں لداخ کی تاریخ، ثقافت، رہن سہن، رسم ورواج پر قلم اٹھا کر اس کو ایک رومانی اندازِ تحریر کی شکل دی ہے۔ جس میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ کیونکہ تاریخ جیسے خشک

موضوع کو چھونا سب کے بس کی بات نہیں۔انہوں نے اپنے گہرے مطالعہ،غور وفکر اور سنجیدگی کے ساتھ اس موضوع کو اس اسلوب سے ترتیب دیا ہے کہ رومانی ہواوں میں بدلتے لداخ سے واقف ہو جاتے ہیں۔ان کے ناولوں کی زبان نہایت عام فہم ہے جو لوگ آپس میں بولتے ہیں۔ان کے تراشے ہوئے جملے اپنے اندر ایک لطف اور نغمگی رکھتے ہیں۔دراصل عبدالغنی شیخ کے پاس لفظوں کا خزانہ ہے اور جنہیں وہ اچھی طرح استعمال کرنے کا ہنر بھی جاتے ہیں۔اس ناول کے اسلوبِ سے ناول نگار کے تخلیقی شعور کی پختگی کا پتہ چلتا ہے۔وہ ہر لفظ سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں۔عبدالغنی شیخ کو عورتوں کی زبان،محاوروں اور ضرب الامثال پر بھی بڑی قدرت حاصل ہے۔جذباتی تقریریں اور رنگین بیانی سے عموماً پرہیز کرتے ہیں۔ناول میں انگریزی ہندی کے ساتھ ساتھ لداخی الفاظ کا بھی خوبصورت استعمال ملتا ہے۔یہ الفاظ اپنے بولنے والے کرداروں کی شخصیت کے ساتھ ساتھ اپنے تہذیبی ماحول کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔مکالمے مختصر مگر کرداروں کی نفسیاتی و جذباتی کیفیات کی بھر پور ترجمانی کرتے ہیں۔اس ناول میں نہ طنز کی نشتریت اور نہ مصنف کے لہجے میں شدت ہے بلکہ صاف ستھرے الفاظ میں مصنف نے اپنی بات پہنچانے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔

شبنم قیوم

شبنم قیوم کا اصل نام عبدالقیوم ریشی ہے۔ادبی حلقوں میں انہیں شبنم قیوم کے نام سے جانا جاتا ہے۔ان کی پیدائش ۲؍دسمبر ۱۹۳۸ء کو سری نگر کے ڈلگیٹ علاقے میں ہوئی۔ڈل گیٹ کا علاقہ اپنی خوبصورتی کے علاوہ علمی و ادبی لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔شبنم قیوم ابتدا ہی سے ذہین واقع ہوئے تھے اور ادب سے انہیں لگاؤ تھا۔انہوں نے ۱۹۵۱ء میں جامعہ علی گڑھ سے ادیب کا امتحان پاس

کیا۔۱۹۵۲ء میں انہیں ریاست کے ڈپٹی پرائم منسٹر بخشی غلام محمد نے گھریلو کام کے لیے اپنے گھر میں رکھا۔ ۱۹۵۷ء میں وہ محکمہ زراعت میں ملازم ہوئے ۔ ۱۹۹۶ء میں وہ اس ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

شبنم قیوم ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہے۔ وہ بیک وقت ادیب اور فکشن نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے صحافی بھی ہے۔ وہ مقامی اخبارات میں حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے رہتے ہیں۔ شبنم قیوم اردو افسانہ نگاری کا ایک معتبر نام ہے۔ وہ گذشتہ کئی برسوں سے اپنی کہانیوں کے ذریعے قارئین سے خراجِ تحسین حاصل کررہے ہیں۔ اس کے علاوہ کشمیر کی سیاسی تاریخ سے انہیں کافی دلچسپی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی کتاب 'کشمیر کا سیاسی انقلاب' کافی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کے بارے میں جان محمد آزاد لکھتے ہیں:

> ''پانچ حصوں پر مشتمل اس ضخیم وعظیم کتاب (کشمیر کا سیاسی انقلاب) نے شبنم قیوم کو ایک عمدہ ادیب کے علاہ ایک دور بین محقق اور ایک محنتی مورخ کی حیثیت سے پیش کیا۔ یہ ایک بت شکن کا ایسا مستحسن کارنامہ ہے جس نے سالہا سال کے اندھے عقائد میں شگاف پیدا کر دیا۔ جس نے ظلمات کے دیوتاؤں کا حقیقی چہرہ قارئین کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔ یہ ایک نئے عہد کی تاریخ ہے۔'' ۲۵

شبنم قیوم ریاست جموں وکشمیر کے ادبی حلقوں میں ایک بہترین افسانہ نگار اور کامیاب ناول نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ انہوں نے جب ادب کے میدان میں قدم رکھا اس وقت ان کی عمر ۱۸ سال کی تھی۔ اب تک ان کے کئی ناول منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کی ناول نگاری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کرداروں سے اعمال کو خیر وشر، نیکی وبدی یا سودوزیاں کے پیمانے سے ناپنے کے قائل نہیں۔

حقیقت پسندی ان کی ناولوں کا خاص جز ہے۔ وہ اپنے ناولوں میں زندگی کے پراثر ار دھندلکوں اور سر چشموں کی کھوج کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ شبنم قیوم نے ۱۸ سال کی عمر میں ادب کے میدان میں قدم رکھا۔ ان کا پہلا ناول ''زندگی اور موت'' ہے۔ یہ ناول ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول اس لیے اہم ہے کہ یہ شبنم قیوم کا پہلا ناول ہے۔ یہ ناول بسیار تلاش کے باوجود بھی راقم کو میسر نہیں ہوا۔ اس ناول کے بارے میں کئی تنقید نگاروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جان محمد آزاد کے مطابق یہ ناول جذباتیت اور انقلاب پسند رومانیت کا ایک دلچسپ امتزاج ہے۔ اس ناول کے کرداروں میں غیر معمولی مقصدیت نظر آتی ہے۔ کرداروں کی نفسیاتی وجذباتی کیفیات کا قاری کے دل پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ اس ناول میں ان کے خیالات کی بلندی اور فنی پختگی بھی نظر آتی ہے۔ کردار نگاری کے لحاظ سے یہ ناول کامیاب مانا جاتا ہے۔ کرداروں کی داخلی کشمکش نفسیاتی کیفیتوں کے ساتھ قاری کو متاثر کرتی ہے۔ ناقدین ے مطابق یہ ناول زندگی کے مزاج کو سمجھنے کی ایک پرخلوص کوشش ہے۔ پروفیسر خورشید عالم اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''۱۹ سال کی عمر میں ان کا پہلا ناول 'زندگی اور موت' جذبات کی گہرائی، یقین کی روشنی اور انقلاب پسند رومانیت کے ساتھ ایک دلچسپ ناول ہے۔ اس ناول کے کردار غیر معمولی مقصدیت اور ان کا انقلابی جوش وخروش دل پر اثر کئے بنا نہیں رہتا۔ اس ناول میں ان کے بلند خیالات ان کی فن کی پختگی خاص طور پر ظاہر ہے۔ بین الاقوامی مسائل میں قومی رنگ کو نبھاتے ہوئے اس نے انسانیت کی بنیادی صلاحیتوں پر نظر رکھی ہے اور ایسے کرداروں کو ابھارا ہے کن کی داخلی کشمکش باریک سے باریک نفسیاتی کیفیتوں کے ساتھ قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ اس

ناول کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے زندگی کے مزاج کو سمجھنے کی پرخلوص کوشش کی ہے۔ انسانی فطرت کی بوقلمونی اس کے تضاد، ضروریات اور چھوٹی بڑی الجھنوں کی جس طرح اس نے پیش کیا ہے وہ محض دلچسپ ہی نہیں بلکہ بصیرت افروز بھی ہے۔'' ۲۶

مندرجہ بالا اقتباس سے ان کا ناول اپنی خصوصیات کے اعتبار سے ایک دلچسپ اور اہم ناول کہلایا جاتا ہے۔

''چراغ کا اندھیرا'' شبنم قیوم کا اہم ناولٹ ہے۔ یہ ناولٹ ۱۹۶۹ء میں منظر عام پر آیا۔ اس ناول میں غنڈہ گردی کے اس دور کو موضوع بنایا گیا ہے جب رہبر رہزن بن گئے تھے۔ یہاں انہوں نے اس قسم کے سیاہ کارحاکموں اور سیاسی ٹھیکیداروں پر ایسی ضربیں لگائی ہیں جن سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

ناول ''چراغ کا اندھیرا'' میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو ایک اچھے ناول کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ تجسس اور سنسنی خیزی، بدی کی ناکامی اور اچھے لوگوں کی فتح اس ناول کا بنیادی موضوع ہے۔

ناول کا ہیرو بشیر احمد ہے۔ بشیر احمد پڑھا لکھا نوجوان ہے۔ وہ علی گڑھ سے ایل۔ ایل۔ بی کر کے آیا ہے۔ وہ دولت مند باپ کا بیٹا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ذہین اور خوبصورت بھی ہے۔ وہ بہادر بھی ہے اور غیور بھی۔ غرض دنیا جہاں کی ساری خوبیاں اس میں موجود ہیں۔ یہی خصوصیات اسے ناول کا ہیرو بناتی ہے۔

ایل۔ ایل۔ بی پاس کرنے کے بعد وہ اپنے گھر واپس آتا ہے۔ یہاں پہنچ کر اسے علی گڑھ یونیورسٹی اور شہر کی یادیں ستاتی ہے۔ وہ چاہ کر بھی علی گڑھ میں گذارے ہوئے ایام کو بھلا نہیں سکتا۔ علی گڑھ کی ہر ایک چیز اسے یاد آ رہی ہے اور وہ بے چین ہو رہا ہے:

''علی گڑھ کی زندگی، یونیورسٹی اور ہوسٹل کی فضائیں، شہر کی سڑکیں اور گلیاں اسے یاد آ رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا یہ سڑک اسی دنیا میں لے جائے گی۔ جس دنیا میں مجھے بہت کچھ ملا ہے۔ یونیورسٹی کی پر وقار عمارتیں ذہن میں ابھری، ہوسٹل کے کمرے اور دوست نظر آئے۔ جی چاہتا تھا پھر اسی دنیا میں واپس چلا جاؤں۔ وہ دنیا کتنی رنگین، آزاد اور سادہ تھی۔ کتنی روشن اور دل فریب تھی۔'' ۲۷

اس کے ساتھ بشیر احمد کو وہ تقریر بھی یاد آ رہی ہے جو الوداعی تقریب میں وائس چانسلر نے کی تھی۔ بشیر کے کانوں میں وہ آواز گونجنے لگی۔ وہ زندگی کی قدروں کے بارے میں غور کرنے لگا۔ وہ قانون پڑھ کر لوگوں اور غریبوں کی مدد کرنے کا عزم کرتا ہے۔ وہ ناانصافی کے رینگتے ہوئے سانپوں کو قانون کے اصولوں سے کچل دینا چاہتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو سماج کا ذمہ دار فرد تصور کرنے لگتا ہے۔

ناول کا ہیرو بشیر احمد اس وقت کافی مایوس ہو جاتا ہے جب اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کا اپنا باپ سرکاری خزانے کو لوٹ رہا ہے۔ اسے ایسا لگتا ہے کہ وہ جن لوگوں کو سزا دینا چاہتا ہے اس میں اس کا اپنا باپ سرفہرست ہے۔ اس کے باپ نے غریبوں کا خون چوس کر دولت جمع کی ہے۔ لوٹی ہوئی دولت سے اس کے باپ نے ایک عالی شان محل تعمیر کراویا ہے۔ بشیر احمد کی شخصیت کی ایک جھلک اس ناول سے ملاحظہ کیجیے:

''اب میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ آج میری آنکھیں کھل گئی۔ آج میرے سامنے اپنے گھر بار کی ٹھاٹھ باٹھ کا راز کھل گیا۔ میں اس جھوٹی آزادی، نام نہاد جمہوریت اور غلط سیاست سے واقف ہو چکا ہوں۔'' ۲۸

اس طرح وہ اپنے ہی گھر میں بغاوت کرتا ہے۔ بشیر کے سامنے یہ راز بھی کھل جاتا ہے کہ اس کے باپ نے مزدوروں کی تحریک کو کچلنے میں کافی اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ اپنے باپ کی کالی کرتوتوں

سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنے باپ اور تمام سرمایہ داروں کو شک کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

یہ ناول دراصل ایک بے ایمان باپ اور ایک ذہین و قابل بیٹے کی کشمکش کی کہانی ہے۔ ناول میں باپ سرمایہ داروں کی نمائندگی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہیں بشیر مزدور طبقے کا ہمدرد اور نقلابی خیالات رکھنے والا طالب علم ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ نظام کو مٹانا چاہتا ہے۔ وہ مزدورں کے انقلاب میں خود بھی حصہ لیتا ہے اور اس کا خواہاں بھی ہے۔ وہ اپنے باپ کو عدالت کے سامنے لانا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے باپ کو اس کی لوٹی ہوئی دولت اور غریبوں و مزدوروں پر روا رکھے جانے والے ظلم کی سزا ملے۔ وہ اپنے باپ کے خلاف بغادت کرتا ہے۔

سرمایہ داروں کے ہاتھ کافی لمبے ہوتے ہیں۔ ان کی رسائی سرکار اور پولیس تک ہوتی ہے۔ وہ سرکار اور پولیس کو اپنی لونڈی سمجھتے ہیں۔ بشیر کی بات کوئی نہیں سنتا۔ اس کا باپ پہلے اس سے گھر میں سمجھاتا ہے۔ لیکن جب وہ اس میں ناکام ہوتا ہے اور بشیر اپنی ضد پہ اڑا رہتا ہے تو وہ اسے جیل میں بند کروا دیتا ہے۔ ایسے میں بشیر آزادی اور آزادی کے بعد پیدا ہونے والے سرمایہ داروں کو کوستا ہے۔ یہاں ناول میں آزادی کے بعد پیدا ہونے والے واقعات پر طنز کیا گیا ہے:

> ''اس سرزمین جس کے ذرے ذرے سے آج مجھے نفرت ہو رہی ہے۔ یہاں چند صاحبِ اقتدار لوگ سینکڑوں مفلسوں کا خون چوس کر اپنی فتح پر ناز کر رہے ہیں۔ یہاں چند خودغرض مفاد پرست اپنے فائدے کے لیے ہزاروں لوگوں کی روزی روٹی کو روند کر انہیں بھوکوں مارتے ہیں۔ یہاں چند رشوت خور، بددیانت اور حرام خور اپنی تجوریاں بھرنے کے لیے سینکڑوں لوگوں کی تمناؤں کا گلا گھونٹتے ہیں۔ یہاں آزادی کو بدنام کیا جا رہا ہے۔ جمہوریت کے پرخچے اڑائے جا رہے ہیں۔ سیاست کی توہین کی جا رہی ہے اور یہ سب وہی کر رہے ہیں جو اس دیش کی

آزادی، جمہوریت اور سیاست کے مالک بن بیٹھے ہیں۔'' ۲۹؎

اس طرح یہ ناول سرمایہ داروں اور مزدور طبقے کی رسا کشی اور جد و جہد پر مبنی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار بشیر احمد ہے۔ وہ غریب اور مزدور طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ ایک مل میں کام کرتا ہے۔ لیکن سرکاری اعلیٰ افسر اس مل کو لوٹنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ یہاں تک کہ مل خسارے میں کام کرنے لگتی ہے۔ سرکار اس مل کو بند کرنے کا حکم دیتی ہے۔ مل میں کام کرنے والے ایک ہی رات میں سڑک پر آ جاتے ہیں۔ یہ مزدور اس لیے بے روزگار ہو جاتے ہیں کیونکہ بڑے افسران مل کو لوٹ کر اسے بند کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ مزدور احتجاج کرتے ہیں۔ ان کی رہنمائی ان کا ایک مزدور ساتھی بشیر احمد کرتا ہے۔ وہ مزدوروں سے کہتا ہے:

''بزرگو اور بھائیو۔۔

آج ہم سب مختلف ملوں، کارخانوں اور فیکٹریوں کے مزدور ایک جگہ جمع ہوئے ہیں۔ ہم سب مزدورں کا ایک ہی مطالبہ ہے۔ ہمارا مقصد ایک اور پروگرام بھی ایک ہے۔ اس لیے کہ مزدور ایک ہے۔ مزدور مل کا ہو یا فیکٹری کا، مزدور شہر کا ہو یا دیہات کا، مزدور دیس کا ہو بدیس کا۔ مزدور مشرق کا ہو یا مغرب کا۔ مزدور ایک ہے۔ مزدور جاگ اٹھا ہے۔ چاہے وہ ایشیا کا ہو یا رشیا کا۔ صرف ہم نیند میں پڑے ہوئے ہیں۔ اگر آج ہم اپنے مطالبے اور اپنے مقاصد کا اعلان کریں گے تو آپ دیکھ لیجئے تمام دنیا کے مزدور اس پر لبیک کہیں گے۔ اس دنیا کا معمار ایک مزدور ہے۔ اس دھرتی کی ترقی، بہبودی اور خوش حالی مزدور سے جنم لیتی ہے۔'' ۳۰؎

ناول کے اختتام تک مزدورں کی کوشش کوئی رنگ نہیں لاتی۔ انہیں سیاست داں اور سرمایہ دار طرح طرح سے پھنساتے ہیں۔ ان کو اپنے جال میں اس طرح پھانس دیتے ہیں کہ یہ لوگ یہاں

سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔ ناول کا اختتام بشیر کی تقریر پر ہوتا ہے۔ وہ آنے والے وقت میں مزدوروں کو یہ پیغام دیتا ہے کہ اگر چہ ہمارے زمانے میں ملک میں مزدور انقلاب لانے میں ناکام ہو گئے لیکن یہ جدوجہد جاری رہے گی۔ وہ دن دور نہیں جب سرمایہ داری کا سورج ڈوب جائے گا۔اس ناول پر ترقی پسند تحریک کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔اس ناول کے ذریعے مزدور طبقے کے لوگوں کے مسائل کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔فنی اعتبار سے یہ ناول کامیاب نظر آتا ہے۔

''یہ کس کا لہو ہے،کون مرا'' شبنم قیوم کا تیسرا اہم ناول ہے۔ یہ ایک اہم نیم سیاسی اور نیم تاریخی ناول ہے۔ یہ ناول کاشانہ ادب سری نگر سے ۱۹۷۵ء میں پہلی بار شائع ہوا۔اس ناول نے ریاست جموں وکشمیر کے سیاسی، صحافتی، ادبی اور عوامی حلقوں میں کافی ہلچل مچا دی۔اس ناول کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے سات ایڈیشن دیکھتے دیکھتے ہی ختم ہوگئے۔شبنم قیوم کا ماننا ہے کہ اس ناول نے انہیں ترقی ،شہرت اور عزت کے ساتھ ساتھ دولت بھی دی۔ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''یہ ناول ایک طرح سے میری پہچان بن گئی۔کشمیر کی سیاست کے پس منظر میں جب یہ ناول پہلی بار چھپ گیا تو سرکار نے اس پر پابندی لگادی۔شبنم قیوم کو انڈر گروانڈ جانا پڑا۔ چونکہ اس ناول کی پوری کہانی حقیقت پر مبنی تھی لہذا عدالت سے بری ہوگئی۔اس سے اس ناول کی اتنی ڈیمانڈ بڑھ گئی کہ کشمیر کی ادبی تاریخ میں اس نے اشاعت اور ایڈیشنوں کا ایک ریکارڈ قائم کیا۔'' [۳۱]

اس ناول کا موضوع کشمیر کی سیاسی تاریخ ہے۔ناول کا پس منظر ۱۹۴۷ء کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں پیدا ہونے والے حالات وواقعات ہے۔تقسیم کے سانحے کے بعد ایک طرف پاکستان نے قبائلی فوج کو وادی میں بھیج کر یہاں کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی تو دوسری طرف مہاراجہ ہری سنگھ اور

شیخ عبداللہ کی درخواست پر ہندوستان کی افواج کو قبائلیوں کے مقابلے میں صف آرا ہونا پڑا۔ان حالات میں ریاست کو دونوں ممالک کا قہر دیکھنا پڑا۔

ہندوستان نے اپنی فوجیں اس شرط پر کشمیر روانہ کی تھی کہ حالات میں بہتری کے ساتھ ہی وہ اپنی فوج کو اپنے ملک واپس بلائیں گے۔ ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے کشمیر کے لوگوں سے وعدہ کیا تھا کہ کشمیر کے حالات میں بہتری کے ساتھ ہی یہاں کی عوام سے ان کی مرضی پوچھی جائے گی ۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اس بات کا بھی اعلان کیا تھا کہ کشمیری عوام اختیار دیا جائے گا کہ وہ ہندوستان کا حصہ بننا پسند کریں گے یا پاکستان کا۔اس کے علاوہ آزاد رہنے کی بھی ان کے پاس پسند ہوگی۔لیکن آج تک ایسا ممکن نہ ہوسکا۔نہ ہندوستان نے اپنی فوجیں واپس بلائی اور نہ ہی کشمیر کے عوام سے ان کی مرضی پوچھی گئی۔نہ پاکستان نے اس حصے سے اپنی فوجیں واپس بلائیں۔

کشمیر میں ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک کشیدگی اور تناؤ جاری ہے۔ یہ ناول اسی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ناول نگار شبنم قیوم اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''یہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ برصغیر تقسیم ہو چکا تھا اور تقسیم کے دوران جو کچھ ملک بھر میں رونما ہوا۔اس سے متاثر ہوئے بنا نہیں وہ سکا۔تقسیم کا یہ زخم ابھی مندمل بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ میری اس ریاست پر قبائلیوں نے حملہ کر کے یہاں کے امن کو درہم برہم کر دیا۔قبائلی پٹھانوں کے اس حملے سے اس سرزمین پر جو کچھ ہوا اسے میں نے دیکھا اور محسوس کیا حالانکہ ان دنوں میں بہت چھوٹا تھا۔۔۔ ہندوستانی فوج کی آمد پر قبائلی پٹھان یہاں سے بھاگ تو گئے لیکن وہ اپنے ساتھ جو کچھ بھی لے گئے وہ آج بھی ان کے قبضے میں ہے۔اس طرح برصغیر تقسیم ہونے کے ساتھ میری مادر وطن بھی تقسیم ہوا اور میرا یہ زخم۔۔۔ بہت گہرا ہو گیا۔ اس گہرے زخم کی وجہ سے مجھے کوئی چین نہیں ملا۔'' ۳۲؎

شبنم قیوم کے اس اقتباس سے ناول کے موضوع کا بخوبی علم ہوتا ہے۔اس کے علاوہ ناول کے آغاز میں موضوع کے عنوان سے جو تحریر ہے اس سے ناول کی کیفیت کا اندازہ اچھی طرح ہو جاتا ہے۔اقتباس دیکھئے:

> ''کشمیر کی مثال ایک خوبصورت عورت سے دی جا سکتی ہے جس سے دو آدمی جو ایک دوسرے کے ہمسایہ بھی ہیں شادی کرنا چاہتے ہیں۔اس عشق کی وجہ سے دونوں نے درمیان قتل وغارت گری کی نوبت آتی رہتی ہے۔دونوں اس عورت کو حاصل کرنے کے لیے اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔اس کھینچ تان نے عورت کو ادھ مرا کر دیا ہے۔ان کی عشق کی وجہ سے کشمیری عوام کی حالت ماہی بے آب کی سی ہوگئی ہے۔ان دونوں عاشقوں کو کشمیری عوام کی خواہشات کی پرواہ ہے نہ ان کی امنگوں کی کوئی فکر ہے۔ایک عورت بیک وقت دو خاوندوں کی بیوی نہیں ہو سکتی۔ کشمیر یہ سوچ رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کو کیسے راضی رکھا جائے جبکہ اس عشق کی وجہ سے دونوں کا نقصان ہو رہا ہے۔ان حالات میں ہم بجز اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ خدا را ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔آزادی اور خودمختاری ہمارا پیدائشی حق ہے۔یہ ہمارا نصب العین ہے۔ہمارا ایمان اور اصول ہے۔اس اصول کے لیے اگر ہماری جان بھی چلی جاتی ہے تو ہم ہرگز گریز نہیں کریں گے۔'' ۳۳

مذکورہ اقتباس سے اس ناول کے موضوع کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔اس ناول کا اہم کردار اشوک ہے۔اشوک کا کردار تراش کر ناول نگار نے ہندوستان کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اشوک یہاں ہندوستان اور یہاں کی سیاست کی علامت ہے۔اس کے ساتھ محمود پاکستان کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔یہ بھی کافی اہم کردار ہے۔ان کرداروں کی کشمکش اور رسا کشی پر ناول کی بنیاد قائم ہے۔اس کے ساتھ شیخ عبداللہ بھی ناول میں اہم کردار ہے جو ریشما کا باپ ہے۔

اس کے بعد ناول رومان اور فکشن کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ اب جو کردار ہمارے سامنے آتے ہیں وہ سب حقیقی اور تاریخی ہے۔ شیخ عبداللہ، بخشی غلام محمد، میر صادق جب ریشما کے باپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے کہ اس نے اپنی بیٹی کی آزادی صلب کر لی ہے تو وہ اشوک کے سامنے جاتا ہے۔ وہ اشوک سے کہتا ہے کہ ریشما کو اپنے حقیقی پیار محمود کے ساتھ ہی رہنا چاہیے۔ اس میں ریشما کی خوشی بھی ہے اور میری مرضی بھی۔ اشوک یہ باتیں سن کر تلملا اٹھتا ہے۔ وہ ریشما کے باپ کو قید کر لیتا ہے۔ وہ ریشما کے ساتھ اپنے ناجائز رشتے کو استوار رکھنے کے لیے ریشما کے قریبی رشتہ داروں بخشی اور صادق کو مراعات اور پیسے دے کر اپنی طرف کر لیتا ہے۔

ناول کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ اچھی طرح ہو جاتا ہے کہ شبنم قیوم کے سامنے ناول لکھنے سے زیادہ تاریخ بیان کرنے کا مقصد ہے۔ وہ تاریخی واقعات کو من وعن پیش کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اگر چہ یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ ناول میں تاریخی واقعات اور حقائق پیش کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ لیکن تخلیقیت کا عنصر بہر حال ضروری ہے۔ ناول نگار تاریخ داں نہیں ہوتا کہ وہ تاریخی واقعات بیان کرنے لگے۔ ناول نگار کی ذمہ داریاں تاریخ داں سے زیادہ ہوتی ہے۔ تاریخ نگاری میں جذبات اور احساسات کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ناول میں کرداروں کی داخلی زندگی کو پیش کرنے کی بھر پور صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ اس لیے ناول کا فن کافی دشوار اور مشکل مانا جاتا ہے۔

ناول نگار شبنم قیوم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ناول میں شیخ عبداللہ کے بیانات، تحریریں، تقریریں اور انٹرویوز وغیرہ کو ترتیب دے کر کتابی صورت دی گئی ہے۔ گو کہ یہ ناول کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ لیکن اس کمزوری کے باوجود یہ ناول ریاست جموں و کشمیر کے ادبی حلقوں میں موضوع بحث بنا رہا۔ حکومتِ وقت نے اس پر پابندی بھی لگائی اور ناول نگار کو سلاخوں کے پیچھے ڈال

دیا۔لیکن مصنف کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ آزاد رہے۔شیخ محمد عبداللہ کے زمانے میں ہی یہ ناول شائع ہوا۔

''یہ کس کا لہو ہے،کون مرا'' دراصل ریاست جموں وکشمیر کے سیاسی لیڈر شیخ محمد عبداللہ کی اپنی قوم کے ساتھ دھوکہ دہی کی کہانی ہے جسے فکشن کے سہارے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔جان محمد آزاداس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''آپ (شبنم قیوم) نے نیم سیاسی ناول ''یہ کس کا لہو ہے،کون مرا'' نے یہاں کے سیاسی،صحافتی اورعوامی حلقوں میں ہلچل مچادی۔یارانِ نکتہ داں نے کہا کہ اس ناول میں کشمیر کی تاریخ اورتحریک کومسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ناول بحیثیتِ مجموعی ایک ناکام ادبی کاوش ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے سطحی جذبات کی رو میں بہہ کرلکھا گیا ہے۔ناول میں شروع سے آخر تک صرف ایک فردِواحد کوتنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔'' ۳۴

شیخ محمد عبداللہ کوکشمیر کےلوگوں کا بھرپور ساتھ رہااوران کی ہرایک بات پر وہ ایمان لاتے تھے۔ ان کے ہر فیصلے کو وہ صحیح مانتے تھے۔کشمیری عوام ان کواپنا عزیز ورہنما مانتے تھے۔ناول میں کئی جگہ اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کس طرح کشمیری عوام میں شیخ عبداللہ مقبول تھے۔لیکن اسی لیڈر نے ان کوایسے جہنم میں ڈال دیا جہاں سے واپسی کا راستہ ملنا مشکل لگ رہا ہے۔

ناول کی کہانی ریشما کے کردار کے گرد گھومتی ہے۔ ریشما اصل میں کشمیر کی ترجمانی کرتی ہے۔ریشما کے ساتھ وہ سارے واقعات رونما ہوتے ہیں جو ۱۹۴۷ء کے بعد کشمیر کے ساتھ پیش آئے۔ ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کے ساتھ ہی یہ امید بنی تھی کہ اب کشمیر بھی آزاد مملکت بن جائے گالیکن یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا:

''کشمیر جس کا دوسرا نام ریشما ہے۔طویل بیماری کے بعد وہ صحت یاب ہورہی تھی۔لیکن اس کے جوڑ جوڑ میں اب بھی درد ہورہا تھا۔ساز گار موسم اس کی صحت پر خاصا اثر ڈال رہا تھا۔ہوائیں بھی اس کے بیمار جسم کے ریشے ریشے میں رایت کرتی جارہی تھیں۔ملک کے ان بدلتے حالات کا ذمہ دار وہ فسادات کو گردانتی تھی۔فسادات سارے ملک کو لپیٹ کر خطرناک صورت اختیار کر کے اس کی پریشانی کا باعث بن رہی تھی۔'' ۳۵

فسادات نے ریشما کی زندگی اجیرن بنا دی ہے۔ابھی ریشما کچھ سنبھلی تھی کہ محمود جو اس سے دل و جان سے چاہتا ہے اور ریشما بھی اس کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔اس مقصد کے لیے محمود قبائلیوں کو بھیج دیتا ہے تا کہ وہ ریشما کو حاصل کر سکے۔ریشما کو محمود کی ادا ایک پل بھی پسند نہ آئی۔ریشما کا باپ سکتے میں آ گیا کہ کیا جائے۔ایسے میں وہ اشوک سے مدد مانگتا ہے کہ وہ محمود کے بھیجے ہوئے حملہ آوروں کو یہاں سے نکالنے میں اس کی مدد کرے۔

اشوک ریشما کے باپ کے سامنے یہ شرط رکھتا ہے کہ اگر اس کی شادی ریشما سے کرائی جائے تو وہ میدان میں اتر کر محمود کی قبائلی فوج کو نیست و نابود کر دے گا۔ایسے میں اشوک اور محمود ریشما کو حاصل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ریشما کو جب اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اشوک اس سے زبردستی شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتی ہے۔لیکن اشوک جو کافی طاقتور ہے اس پر ریشما اور اس کے باپ کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ریشما کا باپ کئی بار ریشما کی مرضی کے خلاف شادی کرنے کو گناہ سمجھتا ہے لیکن ہر وقت اشوک کی دولت اور طاقت کو دیکھ کر اپنے فیصلے بدلتا رہتا ہے۔یہاں اشوک بھی ریشما کے باپ کی کمزوری کا بھرپور فائدہ اٹھانے کو کوشش کرتا ہے۔

محمود کی محبت اور اشوک کی قربت جب ریشما کے لیے عذاب کی صورت اختیار کر جاتی ہے تو

اس کا باپ پریشان سا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی بیٹی سے کہتا ہے:

> ''دونوں (اشوک اور محمود) تم کو حاصل کرنے کے لیے تم پر اپنا حق جتاتے ہیں۔
> تم کس کو چاہتی ہو اور کس کو نہیں۔ اس کے جاننے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔
> لیکن ریشما۔ تم سوچ لو جب کسی حسین اور نوجوان لڑکی کے دو چاہنے والے ہوں
> اور ان دونوں میں سے ایک بھی پیچھے ہٹنے والا نہ ہو تو اس صورت میں کیا کیا
> جا سکتا ہے۔'' ۳۶

ایک طرف شیخ اپنی بیٹی ریشما کا بھروسہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو دوسری طرف وہ اشوک سے کافی مراعات حاصل کرتا ہے۔ ایسے میں ایک باپ اپنے ذاتی فائدہ کی خاطر ریشما کی تقدیر کا فیصلہ اس کی مرضی کے بغیر کر دیتا ہے۔ ناول کے آخر تک ریشما اشوک سے چھٹکارا پانا چاہتی ہے۔ لیکن پہلے وہ اپنے والد اور بعد میں اپنے بھائی کے لیے مراعات حاصل کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ جب ریشما اپنے بھائی فاروق سے یہ چاہتی ہے کہ وہ اس کو اشوک کے آہنی ہاتھوں سے آزاد کرائے تو ایسے میں وہ بھڑک جاتا ہے۔ وہ ریشما کو جان سے مارنے کی دھمکی دیتا ہے۔ ریشما کو جب اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کی زندگی اجیرن بنا دی گئی ہے۔ ہر کوئی اسے اپنے ذاتی فائدے اور اقتدار کے لیے استعمال اور استحصال کرتا ہے تو وہ خودکشی کر لیتی ہے۔ ریشما کی خودکشی پر ناول کا اختتام ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ اختتام نہایت مؤثر اور بامعنی ہے جس میں مصنف کا پیغام بھی ہے۔ اقتباس بطور مثال ملاحظہ ہو:

> ''ریشما کی یہ چیخ سن کر اڑوس پڑوس سے مرد اور عورتیں بوڑھے اور بچے یہاں کی
> طرف دوڑ آنے لگے۔ ریشما کو خون میں لت پت دیکھ کر یہ ششدر ہو کر اس کی
> طرف دیکھنے لگے۔ یہ سب لوگ ایک نظر سے فاروق کو اور دوسری نظر سے ریشما
> کو دیکھ رہے ہیں۔ فاورق اس وقت حواس باختہ ہو کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس

کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے یہ قتل ہے یا خودکشی۔ چھری تو ریشما کے ہاتھ میں ہے اور
اس کو قتل کرنے کی دھمکی میں نے دی۔ دیکھتے دیکھتے یہ اچانک کیا ہو گیا۔ یہ حادثہ
اچانک کیوں اور کیسے پیش آیا۔ وہ یہی سوچ رہا تھا اور اس حادثہ کا تجزیہ کر رہا تھا
کہ یہاں موجود سبھی لوگ جن میں بوڑھے جوان بچے اور مستورات شامل ہیں،
اپنے اپنے بازو پھیلا کر یک زبان ہو کر فاروق سے مخاطب ہو کر بول رہے ہیں۔
اے مظلوم قوم کے ظالم حکمران بتا یہ کس کا لہو ہے یہ کون مرا۔'' ۳۷ے

نور شاہ

نور شاہ ریاست جموں و کشمیر کی ادبی دنیا میں اپنی ایک الگ پہچان اور شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی ولادت ۹/جولائی ۱۹۳۸ء کو سری نگر کے ڈل گیٹ علاقے میں ہوئی۔ انہوں نے افسانے لکھ کر ادبی دنیا میں قدم رکھا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کے بیان کے مطابق نور شاہ پہلے شاہدہ شیریں کے فرضی نام سے لکھا کرتے تھے۔ ان کو فکشن اور شاعری کے علاوہ تحقیق و تنقید سے بھی خاصی دلچسپی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ریاست جموں و کشمیر میں ایک بہترین نقاش و مصور تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں رومانی اور جمالیاتی پہلوؤں کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔ ان کے افسانے ریاست کے اندر اور باہر مقبول جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ''بے گھاٹ کی ناؤ''، ''ویرانے کے پھول'' اور ''ایک رات کی ملکہ'' ان کے بہترین افسانے ہیں۔

افسانے کے علاوہ نور شاہ نے اردو ناول میں بھی قدم رکھا اور کئی اہم ناول اور ناولٹ لکھے۔ ان کا پہلا ناول نیلی جھیل کالے سائے ہے۔ یہ ناول تلاش کے باوجود میسر نہ ہو سکا۔ ان کا دوسرا ناول ''پائل کے زخم'' کے نام سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ان کے تین ناولٹ: ''آدھی رات کا سورج''، ''آؤ سو جائیں'' اور ''لمحے اور زنجیریں'' میزان پبلشرز سری نگر کی وساطت سے منظر عام پر

آ چکے ہیں۔

''پائل کے زخم'' نور شاہ کا دوسرا ناول ہے۔نور شاہ کو ان کے ناولوں اور افسانوں کی وجہ سے بے پناہ مقبولیت حاصل ہے۔ان کے ناولوں میں نہ صرف کشمیر کی بلکہ پورے ملک کی سماجی و معاشرتی زندگی کی بو باس نظر آتی ہے۔ان کے اس ناول میں زندگی کے مختلف رنگ اور مسائل کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔یہ ناول سماج کی تنگ نظری اور سماج میں لڑکیوں پر ہونے والے استحصال اور ظلم کی داستان ہے۔آج بھی ہماری ریاست میں ایسے افراد کی کمی نہیں جو لڑکیوں کو گھر کی چار دیواری میں رکھنے کی وکالت کرتے ہیں۔نور شاہ کے اس ناول کی خصوصیت یہی ہے کہ یہ بہت سے سماجی ،اخلاقی اور مذہبی مسلمات کے خلاف بغاوت ہے۔

''پائل کے زخم'' کو ہم ناول سے زیادہ ناولٹ کی ذیل میں رکھ سکتے ہیں۔اس میں وحدت تاثر کے ساتھ ساتھ دیگر ایسے کئی فنی عوامل نظر آتے ہیں جو اسے ناولٹ کی ذیل میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ ناول کی کہانی کا کینواس اگر چہ محدود ہے لیکن ناول نگار نے سماج کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ناول میں سلونی نام کی لڑکی کی داستانِ حیات کو موضوع بنا کر پیش کیا گیا ہے۔سلونی جو اس ناول کا مرکزی کردار بھی ہے وہ موسیقی اور رقص میں کافی دلچسپی لیتی ہے۔ وہ جب کالج پہنچتی ہے تو موسیقی اور رقص کو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھتی ہے۔ وہ اپنی تمام تر توجہ اسی فن پر صرف کرتی ہے۔لیکن اس کے گھر والے اس کے خلاف ہے۔ وہ گھر والوں سے چھپ کر الگ کمرے میں ریاض کیا کرتی ہے۔ کیونکہ اس کے اپنے ہی گھر میں اس کے فن کا کوئی قدر داں نہیں تھا۔ناول نگار نے اس کے جذبات واحساسات اور موسیقی کے فن سے اس کے دلی لگاؤ کی بہترین عکاسی کی ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''اس کے من میں نفرت کا جذبہ امڈ آتا۔ اپنے ڈیڈی کے لیے اپنی ممی کے لیے اپنے ماحول کے لیے، جہاں فن کی کوئی قدر نہیں۔ جہاں فن کو پرکھنے والی آنکھ نہیں۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے۔ کاش کوئی ان آنسوؤں کی قیمت سمجھتا۔ کوئی ان آنسوؤں کی کہانی لکھتا۔'' ۳۸؎

سلونی کے ماں، باپ اور دوسرے گھر والے موسیقی اور رقص اس لیے نفرت کرتے ہیں کہ ان کے خاندان کی ایک لڑکی صنوبر جو سلونی کی ہم شکل تھی اور جسے سلونی کی طرح موسیقی ورقص سے بے انتہا لگاؤ تھا۔ وہ اپنی مرضی سے شادی کر لیتی ہے۔ ایک پروگرام میں ایک کیپٹن اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے اور صنوبر بھی اسے پسند کرنے لگتی ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ دونوں گھر والوں کی مرضی کے بغیر شادی کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سلونی کے ماں باپ اور دوسرے افرادِ خاندان کو موسیقی ورقص سے نفرت ہو جاتی ہے۔ لیکن کالج میں داخلہ لینے کے بعد سلونی اپنے اس شوق کو پورا کرتی ہے۔ وہ کالج میں موسیقی اور رقص باضابطہ طور پر سیکھ لیتی ہے۔ وہ کالج کے کئی ایک پروگراموں میں حصہ لے کر کافی مقبول ہو جاتی ہے:

''کالج کے ہر لڑکے اور لڑکی کی زبان پر اس کا نام تھا۔ کالج میں رقص و موسیقی کا جو بھی پروگرام ہوتا، سلونی کا نام اس میں پیش پیش ہوتا۔ کچھ لڑکوں نے اسے کالج کی رقاصہ کا نام بھی دے رکھا تھا۔'' ۳۹؎

ایک دن اس کے گھر والوں کو پتہ چل جاتا ہے کہ سلونی کالج میں رقص اور موسیقی میں کافی دلچسپی لے رہی ہے۔ وہ کئی پروگراموں میں حصہ بھی لے چکی ہے۔ اس کے گھر والے اس سے دریافت کرتے ہیں اور حقیقت جاننے کے بعد اسے منع کرتے ہیں اور نہ ماننے پر اسے ایک کمرے میں بند کیا جاتا ہے۔ لیکن وہ کسی طرح یہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور سیدھے بمبئی

کا رخ کرتی ہے جہاں پر وہ صنوبر کے پاس رہنا چاہتی ہے۔

بمبئ اس کے لیے ایک نئ دنیا تھی۔ یہاں کی ہر چیز اس کے لیے نئ تھی۔ وہ گھر سے زیادہ دور کبھی نہیں گئ تھی۔ وہ یہاں اپنی صنوبر کے پاس رہنے کے لیے آئی تھی لیکن اسے صنوبر کا کہیں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ نتیجے کو طور پر وہ بے سہارا سی ہو جاتی ہے۔ وہ بمبئ میں نوکری کی تلاش میں لگ جاتی ہے اور ایک ہوٹل انورادھا میں رقص اور ناچ پر مامور ہو جاتی ہے۔ لیکن بہت جلد سلونی کو اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہاں آنے والے لوگوں کو اس کے ہنر اور فن سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ اس کی جسمانی بناوٹ اور خوبصورتی کا نظارہ کرنے آتے ہیں۔ اسے ایسا لگتا ہے کہ دنیا میں اس کے فن کا کوئی قدر دان ہی نہیں۔ اس کے سجائے ہوئے خواب ٹوٹ جاتے ہیں۔ وہ بے سہارا سی ہو جاتی ہے۔ وہ خود کلامی میں یہاں تک کہتی ہے:

> ''یہاں آ کر مجھے کیا ملا۔ گھورتی ہوئی نگاہیں جن میں اشارے پوشیدہ ہیں۔ مسکراتے ہوئے لب جن میں پیغام بکھرتے ہیں۔ ان اشاروں اور ان پیغاموں میں میرے فن کی کوئی قدر نہیں۔ یہ اشارے اور یہ پیغام میرے جسم کے لیے ہیں۔ میری جوانی کے لیے ہیں۔ کاش کوئی میری روح میں اترنے کو کوشش کرتا۔'' ۴۹

یہاں پر اس کی زندگی میں منوہر آتا ہے جو اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ سلونی اسے دل و جان سے چاہتی ہے لیکن وہ اسے دھوکہ دیتا ہے۔ منوہر اپنے مقاصد کے لیے اس کا استعمال کرتا ہے۔ وہ اپنی محبت کو پروڈیوسر کے حوالے اس لیے کرنا چاہتا ہے تا کہ پروڈیوسر اسے نوکری دے۔ سلونی نے جس منوہر کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگایا، وہ اسے کے متعلق یہ سوچتا ہے:

> ''میں نے اسے دل کی گہرائیوں سے نہیں چاہا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو کب کی

شادی کی ہوتی اور محبت۔ اگر واقعی سلونی سے محبت ہوتی تو کیا میں نے اسی وقت
پروڈیوسر کا سر نہ توڑ دیا ہوتا اور میں تو یہاں دولت کمانے آیا ہوں۔ ایک معمولی
رقاصہ کی بانہوں میں ڈولنے کے لیے نہیں۔ مجھے سلونی جیسی کتنی ہی لڑکیاں مل
جائیں گی۔ صرف ایک بار موقع مل جائے۔'' ۴۱؎

یہاں پر ناول نگار نے مرد اساس معاشرے پر گہرا طنز کیا ہے جہاں ایک عورت کو مرد اپنی کامیابی حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھ کر اس کی عزت کا سودا کرتے ہیں۔ دوسری طرف اس ناول میں عورتوں کے اندر ایثار و قربانی کے جذبات کو نمایاں کرنے کوشش کی ہے۔ یوں یہ ناول ایک عورت کی ناکامی پر ختم ہو جاتا ہے اور قاری کے سامنے کئی ایک سوال چھوڑ جاتا ہے۔

بمبئی میں قیام کے دوران سلونی یہاں کی زندگی کا مشاہدہ کرتی ہے۔ اسے یہاں سب کچھ مصنوعی دکھائی دینے لگتا ہے۔ یہاں کے ہر انسان میں اسے انسانیت نام کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ یہاں پر اسے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا میں لوگ پیسے کے لیے کتنے برے کام کرتے ہیں۔ یہاں کے رہن سہن سے اسے نفرت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سلونی یہاں کے لوگوں کے بارے میں سوچتی ہے:

:

''یہ کیسے لوگ ہیں جو ایک ہی مکان میں رہتے ہیں لیکن ایک دوسرے کو نہیں
جانتے۔ ایک مکان، ایک گھر، ایک خاندان لیکن ایک دوسرے سے کوئی تعلق
نہیں۔ کوئی سمبندھ نہیں۔'' ۴۲؎

اس ناول میں اگر چہ ایک لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے لیکن ناول نگار نے اس کردار کے ذریعہ شہری زندگی کی اصلیت وحقیقت کو بے نقاب کیا ہے۔ لوگ بمبئی کی چمک دمک دیکھ کر آتے ہیں۔ بظاہر بمبئی کی زندگی دیکھنے میں تو بہت خوبصورت ہے لیکن اس کا اندرون کافی دہشت ناک اور ویران

ہے۔ جہاں پر ایک عاشق اپنے ذاتی مفاد کی خاطر اپنی محبت کو دوسرے کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ جہاں خوبصورت لڑکیوں پر ہر وقت باز حملہ کرنے کی تاک میں لگے رہتے ہیں۔ یہ صورتِ حال ابھی بھی بنی ہوئی ہے۔اس پورے ناولٹ کی کہانی حقیقت اور تخیل کے بیچ معلق نظر آتی ہے۔ ناول نگار نے مرکزی کردار سلونی کا اپنی ماں کے مقابلے میں اپنی خالہ کی راہ پر چل نکلنے کا کوئی مضبوط جواز پیش نہیں کیا ہے۔ ناول کی ابتدا میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار سلونی کے من میں پیدا ہونی والی خواہشوں اور امنگوں کا جواز کسی نفسیاتی پس منظر میں پیش کرنے کی کوشش کرتا نظر آتا ہے لیکن جلد ہی قاری اس خوش فہمی سے باہر نکل آتا ہے۔ کہانی کے کئی واقعات میں اچانک پن نظر آتا ہے جس سے کہیں کہیں پلاٹ میں جھول سا پیدا ہوگیا ہے۔ ناول میں کئی کردار اضافی معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے مسٹر کھنا کا کردار۔ یہ کردار ناول کے آخر میں کچھ حرکت کرتا دکھائی دیتا ہے۔

ناول کا پلاٹ سپاٹ اور کہانی کافی دلچسپ ہے۔ کردار زیادہ نہیں ہے۔ سلونی ناول کا مرکزی کردار ہے جس کے گرد ساری کہانی گھومتی ہے۔ ناول میں ڈائری کی تکنیک سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈائری میں ناول کے ایک اور اہم کردار صنوبر کی ذہنی کیفیت کا اندازہ اچھی طرح ہوجاتا ہے۔ زبان و بیان اور اسلوب کے اعتبار سے بھی یہ ناول کامیاب نظر آتا ہے۔ گو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ناول بہت مختصر ہونے کے باوجود اہم ناول ہے۔

زینت فردوس

زینت فردوس ریاست جموں و کشمیر کی خواتین ناول نگاروں میں اہم نام ہے۔ ان کا نام کئی ایک کتابوں میں ان کے ناول ''نئی سحر'' کے ساتھ سرسری طور پر لیا گیا ہے۔ زینت فردوس کا ناول ''نئی

سحر'' ۱۹۷۷ء میں زمرد حسین مگھرمل باغ، سری نگر سے شائع ہوا۔۱۶۳ صفحات پر مشتمل اس ناول کے پیش گفتار میں مصنفہ نے اپنے فن کے ارتقا کا جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''میرے خیال میں ہر انسان کا کوئی نہ کوئی شوق ہوتا ہے۔ وہی شوق زیست کے لیے مسرت کا باعث ہوتا ہے۔ اسی طرح شروع شروع میں تو میں نے لکھنا ایک شوق ہی سمجھا اور لکھتی رہی۔ اب یہ شوق زندگی بن کے رہ گیا ہے۔ مختلف خیال ذہن میں گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان خیالوں میں یہ ناول بھی شامل ہے۔ اس ناول میں جتنے بھی جذبات، احساسات، خیالات ہیں یہ سب مجھے اپنی قوم سے، اپنے ملک سے حاصل ہوئے۔'' ۴۳

''نئی سحر'' زینت فردوس کا اہم ناول ہے۔ اس ناول کا موضوع انسانیت اور اتحاد کے اقدار کا اظہار کرتا ہے۔ ناول نگار نے ایک اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ انسان دوستی، مذہب و ملت کی تفریق کا خاتمہ، دوستی، محبت، اخوت، بھائی چارہ، آپسی میل جول اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی قوت کی مثالیں اس ناول میں ہر جگہ ملتی ہے۔ یہ ناول بظاہر ایک معمولی اور ہلکا پھلکا ناول نظر آتا ہے لیکن ناول نگار نے ایک اہم موضوع کی طرف اشارہ کر کے اپنی وسیع ذہنیت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ناول میں بار بار ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جن سے ہمارے جذبات کی تطہیر ہوتی ہے۔ چاہے وہ اشوک کا جمیلہ کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنا یا پھر جاوید کا اشوک کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ دینا۔

ناول کی پوری کہانی اشوک اور جمیلہ کر گرد گھومتی ہے۔ اشوک اور جمیلہ بچپن سے ایک ساتھ پلے بڑے ہیں۔ دونوں پہلے اسکول اور پھر کالج ایک ساتھ جاتے ہیں۔ یہ دونوں کافی ذہین ہیں۔ جمیلہ اپنے ماں کے ساتھ رہتی ہے۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد ان کی ماں کو اس کی شادی کی فکر دامن گیر ہوتی ہے۔ ایسے میں اشوک جمیلہ کے لیے ایک قابل اور ذہین لڑکے زاہد کا رشتہ لے کر ان کے گھر آتا ہے۔

بڑی دھوم دھام سے جمیلہ کی شادی زاہد کے ساتھ ہو جاتی ہے۔شادی کی پوری ذمہ داری اشوک نے انجام دی۔جمیلہ شادی کے بعد اپنے شوہر سے مشورہ کر کے اشوک کی شادی رانی سے کرادیتی ہے۔

جمیلہ کے یہاں ایک چاندسی بیٹی جنم لیتی ہے۔لیکن بد قسمتی سے زاہد اور جمیلہ کی ایک حادثہ میں موت ہو جاتی ہے۔وہ اپنی معصوم بیٹی روبی جس کا اصلی نام شکیلہ ہے،کو اشوک کے حوالہ کرتے ہیں۔اشکوک روبی کی پرورش کی ذمہ داری لیتا ہے۔وہ ہندوٗ ہونے کے باوجود روبی کی پرورش مسلمان کی طرح کرتا ہے:

> ''بیٹا میں ہندو ہوں کیونکہ میں نے ہندو گھرانے میں جنم لیا ہوگا۔شکیلا مسلمان ہے کیونکہ اس نے مسلمان گھرانے میں آنکھ کھولی۔مگر جہاں تک میری فکر اور تجربہ کی بات ہے یہاں نہ کوئی ہندو ہے، نہ مسلمان۔صرف وہی مذہب میرے نزدیک اونچا ہے جو انسانیت کی قدروں سے آشنا ہو، چاہے وہ ہندو ہو، مسلمان ہو، سکھ ہو یا عیسائی۔بہرحال زمانے کی روش کو سامنے رکھتے ہوئے شکیلہ بیٹی کو میں نے سب طور طریقے مسلمان مذہب کے مطابق سکھائے ہیں۔'' ۴۴

لیکن ناول میں ایک اہم اور دلچسپ موڑ اس وقت آجاتا ہے جب روبی کی شادی کی فکر اشوک کو ستاتی ہے۔اشوک اس مقدس امانت کو اپنے خونِ جگر سے پروان چڑھاتا ہے اور اس کی پرورش ایک مسلمان کی طرح کی تھی لیکن کوئی بھی روبی سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں۔ہر کوئی یہی سمجھتا ہے کہ ہندو گھرانے میں پلی بڑھی لڑکی سے رشتہ بے وقوفی ہے۔اشوک کی اس پریشانی کی تصویر کشی ناول نگار نے مؤثر انداز میں کی ہے۔مثلاً ایک اقتباس دیکھئے:

> ''چوں کہ روبی جوان تھی۔اس لیے اشوک اور اس کی بیوی رانی کو اس کے بیاہ کی فکر لگ گئی۔اشوک نے روبی کے نکاح کی بات اچھے اچھے گھرانوں میں چلائی۔مگر اشوک کی پریشانی بڑھتی گئی۔ہر ایک زبان پر ایک ہی بات تھی۔ہندو گھرانے

میں پلی ہوئی لڑکی مسلمان کیسے ہوسکتی ہے؟ یہ ناممکن ہے۔نہ نماز کا پتہ نہ روزے کا علم، نہ ہی قرآنِ پاک سے روشنائی۔صرف کلمہ طیبہ پڑھنے سے تھوڑی ہی مسلمان ہوسکتی ہے۔اس لڑکی کو کون گھر میں لائے۔روزِ قیامت کو خدائے برتر کو ہم کونسا منہ دکھائیں گے۔خدایا ہمیں معاف کرنا۔'' ۴۵

اشوک کی کوششیں آگے چل کر رنگ لاتی ہے اور ایک اچھے لڑکے جاوید سے روبی کی شادی کر دی جاتی ہے۔ یہاں پر ناول کو ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن ناول نگار نے داستان کی طرح یہاں راجن کا قصہ شامل کر کے ناول کو بیجا طوالت دینے کی ناکام کوشش کی ہے۔

اشوک اور روبی کے یہاں ایک ساتھ لڑکے پیدا ہوتے ہیں۔اشوک کی بیوی رانی لڑکے کو جنم دے کر مر جاتی ہے۔اب ربی اشوک کے بیٹے راجن اور اپنے بیٹے شکیل کی پرورش ایک ساتھ کرتی ہے۔راجن کو جب یہ پتہ چل جاتا ہے کہ وہ جاوید کا نہیں اشوک کا بیٹا ہے تو اس کے اندر بغاوت اور نفرت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ہر ایک کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ راجن پورے خاندان کا شیرازہ بکھیرنے کو کوشش کرتا ہے۔لیکن آخر میں وہ راہِ راست پر آ جاتا ہے۔ناول کے آخر میں ساری غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہے۔راجن کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔ پھر دونوں خاندان ایک ساتھ مل جل کر اور محبت کے ساتھ رہتے ہیں:

''صبح روبی قرآن شریف کی تلاوت کر رہی تھی۔شیلا اپنے کمرے میں رامائن کا پاٹ کر رہی تھی۔ برآمدے میں اشوک خاموشی اور امید کے ساتھ دونوں آوازیں سن رہا تھا۔اس کے چہرے پر شفق کھل رہی تھی۔ اشوک جب بھی وہ دونوں آوازیں سنتا جیسے وہ دنیا میں جنت کی بہار دیکھا کرتا۔وہ آنکھیں بند کئے ہوئے دل ہی دل میں ناچ اٹھتا کہ اس کے ایک ہی آنگن میں دو مقدس آوازوں کا سنگم ہو رہا ہے۔'' ۴۶

ناول کا مرکزی کردار اشوک محبت اور اخوت کے ایک مسیحا کی طرح جذبِ باہم اور رواداری کے اٹوٹ آدرشوں کی تبلیغ کرتا ہے۔ وہ ہندو ہو کر ایک مسلمان لڑکی شکیلہ کی پرورش کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے ماں باپ ایک حادثہ میں ہلاک ہو جاتے ہیں۔اس معصوم لڑکی کی ماں اشوک کی منہ بولی بہن ہوتی ہے۔

ناول کے پلاٹ میں غیر ضروری طوالت اور پیچیدگی ناول کی کمزوری بن جاتی ہے۔ جان محمد آزاد اس ناول کی فنی کمزوریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''فنی لحاظ سے دیکھیں تو زینت صاحبہ کا مذکورہ ناول زیادہ کامیاب قرار نہیں دیا جاسکتا۔اس کی پیشکش کا انداز گھسا پٹا ہے۔اس کی زبان میں فنی اختصار نہیں بلکہ بے معنی طوالت ہے۔لیکن جس چیز کے لیے 'نئی سحر' کو بلا تامل سراہا جاسکتا ہے وہ اس کا اچھوتا موضوع ہے۔'' ۴۷

مجموعی طور ہم کہہ سکتے ہیں کہ فنی کمزوریوں کے باوجود یہ ناول ریاست جموں وکشمیر میں لکھے جانے والے ناولوں میں اپنی ایک پہچان اور شناخت رکھتا ہے۔ پورے ناول کی کہانی میں انسان دوستی اور ہندو و مسلم اتحاد و بھائی چارگی کی فضا چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔موجودہ تناظر میں بھی اس ناول کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔موضوع کے اعتبار سے ناول کو اہمیت حاصل ہے۔لیکن پلاٹ میں ترتیب و تنظیم کا خیال رکھا گیا ہے۔ مکالمے جاندار ہیں لیکن طویل طویل ہیں۔ زبان کرداروں کی شخصیت سے مناسبت رکھتے ہوئے استعمال ہوئی ہے۔غرض بے جا طوالت ادر بعض فنی خامیوں کی وجہ سے اس ناول میں تاثر کی کمی پیدا ہوگئی ہے۔ باوجود اس کے کشمیر کی خواتین ناول نگاروں کے ناولوں میں اس ناول کو اہمیت حاصل ہے۔

عمر مجید

عمر مجید کا پورا نام عمر مجید میر ہے۔ ان کی ولادت ۱۸/ستمبر ۱۹۴۰ء کو سری نگر کے علاقے سونہ وار میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام غلام قادر میر اور ان کی والدہ کا نام سارہ بیگم ہے۔ عمر مجید کی ابتدائی زندگی ان کے آبائی گھر میں ہی گزری۔ ابتدائی تعلیم بسکو میموریل اسکول سری نگر میں حاصل کی۔ یہاں سے انہوں نے ۱۹۵۳ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی نمبرات سے پاس کیا۔ انہوں نے بی۔اے کا امتحان ۱۹۵۸ء میں کشمیر یونیورسٹی سے مکمل کیا۔ اس کے بعد کشمیر یونیورسٹی سے ایم۔اے کی ڈگری بھی حاصل کی۔

عمر مجید نے اپنی ملازمت کا آغاز بسکو اسکول میں مدرس کے طور پر کیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی ادبی وصحافتی زندگی کا آغاز روز نامہ ''آفتاب'' سے کیا۔ روز نامہ ''آفتاب'' سے ان کا کالم ''خیال اپنا اپنا'' ریاست کے ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہوا۔ اس کے علاوہ عمر مجید ریاست جموں و کشمیر کی علمی وادبی انجمنوں جیسے رائٹرس گلڈ کشمیر، تلاشِ ادب کشمیر وغیرہ کے فعال رکن بھی تھے۔

عمر مجید کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز ۱۹۶۵ء میں افسانہ نگاری سے ہوا۔ ان کا پہلا افسانہ ۱۵/ اگست ۱۹۶۵ء کو ''ایک بوڑھا ولر کے کنارے'' کے عنوان سے روز نامہ آفتاب سے شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے کئی اور افسانے منظر عام پر آئے۔ روز نامہ ''آفتاب'' میں ہی ان کا ایک اور افسانہ ''مردہ چنار'' شائع ہوا۔ اس افسانے کے شائع ہوتے ہی ادبی حلقوں میں عمر مجید کا نام گونجنے لگا۔

افسانے کے ساتھ ہی عمر مجید نے ناول نگاری کے میدان میں بھی قدم رکھا۔ ان کے اندر وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جو ایک بہترین ناول نگار کے لیے ضروری خیال کی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں ابھی تک ان کے دو ناول ''یہ بستی یہ لوگ'' اور ''درد کا دریا'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ عمر مجید چونکہ اپنے

گردوپیش کی زندگی میں ہونے والی تبدیلیوں کا گہرا ادراک رکھتے تھے۔اس کے ساتھ ہی کشمیری عوام کی زندگی کا انھوں نے قریب سے مشاہدہ کیا تھا۔اس لیے ان کی ناول نگاری میں کشمیر کے دیہاتوں کی عکاسی صاف دکھائی دیتی ہے۔اس کے ساتھ ہی ان کے ناولوں میں سماجی نابرابری سے پیدا شدہ مسائل کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

''یہ بستی یہ لوگ'' عمر مجید کا پہلا ناول ہے۔یہ ناول شاہین بک اسٹال،سری نگر سے ۱۹۷۰ء میں پہلی بار شائع ہوا۔عمر مجید کے فکشن کی خوبی یہ ہے کہ وہ سماجی حقیقت نگاری کا اظہار بڑی بے باکی سے کرتے ہیں۔ان کے افسانوں اور ناولوں میں ہمیں کشمیر کے دور دراز علاقوں اور دیہاتوں کی کراہتی اور درد بھری زندگی نظر آتی ہے۔دیہات کی زندگی جو دیکھنے میں کافی سادہ اور سپاٹ نظر آتی ہے۔اکثر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں کی زندگی میں پیچیدگیاں اور الجھاؤ نہیں ہوتا اور یہ بھی تصور کیا جاتا ہے کہ دیہات اور گاؤں کے لوگ کافی خوش ہوتے ہیں اور شہر کی زندگی کے برعکس یہاں زیادہ مکروہ فریب،ریاکاری،جرائم اور کسی طرح کے استحصال کا شکار نہیں ہوتے۔خصوصاً جنسی استحصال اور عورتوں کی خرید وفروخت سے گاؤں کے لوگ کوسوں دور رہتے ہیں۔عمر مجید کے اس ناول میں اس نظریئے کی تردید کی گئی ہے۔ناول نگار نے گاؤں کی زندگی کے مسائل کو دیکھ کر یہاں کی مصیبت زدہ عوام کے دکھ اور درد کی تصویرکشی اپنے اس ناول میں بڑی فنکاری سے کی ہے۔جان محمد آزادان کے اس ناول کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ ایک انسان کے ظلم اور دوسرے ان گنت لوگوں کی مظلومی اور ستم رسیدگی کی داستان ہے۔آپ نے ناول میں معاشرے کی مکروہ باتوں کی دھجیاں اڑائی ہیں۔آپ نے اخلاقی انحطاط اور قومی تہذیب کی آن پر دھبہ لگتے دیکھ کر ایک

ایسی چیخ بلند کی ہے جس سے بام ودر ہل اٹھے ہیں۔'' ۴۸؎

عمر مجید نے اس ناول میں جلنور گاؤں کے پس منظر میں پورے کشمیر کے دیہاتوں کے عوام کی درد بھری اور کراہتی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے مظالم کو بھی بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جس طرح منشی پریم چند نے ہندوستان کے گاؤں کی حالتِ زار کا نقشہ اپنے ناولوں میں کھینچنے کی کوشش کی ہے بالکل اسی طرح عمر مجید نے اس ناول میں گاؤں کی زندگی اور یہاں کے لوگوں کے مسائل کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ناول پر منشی پریم چند کا اثر واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان کے ساتھ عارضی الحاق کے بعد کشمیر ایک عرصے تک چک داری اور جاگیرداری کے شکنجوں میں پھنسا رہا۔ غریب لوگ اور غریب ہوتے گئے۔ امیر اور امیر بنتے گئے۔ گاؤں اور دیہاتوں کے غریب عوام ساہکاروں اور سرمایہ داروں سے اپنے کھیتوں کے لیے قرض لیتے تھے۔ سرمایہ دار اور ساہکار انہیں اس قرض کی چکی سے کبھی آزاد نہیں کرتے تھے۔ وہ سود در سود کا وہ چکر چلاتے تھے کہ کئی پشتوں تک وہ قرض کی ادائیگی سے قاصر رہتے تھے۔ اس قرض کی ادائیگی کی خاطر باپ اپنی بیٹی، بھائی اپنی بہن اور شوہر اپنی بیوی کو سرمایہ داروں اور ساہکاروں کے حوالے کر دیتے تھے۔ پریم چند اور دوسرے ناول نگاروں نے بھی کسانوں کے ان مسائل کو اپنے ناولوں اور افسانوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

عمر مجید کا ناول ''یہ بستی یہ لوگ'' اول سے آخر تک ظلم و جبر، جنسی استحصال، لوٹ کھسوٹ جیسے مسائل پر مبنی ہے۔ ناول کی کہانی جنوبی کشمیر کے قصبے اسلام آباد اور اس کے قریب ایک گاؤں جلنور کے پس منظر میں بیان کی گئی ہے۔ قصبہ اسلام آباد ناول میں شہری زندگی کی علامت ہے۔ یہاں بجلی کی

روشنی، پختہ روڑ، بڑے اور عالیشان مکانات، بڑے بڑے ہوٹل، گاڑیاں، موٹر کاریں اور کارخانے ملتے ہیں۔ یہاں پر زندگی کی چکا چوند نظر آتی ہے۔ نصف رات تک بازار کھلے رہتے ہیں اور کاروبار ہوتا رہتا ہے۔ یہاں پر لوگوں کے پاس فرصت کے لمحات میسر نہیں۔ اس کے علاوہ یہاں رات کی تاریکی میں کالے کرتوت بھی انجام دیئے جاتے ہیں۔ شراب، شباب اور کباب کی محفلیں بھی چلتی رہتی ہیں۔ گاؤں اور دیہات سے لائی گئی لڑکیوں اور دوشیزاؤں کے جسم بھی بکتے ہیں۔ یہاں کے امیر لوگ ان پر بولی بھی لگاتے ہیں۔ جو سیٹھ یا جاگیر دار زیادہ پیسے خرچ کرتا ہے گاؤں کی خوبصورت ترین لڑکی کچھ راتوں کے لیے اس کی دل بہلاتی اور لذت کا سامان فراہم کرتی ہے۔ اس طرح اسلام آباد کا نقشہ پیش کر کے ناول نگار نے کشمیر کے تمام ترقی یافتہ قصبوں کی ترجمانی کی ہے۔

اس کے برعکس جلنور گاؤں ریاست کے تمام گاؤں اور دیہاتوں کی علامت ہے۔ جلنور گاؤں کی زندگی تمام دیہاتوں کی حالت زار کی تصویر پیش کرتی ہے۔ یہاں کی تصویر کشی کر کے ناول نگار نے گویا تمام دیہاتوں کا نقشہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ راستے کچے ہیں، ٹانگوں اور بیل گاڑیوں کا استعمال کیا جاتا ہے، گاؤں کے تمام لوگ کاشت کاری کرتے ہیں، مکان کچے ہیں، ان کے کپڑے گندے ہیں اور کھیتوں میں کام کرتے کرتے ان کے چہرے کا رنگ تک اڑ گیا ہے۔ کافی محنت کرنے کے باوجود بھی ان کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ وہ قرضے میں ڈوبے ہوئے ہیں، عورتیں کھیتوں میں اپنے مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں اور وہ اپنے بچوں کو بھی کھیتوں میں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ گویا ناول نگار نے گاؤں کی زندگی کی ایسی منظر کشی کی ہے کہ پورا گاؤں ہماری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے:

''وہ جس گاؤں میں رہتے تھے۔ اس کا نام جلنور تھا۔ جلنور کے سب ہی مکان

کچے تھے۔شام ہوتے ہی گاؤں سنسان ہوجاتا تھا اور مٹی کے چراغوں کی دھیمی اور لرزاتی ہوئی روشنی اس طرح دکھائی دیتی جیسے کسی دبیز سیاہ کمبل پر چند جگنو رینگ رہے ہوں۔'' ۴۹ے

ناول کی کہانی سارہ اور نذیر کے گرد گھومتی ہے۔ سارہ عبداللہ نامی مزدور کی خوبصورت مگر بدقسمت لڑکی ہے۔ جوان ہونے پر اس کی شادی شہر کے ایک بزرگ حاجی صاحب سے اس لیے کرائی جاتی ہے کہ سارہ کا باپ اس کا قرض دار تھا۔ گویا قرض چکانے کے لیے وہ سارہ کو ایک بوڑھے لیکن امیر شخص کے حوالے کرتا ہے۔ یہاں پر ناول نگار نے گاؤں کی زندگی کی ایسی تصویر پیش کی ہے کہ رونگٹھے کھڑے ہوجاتے ہیں:

''اس نے حاجی صاحب سے تب قرض لیا تھا جب اس کی بیمار بیوی سارہ کو جنم دے رہی تھی اور تب بھی جب وہ سارہ کو جنم دیتے ہی مرگئی تھی۔اس نے حاجی صاحب سے جتنے روپے لئے تھے۔اتنی ہی اس نے سفید دیوار پر کالی لکیریں بنائی تھیں۔وہ کئی بار ان لکیروں کو گن چکا تھا اور ہر بار وہ چار سو پانچ نکلتی۔ایک مرتبہ حاجی صاحب خود عبداللہ کے گھر آئے کیونکہ وہ اپنے منشی سے سن چکے تھے کہ عبداللہ کھیت مزدور کے گھر میں ایک خوبصورت ہیرا چمک رہا ہے۔دوسری بار وہ دولہا بن کے عبداللہ کے گھر میں داخل ہوا۔حاجی صاحب دو مرتبہ حج کر چکے تھے اور ان کے گھر میں پہلے ہی سے تین عدد بیویاں تھیں۔سارہ اس شام کو بہت روئی تھی کیونکہ اس کے وہ سارے سپنے ٹوٹ چکے تھے جو وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ دیکھا کرتی تھی۔'' ۵۰ے

سارہ کی شادی کے بعد حاجی صاحب ایک سال ہی زندہ رہے۔ یہاں سے سارہ کی مشکلات کا آغاز ہوتا ہے۔ بوڑھے شوہر کی موت کے بعد اس کا اکلوتا بیٹا اکرم یہ دیکھ کر خوش ہوجاتا ہے کہ ان کے باپ نے کافی دولت کے علاوہ ایک خوبصورت اور جوان بیوہ بھی چھوڑی ہے لیکن یہاں پر حاجی کا

ٹانگے چلانے والا مزدور گل محمد سارہ کو وہاں سے بھگا کر اپنے ساتھ جلنور گاؤں لے آتا ہے۔ یہاں وہ دونوں شادی کر کے بہت ساری مصیبتوں کے باوجود آخری دم تک ایک ساتھ رہتے ہیں۔

نذیر سارہ کا بیٹا ہے۔ وہ کشمیر کے ایسے نوجوانوں کی نمائندگی کرتا ہے جو گاؤں میں پیدا ہونے کے باوجود تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ نذیر نے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا ہے۔ لیکن اسے نوکری ڈھونڈنے میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نذیر اپنی ماں سارہ اور بہن آمنہ کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ اپنے گھر اور اپنی بہن کی عزت کی خاطر اپنی محبت کو قربان کر دیتا ہے۔ وہ اس لیے جیل میں تیرہ سال بند رہتا کہ اس کے ہاتھوں سے اکبر کا قتل ہو جاتا ہے۔

ناول میں اکبر کہانی کی جان ہے۔ وہ ناول میں بطورِ ولن دکھایا گیا ہے۔ اس میں وہ تمام برائیاں موجود ہیں جو ایک ویلن میں ہونی چاہیے۔ لیکن کہیں کہیں پر وہ بہت ہی لالچی اور دل دہلانے والا بھی دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنی بہن زینب اور گاؤں کی دوسری لڑکیوں کو شہر لے جا کر بڑے جاگیرداوروں اور سرمایہ داروں کے حوالے کرتا ہے۔ اکبر کے مزاج میں یہ کج روی بچپن ہی سے ہے۔ ماں کی موت کے بعد اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں نے اکبر اور اس کی بہن زینب کو کبھی بھی اپنی اولاد نہیں سمجھا۔ ہمیشہ مار کھانے اور محبت سے محرومی کی وجہ سے نذیر کے کردار میں کج روی آ جاتی ہے۔ جب اس کا باپ اسے گھر سے نکال دیتا ہے تو وہ شہر کی راہ لیتا ہے اور شہر میں وہ خطرناک کارنامے انجام دیتا ہے۔

گو ہم کہہ سکتے ہیں کہ عمر مجید کے اس ناول کی کہانی میں معاشرے کے تمام مسائل زیرِ بحث آئے ہیں۔ کہانی کا ہر واقعہ معاشرے کے اصل چہرے سے پردہ ہٹاتا ہے۔ ناول کے پلاٹ کی ترتیب میں ناول نگار نے کافی محنت سے کام لیا ہے۔ ابتدا سے عروج تک ناول قاری کو اپنی گرفت

میں رکھتا ہے۔ ہر ایک واقعے کے ساتھ تجسس بڑھتا ہے۔

ناول کی پوری کہانی شعور کی رو تکنیک میں بیان کی گئی ہے۔ نذیر جب تیرہ سال کا ہوتا ہے تو اس کے ذہن میں اس کا ماضی گھوم جاتا ہے۔ وہ اپنے گھر، گاؤں، ماں، بہن کے بارے میں سوچتے سوچتے اپنے ماضی کی بازیافت کرتا ہے اور ناول آگے بڑھتا ہے۔ شعور کی رو تکنیک کا استعمال اردو کے کئی ناول نگاروں نے بڑی ہی خوبصورتی سے کیا ہے۔ اس سلسلے میں اولیت سجاد ظہیر کو حاصل ہے۔ قرۃالعین حیدر نے اس تکنیک کو اپنے ناول 'آگ کا دریا' میں بڑی کامیابی سے بھرتا ہے۔ ریاست میں کئی ناول نگاروں نے اس تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں عمر مجید کا یہ ناول کافی اہمیت کا حامل ہے۔ عمر مجید نے بڑی خوبصورتی سے اس تکنیک کو اس ناول میں برتا ہے۔ زبان و بیان کی دلکشی اور مکالمہ و مناظر کی پیش کشی میں بھی ناول نگار کا کمال نظر آتا ہے۔ غرض عمر مجید ۱۹۶۰ء کے بعد لکھنے والوں میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد کشمیر میں لکھے جانے والے ناولوں میں ترقی پسند تحریک کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے اور عصر حاضر کی تحریکوں کا اثر بھی نظر آتا ہے۔ چند ناولوں میں پریم چند کی طرح دیہاتی زندگی، کسانوں، مزدوروں اور غریب و مفلس عوام کا جاگیردار طبقے کے ہاتھوں استحصال اور سماجی نابرابری جیسے مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں۔ اسکے علاوہ کشمیر کے عوام کی معاشی، سماجی و تہذیبی و سیاسی مسائل پر بھی بعض ناول لکھے گئے ہیں۔ اس عہد میں نہ صرف موضوعات کی سطح پر نئے مسائل ملتے ہیں بلکہ تکنیک کے اعتبار سے بھی نئے تجربے ہوئے خصوصاً شعور کی رو کی تکنیک سے بھی کام لیا گیا ہے۔ زبان و بیان کی دلکشی، مکالموں کی چستی اور عمدہ منظرکشی کی بدولت اس عہد کے ناول فنی لحاظ سے کامیاب نظر آتے ہیں۔ بعض ناولوں میں فنی اعتبار سے خامیاں بھی در آئی ہیں مثلاً بے جا طوالت اور

غیر ضروری قصہ گوئی کی بدولت داستانی رنگ غالب آ گیا ہے جسکی وجہ فنی اعتبار سے کمزوری نظر آتی ہے۔غرض ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء کے دوران جو ناول لکھے گئے ہیں ان میں اپنے عہد کے مسائل کی بڑی حد تک کامیاب عکاسی کی بھر پور کوشش نظر آتی ہے۔ یہ ناول دلچسپ بھی ہیں اور متاثر کن بھی اور تکنیکی اعتبار سے بھی تجربے کرنے کی کوشش ملتی ہے۔

حوالے:

۱: غبارِ کاروان، ماہنامہ آج کل، فروری ۱۹۷۲ء، ص ۱۲
۲: جان محمد آزاد، ریاست جموں و کشمیر کے اردو مصنفین، ص ۹۷
۳: شاید ہے تیری آرزو، علی محمد لون، ص ۲۵۴
۴: وجے سوری، ایک ناؤ کاغذ کی، ص ۱۳
۵: ایضاً، ص ۱۶
۶: ایضاً، ص ۲۰
۷: ایضاً، ص ۴۷
۸: غلام رسول سنتوش، میں ور میرا تخلیقی سفر، ص ۲۳۰
۹: غلام رسول سنتوش، سمندر پیاسا ہے، ص ۹
۱۰: ایضاً، ص ۳۲۷
۱۱: ایضاً، ص ۱۵
۱۲: فاروق نازکی، دھنک یادوں کی، ص ۷۷
۱۳: غلام رسول سنتوش، سمندر پیاسا ہے، ص ۱۳
۱۴: جان محمد آزاد، وادیاں بلا رہی ہیں، پیش لفظ
۱۵: جاں محمد آزاد، کشمیر جاگ اٹھا، ص ۴۲
۱۶: ایضاً، ص ۶۲
۱۷: ایضاً، ص ۴۸
۱۸: ایضاً، ص ۱۰۰
۱۹: ایضاً، ص ۹
۲۰: ایضاً، ص ۱۰
۲۱: ایضاً، ص ۱۵
۲۲: ایضاً، ص ۱۲، ۱۳
۲۳: جان محمد آزاد، برفیلے لمحوں کا جنگل، ص ۹۵
۲۴: عبد الغنی شیخ، وہ زمانہ، ص ۳
۲۵: جان محمد آزاد، ریاست جموں و کشمیر کے اردو مصنفین، ص ۲۶۸
۲۶: شبنم قیوم، ایک حقیقت پسند فنکار، جرأت مند قلمکار۔ بحوالہ، نثار راہی بھوپال ص ۱۳
۲۷: یہ کس کا لہو کون مرا، شبنم قیوم، ص ۹
۲۸: شبنم قیوم، چراغ کا اندھیرا، ص ۴۷
۲۹: ایضاً، ص ۵۰
۳۰: ایضاً، ص ۸۱

۳۱: شبنم قیوم، ایک حقیقت پسند فنکار، جرأت مند قلمکار۔ بحوالہ، نثار راہی بھوپال ص ۱۶
۳۲: شبنم قیوم، یہ کس کا لہو ہے، یہ کون مرا، ص ۷
۳۳: ایضاً، ص ۴
۳۴: جان محمد آزاد، ریاست جموں و کشمیر کے اردو مصنفین، ص ۲۶۷
۳۵: شبنم قیوم، یہ کس کا لہو ہے، یہ کون مرا، ص ۱۶
۳۶: ایضاً، ص ۲۴
۳۷: ایضاً، ص ۱۶۰
۳۸: نور شاہ، پائل کے زخم، ص ۳۵
۳۹: ایضاً، ص ۳۶
۴۰: ایضاً، ص ۶۵
۴۱: ایضاً، ص ۸۹
۴۲: ایضاً، ص ۵۸
۴۳: زینت فردوس، نئی سحر، ص ۷
۴۴: ایضاً، ص ۵۷
۴۵: ایضاً، ص ۴۵
۴۶: ایضاً، ص ۱۴۵
۴۷: جان محمد آزاد، ریاست جموں و کشمیر کے اردو مصنفین، ص ۳۳۵
۴۸: ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب کے پچاس سال، شیرازہ، ص ۲۷۶
۴۹: عمر مجید، یہ بستی یہ لوگ، ص ۹
۵۰:: عمر مجید، یہ بستی یہ لوگ، ص ۲۱

باب پنجم

ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول:

۱۹۸۰ء تاحال

ریاست جموں وکشمیر کی تاریخ میں ۱۹۸۰ء کے بعد کا دور سیاسی طور پر کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس دور میں ریاست میں کئی اہم تبدیلیاں ہوئی۔ ۱۹۶۰ء کے بعد کچھ مدت کے لیے جو امن وامان کا دور قائم ہوا تھا۔ وہ سراب نظر آنے لگا۔ ہندوستان کی حکومت نے کشمیری عوام کو دبانے کی کوشش کی۔ یہاں کی سیاست میں دخل اندازی کر کے نوجوانوں کو عسکریت پسند بنانے پر مجبور کیا۔ ۱۹۸۹ء میں ریاست میں اس وقت مسلح تحریک شروع ہوئی جب انتخابات میں دھاندلی کی گئی۔ ایسی صورت حال میں یہاں کی نوجوان نسل نے مسلح تحریک شروع کی جو ابھی تک جاری ہے۔

اس تناضر میں ۱۹۸۰ء کے بعد سے ریاست میں نئے مسائل اور مشکلات نے سر اٹھایا۔ یہاں کی عوام دن رات مشکلات میں گھری رہی۔ افراد، خاندان اور سماج کا شیرازہ پوری طرح بکھر گیا۔ یہاں کے ادیب اور فنکار بھی ظلم و جبر کو دیکھتے رہے اور اکثر تو خود بھی اس کا شکار بنے۔ ان حالات و واقعات کا ادب کی ہر صنف پر اثر انداز ہونا لازمی تھا۔ اس دور میں لکھے جانے ناولوں میں ان سیاسی و سماجی حالات کو موضوع بنایا گیا۔

کئی فنکاروں نے ہندوستان اور پاکستان کی سازشوں میں گھرے کشمیر کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ مسلح تحریک اور ہندوستان کی فوج کشی کی وجہ سے کشمیر میدان جنگ میں تبدیل ہوا۔ اس دور کے ناولوں میں کشمیر کی روح اور منہ بولتی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس دور کے

اکثر ناول نیم سیاسی و تاریخی ہے۔ان میں ایسے تاریخی واقعات بیان کئے گئے ہیں جو کشمیر کی تاریخ میں کافی اہمیت کے حامل ہیں۔

تاریخی و سیاسی موضوعات کے ساتھ ہی یہ بات بھی کافی اہمیت کی حامل ہے کہ اس دور کے ناولوں میں نئی نئی تکنیکوں کا استعمال کیا گیا۔شعور کی رو کے ساتھ ساتھ علامتی ناول بھی لکھے گئے۔بیانیہ کی تکنیک میں بھی کئی اہم ناول لکھے گئے۔اس دور کے ناول فنی نقطہ نظر سے بھی کافی اہمیت کے حامل ہیں۔اس دور کے ناول واقعہ نگاری، پلاٹ، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ یہاں کے ناول نگاروں کے حوالے سے جائزہ لیتے ہوئے ۱۹۸۰ء کے بعد منظر عام پر آنے والے اہم ناولوں کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا جارہا ہے۔

جیوتیشور پتھک

۱۹۸۰ء کے بعد کے ناول نگاروں میں کئی اہم نام آتے ہیں جن کی گونج ریاست جموں و کشمیر کی ادبی دنیا میں بالخصوص اور اردو کی ادبی دنیا میں بالعموم سنائی دیتی ہے۔ایسے فنکاروں میں جوتیشور پتھک کا نام بھی آتا ہے جنھوں نے اپنی قابلیت اور ادبی شغف کی وجہ سے یہاں کی ادبی دنیا میں اپنی ایک الگ پہچان بنالی۔

جوتیشور پتھک کا اصلی نام جیوتی پرکاش گنڈوترہ ہے۔ان کی ولادت ۱۸/اکتوبر ۱۹۴۰ء کو ریاست کے گرمائی صوبے جموں میں ہوئی۔انگریزی ادب میں ایم۔اے کرنے کے بعد ریاستی محکمہ اطلاعات میں ملازم ہوگئے۔اردو زبان وادب سے انھیں کافی دلچسپی تھی۔چنانچہ ۱۹۸۰ء کے بعد منظر عام پر آنے والے افسانہ نگاروں میں ان کا نام منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ان کے ابتدائی افسانوں

میں ''ٹوٹے رشتوں کا روگ'' اور ''اپنے گھاؤ کا درد'' شامل ہیں۔ جوتیشور پتھک کی ان ابتدائی کہانیوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ محنت کش طبقے کی جدوجہد کے حامی ہیں۔انہوں نے اپنی کہانیوں میں انسان کی کھوکھلی اور بے کیف زندگی کوموضوع بنایا ہے جس کی وجہ سے ان کی کہانیاں ملک کے معتبر اور ممتاز رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔

جوتیشور پتھک نے نہ صرف افسانہ لکھ کر ادبی دنیا میں اپنی ایک پہچان اور شخصیت بنالی بلکہ فکشن سے ان کی دلچسپی اور وابستگی نے ان سے کہیں ایک ناول بھی لکھوائے اور اب تک ان کے دو ناول ''ہجوم'' (۱۹۸۴ء) اور ''میلی عورت'' (۱۹۸۶ء) منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

''ہجوم'' جوتیشور پتھک کا پہلا ناول ہے۔اس ناول عنوان ہی سے ناول کے موضوع کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ۱۹۸۵ء میں پہلی بار شائع ہونے والے اس ناول نے نہ صرف ریاست بلکہ ریاست کے باہر کے ناقدین کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ جے۔کے پبلی کیشنز کے زیرِ اہتمام شائع شدہ یہ ناول تشدد کے رجحانات کا پیش بین بن کر نئی نسل کے مسائل کا جرات مندانہ تجزیہ پیش کرتا ہے۔نوجوان نسل میں تشدد کے رجحان کا نفسیاتی جائزہ اس ناول میں پیش کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ اس ناول میں سیاست دانوں کا نئی نسل کے ساتھ استحصال کو ناول میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔نوجوان اور معصوم لوگوں کو سیاست کے دلدل میں کس طرح پھنسانے کی مذموم کوشش ہوتی ہے، ناول میں اس طرف بھی خوب اشارے کئے گئے ہیں۔ مدھوکر اور سادھنا کردارنگاری کی اچھی مثالیں پیش کرتے ہیں۔مصنف نے ان کی ذہنی کشمکش کا گہرا ادراک کر کے انہیں نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

ناول میں دیواکر اور سادھنا کے ذریعہ ناول نگار نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح

سے کسی معمولی مسئلے کو لے کر سیاست دان معصوم اور ہونہار طالب علموں کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ناول کے پس منظر ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سیاست دان اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ اگر چہ یہ ناول ۱۹۸۴ء میں لکھا گیا ہے لیکن ۲۰۱۶ میں بھی ایسے واقعات رونما ہو رہے ہیں جہاں یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم طالبِ علموں کو سیاسی پارٹیاں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ ملک بھر کی یونیورسٹیوں میں افراتفری کا جو ماحول ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ملکی سیاست یہاں پر بھی کام کر رہی ہے۔

دیوا کر اور سادھنا سٹوڈنٹ پولیٹکس میں کافی دلچسپی لیتے ہیں اور ان کی اپنی یونین میں بھی ان ایک الگ پہچان اور شناخت ہے۔ یونیورسٹی میں ان کی ہر بات مانی جاتی ہے اور ان کے ہر فیصلے کو سر آنکھوں پہ بٹھایا جاتا ہے۔ لیکن ریاست جموں و کشمیر کے سیاست دان ان کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ دراصل سرکار نے بسوں کے کرائے بڑھانے کا اعلان کیا تھا۔ نوجوانوں میں اس کا شدید ردِعمل ظاہر ہونا شروع ہوتا ہے۔ عام مسافروں سے زیادہ اسکول اور کالج کے طلبا اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ بسوں کو روکنا، پتھراؤ کرنا معمول بن جاتا ہے۔ اگر چہ حکومت نے احتجاجی طلباء کو کچھ رعایت دینے کے ساتھ ہی اندولن کو ختم کیا تھا لیکن اس کے باوجود کچھ طاقتیں ایسی ہیں جو یہ نہیں چاہتی کہ امن قائم ہو۔ لیکن اسی دوران عید کے روز گائے کی قربانی سے حالات اور بھی خراب ہوتے جاتے ہیں۔

ناول کی شروعات ہی ایک نعرے لگاتے ہوئے ہجوم سے ہوتی ہے اور پولیس ہجوم کو روکنے کے لئے طاقت کا استعمال کرتی ہے اور یوں پورا بازار ایک میدانِ جنگ کا منظر پیش کر رہا ہے۔ نوجوان پولیس پر پتھر پھینکتے ہیں اور پولیس ٹیر گیس کے گولے داغتی ہے۔

اس دوران سودا کر کو پولیس گرفتار کر لیتی ہے اور کسی نامعلوم جیل میں ڈال دیتی ہے۔جیل سے رہائی کے بعد الیکشن کا وقت ہوتا ہے۔سودا کر کے پاس کئی ایک سیاسی کارکن آتے ہیں اور اسے خریدنا چاہتے ہیں تا کہ اس کے چاہنے والے اس کو ووٹ دیں اور پارٹی کو کامیابی مل جائے۔اس کے لئے اسے کافی پیسے کی لالچ بھی دی جاتی ہے۔لیکن اس سودے بازی سے وہ مائل نہیں ہوتا۔اس کی آنکھوں سے پردے ہٹ جاتے ہیں۔اس کے سامنے سیاست دانوں کی اصلی شکلیں آتی ہیں۔کل تک جو سیاست دان اسے اندولن جاری رکھنے اور حمایت دینے کا وعدہ کرتے تھے آج وہی اسے خریدنا چاہتے تھے۔ ناول سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے جہاں سیاست دانوں کا نوجوانوں کو ورغلانے اور ان کا استحصال کرنے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

''بہت دیر تک ملک کی سیاست پر رائے زنی ہوتی رہی اور ملک کے مستقبل کے بارے میں تبادلہ خیال ہوتا رہا۔مگر رفتہ رفتہ بات چیت کا سلسلہ آنے والے انتخابات کی طرف سرک رہا تھا۔

'اس بار انتخابات کا رخ مسٹر دیوا کر کی یونین کے رویئے پر منحصر ہے' کسی نے کہا۔

'مگر ہماری یونین تو صرف طلبا کے مطالبات اور ان کے مسائل تک ہی محدود ہے۔ہمیں سیاست سے کوئی واسطہ نہیں' دیوا کر نے واضح کیا۔

'تم نادان ہو مسٹر دیوا کر' ایک ادھیڑ عمر شخص نے کہنا شروع کیا۔

'تم ایک کامیاب لیڈر رہو۔تمہارے پاس ورکروں کا ایک کارڈ ہے۔تم جو چاہو کر سکتے ہو۔جس طرف تمہارے لڑکوں کی جماعت ہوگی وہ جیت جائے گا اور دوسرا پٹ جائے گا'

'مگر' دیوا کر نے کہنا شروع کیا۔مگر اسے درمیان میں ہی ٹوک دیا گیا۔

'مگر وگر کچھ نہیں۔ ہم تمہاری تمام ضروریات پورا کر سکتے ہیں۔تمہارے لڑکے کالج میں پڑھتے ہیں۔انہیں سنیما دیکھنے کے لئے پیسے درکار ہوتے ہیں۔شام کو ریسٹورنٹ میں جا کر چائے وغیرہ پینے کے لئے پیسوں کی ضرورت پڑتی ہے۔
'تمہیں ہم ایک ہزار روپیہ ماہانہ دے سکتے ہیں اور تمہارے لڑکوں کا خرچ الگ'
تیسرے آدمی نے پتہ پھینک دیا۔
'مگر اتنا سارا روپیہ آتا کہاں سے ہے' دیواکر نے تعجب کے ساتھ استفسار کیا۔
'تم رفتہ رفتہ سمجھ جاؤ گے۔ ابھی تم صرف اتنا سمجھو کہ ہم نہ صرف تمہاری جنرل سکریٹری کو الیکشن کا ٹکٹ دیں گے بلکہ سارے اخراجات بھی برداشت کریں گے۔'' [1]

پروفسر جودھامل مقامی کالج میں انگریزی کے لیکچرر ہیں اوران کی بیٹی سادھنا جو کہ ایم۔اے کی طالبہ ہے اس سٹوڈنٹس یونین کی جنرل سکریٹری چنی گئی اور یوں وہ اس ایجی ٹیشن کا حصہ ہے۔ وہ سماج کو بدلنے کے خواب دیکھتی ہے۔ان کے والد پروفیسر جودھامل اپنی بیٹی کی مقبولیت سے کافی خوش تھے لیکن سیاسی طور پر وہ اپنی بیٹی سے متفق نہیں تھے۔ سادھنا چاہتی ہے کہ وہ ایک عام سی عورت کی طرح زندگی نہیں جئے گی بلکہ آئندہ آنے والے اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لے گی۔لیکن اس کی اس آزاد خیالی سے اس کی ماں اور دوسرے رشتہ دار نالاں ہے۔ سادھنا اپنی اور اپنے رشتہ داروں کے خیالات کو دقیانوسی سمجھتی ہے جو ایک عورت کو چاردیواری میں رکھنے کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں۔

دیواکر ایک مقبول اسٹوڈنٹ لیڈر ہے جس کو پولیس نے جیل میں ڈال دیا تھا اور اب کی رہائی ہو رہی ہے۔ یہ سماج کو بدلنے کا متمنی ہے۔اس سماج کو جہاں غریب اور کمزور انسانوں کا استحصال ہوتا ہے۔ دیواکر اور سادھنا کافی دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ سیاسی حالات پر تبصرہ کرتے رہتے ہیں اور یوں وہ ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔ سادھنا اس کے خیالات سے کافی متاثر ہوتی ہے

اور ہر حال میں اس کا ساتھ دینا چاہتی ہے۔ دوسری طرف دیوا کر بھی سادھنا کی سیاسی بصیرت سے کافی متاثر ہوتا ہے۔ اس طرح سادھنا اور دیوا کر نہ صرف ذہنی بلکہ جذباتی طور پر بھی ایک دوسرے کے قریب آتے جاتے ہیں لیکن ان کی قربت کو شکوک کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ یونیورسٹی میں کئی طلبا ایسے ہیں جو سیاست کو دھوکہ سمجھتے ہیں۔ ان میں ایک لڑکی ڈالی شرما بھی شامل ہے۔ یہ ایک امیر باپ کی لڑکی ہے۔ وہ زندگی کی رونقوں میں یقین رکھتی ہے۔ وہ ایک جدید لڑکی ہونے کے باوجود فضول مشغلوں سے دور رہتی ہے۔ ڈالی کو سادھنا اور دیوا کر کی سیاسی زندگی بالکل پسند نہیں آتی۔ وہ سادھنا کی ایک اچھی دوست ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ وہ گھنٹوں بیٹھ کر مختلف معاملات میں تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔

سادھنا کی اسٹوڈنٹس پولیٹکس میں دیوانگی کی حد تک کی وابستگی اور دیوا کر سے متعلق افواہوں کو دیکھتے ہوئے ان کی ماں انہیں دہلی بھیجنا چاہتی ہے تا کہ وہ پولیس کے تشدد سے محفوظ رہ سکیں اور بدنامی سے بھی۔ اسی دوران حکومت طلباء کے لیڈروں کے ساتھ بات چیت کرنا چاہتی ہے۔ لیکن وہ دیوا کر کے اس فیصلے کی خلاف ہے۔ وہ کسی بھی سودے بازی کے حق میں نہیں ہے۔ دیوا کر کا خیال تھا کہ اگر حکومت ان کے مطالبات کو تسلیم کرنا چاہتی ہے تو اس کو واضح طور پر اعلان کر دینا چاہیے۔ لیکن دوسری طرف سادھنا دیوا کر کے اس سخت رویہ سے ناراض ہوتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ حکومت کو اپنے مطالبات کا قائل کرنا چاہیے۔ لیکن یونین کے اکثر ممبر حکومت کے ساتھ بات چیت کے حق میں ہیں اور ایک وفد تشکیل دیا جاتا ہے جس کی رہنمائی سادھنا کے سپرد کی جاتی ہے۔ ایجوکیشن منسٹر سے میٹنگ کے بعد سادھنا اور دوسرے ساتھیوں کو یقین تھا کہ ان کے مطالبات پورے کئے جائیں گے۔ سادھنا نے نہایت چابکدستی اور خوش اسلوبی کے ساتھ میٹنگ کی سربراہی کی اور اہم نکتوں کو لیڈروں کے

سامنے رکھا۔

اسی دوران سادھنا دیواکر کے سامنے اپنی محبت کا اظہار کرتی ہے لیکن دیواکر اس بات سے چونک جاتا ہے۔ وہ سادھنا سے کہتا ہے کہ اس نے کبھی اسے ایسے روپ میں دیکھا ہے۔ سادھنا مایوس ہو جاتی ہے اور کہیں خیالات اس کے ذہن میں جنم لینے لگتے ہیں جیسے کہ وہ یونین کے عہدے سے استعفیٰ دے دے۔ وہ دیواکر کو ایک سنگ دل تصور کرنے لگی۔ حکومت کے ساتھ میٹنگ کا کوئی خاص ردعمل حکومت کی طرف سے سامنے نہیں آیا اور اسی دوران سادھن کچھ دنوں کے لیے دہلی چلی جاتی ہے۔ دیواکر کو احساس ہوتا ہے کہ اس نے سادھنا کے دل کو ٹھیس پہنچائی ہے لیکن دوسری طرف وہ مطمئن بھی ہے کہ اس نے سادھنا کو کسی دھوکے میں نہیں رکھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سادھنا اپنے مستقبل کی طرف زیادہ توجہ دے جو کافی روشن ہے۔

ناول کے اختتام تک دیواکر کی آنکھوں پر سے پردے ہٹ جاتے ہیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کی ساری جدوجہد جو اس نے عوامی ناانصافیوں کی خلاف کی تھی، جو درنے اور ہڑتالیں اس نے کرائی تھی اس سے کوئی بھی فائدہ عوام کو نہیں ملا۔ فائدہ اگر ملا بھی تو سیاست دانوں کو۔ ناول سے ایک اقتباس:

''دیواکر بالکنی میں بیٹھ کر سڑک پر دوڑتی ہوئی گاڑیوں کے ہجوم کو دیکھ رہا تھا۔ یہ تمام گاڑیاں اپنی اپنی منزل کی طرف تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھیں۔ مگر دیواکر کے ذہن میں ایک عجیب مدو جزر موجزن تھا۔ اس کی منزل کیا ہے؟ اس نے آج تک کس مقصد کے لئے جدو جہد کی۔ ملک کی سیاست اس وقت کس سمت میں جارہی ہے۔ کیا خیالات و جذبات کی کوئی قدر نہیں۔ جو لوگ کل تک علاقائی امتیازات کے نعرے لگاتے نہیں تھکتے تھے اب کسی ہجوم میں کھو گئے۔ کیا انہیں

اپنی منزل مل گئی؟
لوگوں کے اندر ایک آگ جلا کر انہیں جلنے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ کیا کمیشن کا
فیصلہ ان کے غموں کا مداوا تھا۔ اگر تحقیقاتی کمیشن کشمیر کے عوام کے دکھوں کا مداوا
ہوتا تو وادیٔ کشمیر کے لوگ خوشحال ہوگئے ہوتے۔'' ۲

مختصر یہ کہ ناول ''ہجوم'' اپنے مواد اور موضوع کے لحاظ سے ایک اہم ناول ہے۔ ناول کی زبان صاف اور شستہ ہے۔ دیوا کر کا کردار جاندار اور متحرک ہے۔ ناول کے دیگر کردار بھی انفرادیت رکھتے ہیں۔ غرض ناول میں کردار نگاری کے اچھے نمونے مل جاتے ہیں۔ منظر نگاری کی بھی عمدہ مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ پلاٹ سادہ اور اکہرا ہے۔ ناول میں کہیں پر کوئی جھول نظر نہیں آتا۔

''میلی عورت'' جیوتیشور پتھک کا دوسرا ناول ہے۔ یہ ناول جے۔ کے بک ہاؤس کی وساطت سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول مصنف کے بقول 'کانچ کے رقیب' کے عنوان سے اخبار میں سلسلہ وار شائع ہوا تھا۔ بعد میں یہ کتابی صورت میں شائع ہوا۔

ناول کا موضوع سماجی قدروں کی پامالی ہے۔ ہمارے سماج میں روز بہ روز خود غرضی، موقع پرستی اور بناوٹ میں اضافہ ہو رہا ہے۔ سائنس دان زمین کی حدود سے پار چاند تاروں اور سیاروں پر کمند ڈال رہے ہیں مگر آج کے انسان کا وجود اتنا ہی سکڑ کر محدود ہوتا جا رہا ہے۔ اپنی غرض پوری کرنے کیلئے انسان کو اخلاق کی پروا ہے نہ رشتوں کی۔ اپنی ترقی کے لئے خواہ اسے کسی کے پیٹ پر پاؤں رکھ کر ہی کیوں نہ گزرنا پڑے۔ آج کے ماحول کا آدمی اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کچھ بھی کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ خون کے رشتے محض رسمی بن کر رہ گئے ہیں۔

یہ ناول ایک دیہاتی لڑکی کی زندگی کا المیہ ہے جسے تقدیر دہلی کی بارونق فضا میں تو لے آتی ہے لیکن سکھ اور چین اسے کبھی میسر نہ ہو سکا۔ وہ ایک شہری سے شادی تو کر لیتی ہے لیکن سماج اسے وہ مقام

نہیں دیتا جس کی وہ مستحق ہے۔اس کے علاوہ ناول نگار نے سماج میں ٹوٹتی اور بکھرتی قدروں کی طرف اشارہ کیا ہے۔شہروں کے ساتھ ساتھ گاؤں دیہات کے لوگ بھی اب موقع پرست اور خود غرض بنتے جارہے ہیں۔گاؤں دیہات کے لوگ جو سادہ لوح، مہمان نواز، پیار ومحبت کے جذبات سے لبریز ہوتے تھے اب وہ قصہ پارینہ بن چکا ہے۔اب یہاں کی زندگی بھی شہری زندگی کی طرح کافی حد تک بدل رہی ہے۔

ناول کی کہانی چندن کے ارد گرد گھومتی ہے۔چندن ایک دیہاتی لڑکی ہے اور اس کے ماں باپ بھی دیہاتی ہے۔چندن کا باپ منشی دھیان چند سلاسل پروجیکٹ پر ایک ٹھیکدار ہے اور روپۓ پیسے کے معاملے میں بڑا کنجوس ہے۔وہ مزدورں کو اونے پونے پیسے دے کر کام پر لاتا ہے اور پھر بے ایمانی سے اپنے پیسے بناتا ہے۔وہ سمنٹ میں زیادہ ریت ملاتا ہے اور افسران کی آنکھوں میں دھول جھونک دیتا ہے۔لیکن دھیان چند کو اپنے گھر، اپنی بیوی بنتی اور اپنی بیٹی چندن سے کوئی رغبت نہیں ہے۔کبھی کھبار اپنے گھر آتا ہے اور دو تین ہزار روپۓ کی رقم دے جاتا ہے۔ایسے میں اس کی بیوی جنگل کے منیجر سے رشتہ قائم کر لیتی ہے اور یوں اس کا اثر براہِ راست چندن پر پڑتا ہے۔وہ ماں، باپ اور جنگلات کے ٹھیکیدار کے رشتوں کے درمیان لٹک سی گئی ہے۔

چندن اپنی چھوٹی عمر سے اپنی ماں اور باپ کے درمیان تلخیاں اور جھگڑے دیکھتی ہے۔وہ اپنی ماں بنتی کو جنگل کے منیجر کے قتل کے الزام میں قید ہوتے دیکھتی ہے اور اس کے باپ بھی اسے اپنے پاس رکھنے سے انکار کرتا ہے تو وہ راجن کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور وہاں شادی کرتے ہیں۔شادی کے بعد اور دہلی میں سکونت کے باوجود بھی اسے کوئی خاص راحت نہیں ملتی۔دہلی میں اس کا شوہر راجن اور سسر اس کی عصمت کا اپنے مقاصد کے لئے خوب سودہ کرتے ہیں۔دہلی میں چندن جدید

طرزِ تہذیب اور رہن سہن کو بھی قریب سے دیکھتی ہے۔ ان تمام حالات کا اثر اس پر پڑتا ہے۔

چندن کی ساس ایک جہاں دیدہ عورت ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ چندن راجن کی کامیابی کا راز بنے۔ وہ راجن کی کسی نمائش سے پہلے ہی چندن کو سمجھاتی کہ تم بڑے بڑے امیروں کے ساتھ میل ملاپ بڑھاؤ تاکہ وہ راجن کی طرف راغب ہوں۔ اس لئے چندن مجبوراً وہ سارے کام کرتی ہے جو اس کا شوہر، ساس اور سسر کروانے چاہتے ہیں۔ ناول نگار نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جب انسان اپنا نصب العین صرف روپیہ، پیسے اور شہرت کو قرار دیتا ہے تو اس سماج میں ایک انسان کی عزت کی کوئی وقعت نہیں رہتی۔ چندن کو اکثر اس ماحول میں رہنے کی وجہ سے گھٹن ہوتی۔ شراب پی کر بہک جانا اور پھر تاش کے پتوں پر جھگڑنا، یہ سب اسے فضول لغویات نظر آتے ہیں لیکن وہ یہ سب کرنے پر مجبور تھی۔ ناول سے ایک اقتباس:

> ''راجن آج رات واپس آیا تھا۔ ایک ماہ کی دوری کے بعد آج جب چندن اس سے ملی تو وہ سسک سسک کر روئی۔ راجن نے اسے اپنی باہوں میں کس لیا اور بہت دیر تک سینے سے لگا کر اس کے بالوں کو سہلاتا رہا۔
>
> 'راجن مجھے اس گہرے کنویں سے نکال لو؟'
>
> 'میں دلدل میں پھنس چکی ہوں'
>
> 'میں تمہاری بیوی بن کر رہنا چاہتی ہوں'
>
> 'مجھے ننگا نہ کرو، بھگوان کے لئے مجھے ننگا نہ کرو'
>
> رفتہ رفتہ راجن کی گرفت ڈھیلی ہوتی گئی۔ اس نے چندن کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور خود تکئے کا سہارا لے کر کچھ سوچنے میں محو ہو گیا۔'' ۳ٍ

چندن کی زندگی میں ایک مقام ایسا آتا ہے جب وہ سٹفن سے بھی رشتہ قائم کر لیتی ہے۔ سٹفن اس سے ہمدردی جتاتا ہے اور وہ چندن کو عارضی محبت کے چکر میں گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاتا

ہے اور آگے چل کر وہ بھی اس کا استعمال کرتا ہے۔ سٹفن کسی فیکٹری کے کاغذات پر دستخط لینے کے لئے اس کی عصمت داؤ پر لگاتا ہے اور یوں چندن کو یہاں پر بھی ناکامی اور دھوکہ دہی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ناول کے اختتام میں سٹفن پہلے چندن کے باپ کا قتل کرتا ہے کیونکہ وہ اس کا بزنس پاٹنر ہوتا ہے اور پھر چندن کے سسر کو بھی وہ موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ اور آخر میں چندن پہلے سٹفن کو گولی مار دیتی ہے اور اس کے بعد اپنے آپ کو۔ اس طرح یہ ناول ایک المیہ پر ختم ہوتا ہے:

> ''چندن نے بڑھ کر اسے ریوالور چھین لیا اور یکدم تین گولیاں چلا دیں۔ سٹفن کچھ دیر تک وہاں تڑپتا رہا اور پھر کروٹیں بدل کر برف کی سل کی طرح بے ساکت ہو گیا۔ گولیوں کی آواز دور تک سناٹے کو چیرتی ہوئی چلی گئی۔ چاروں طرف سے پولیس کے سپاہی دوڑنے لگے۔ مگر وہ ابھی پہلی منزل میں ہی پہنچے تھے کہ گولیوں کی آواز دوبارہ سنائی دی اور سپاہیوں نے فوراً پہنچ کر دیکھا کہ چندن کی کنپٹی سے خون بہہ رہا تھا اور وہ مچھلی کے طرح تڑپ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔'' [۴]

ناول ''میلی عورت'' کا مرکزی کردار چندن ہے۔ جو ناول میں پوری طرح چھائی ہوئی نظر آتی ہے لیکن ناول نگار نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کوئی بھی انسان میلا یا خراب نہیں ہوتا۔ اسے سماج خراب ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ چندن ایک دیہاتی لڑکی ہے جسے دہلی کے ایک نوجوان راجن سے محبت ہوتی ہے اور وہ راجن کے ساتھ اپنی تمام زندگی گزارنا چاہتی ہے لیکن دہلی میں اس دیہاتی لڑکی کو اعلیٰ سوسائٹی کے جھوٹے اقدار سکھائے جاتے ہیں اور نتیجہ میں اس میں وہ تمام برائیاں در آتی ہیں جن کا شہروں میں پایا جانا کوئی معیوب نہیں سمجھا جاتا جیسے شراب، رقص اور غیر مردوں کے ساتھ میل جھول بڑھانا وغیرہ۔ ناول میں کئی ایسے مواقع آتے ہیں جہاں پر چندن صرف اور صرف اپنے شوہر کی

ہو کے رہنا چاہتی ہے لیکن ایسے میں شوہر کی سرد مہری اسے اور بھی اندھیرے میں ڈھکیل دیتی ہے۔

ناول کا پلاٹ چست ہے۔ کہیں بھی کوئی واقعہ غیر ضروری نظر نہیں آتا۔ واقعات ایک کے بعد ایک بتدریج آگے بڑھتے ہیں۔ ناول میں پلاٹ کے علاوہ کردار نگاری کے بھی اچھے نمونے دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ چندن ناول کا مرکزی کردار ہے۔ ناول نگار نے جسے تراشنے میں خاصی محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ 'میری بات' میں ناول نگار اپنے مرکزی کردار چندن کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

> ''اس ناول کی مرکزی کردار چندن میرے ذہن کی اپج نہیں بلکہ وہ سادہ لوح عورت ہے جسے حالات نے جموں کے ایک دور دراز پہاڑی گاؤں سے دہلی کے کسی بارونق اور پرشور علاقے تک پہنچا دیا۔ ان حالات کے ایک مرحلے پر میری اس کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے جب پوچھا یہ سب کیا ہے؟ تو اس نے جواب ہوتا۔ 'کیا سب قصور عورت کا ہے؟ ان حالات کی شکار یہ عورت کیا واقعی میلی ہے؟ اس کا جواب تو قارئین ناول پڑھنے کے بعد ہی ڈھونڈ سکیں گے۔'' ۵

دراصل ناول پڑھنے کے بعد یہ احساس اچھی طرح ہو جاتا ہے کہ چندن کسی بھی صورت میں میلی نہیں ہے۔ وہ تو مردوں کے بنائے ہوئے اس نظام میں اس طرح پھنس جاتی ہے کہ باہر نکلنے کا کوئی راستہ اسے نظر نہیں آتا ہے جس کی وجہ سے وہ آخر میں اپنی جان لیتی ہے۔

یہ کردار ان عورتوں کی ترجمانی کرتا ہے جو پیدائشی شریف ہوتی ہیں لیکن سماج کے ظالم ہاتھ انہیں برائی کے دلدل میں پھنسا دیتے ہیں۔ چندن ایک گاؤں کی بھولی بھالی اور معصوم لڑکی جس نے سب کچھ اپنے شوہر کے نام ارپن کیا تھا۔ اسے اس نے ایک دیوتا مانا تھا۔ اس نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ

اس کے ساتھ اتنا بڑا دھوکہ بھی ہوسکتا ہے۔

ناول کا ایک اور اہم کردار راجن ہے جو دہلی میں ایک اچھے خاصے گھر کا چشم و چراغ ہے۔ دہلی میں ان کا کاروبار ہے۔مگر راجن کے خیالات اپنی ماں باپ سے نہیں ملتے تھے۔ وہ راجن کی اس بیباک زندگی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ راجن کاروبار میں دلچسپی لے۔لیکن راجن پر ان کی باتوں کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ وہ دور دراز کے علاقوں میں جا کر تصویریں بنایا کرتا ہے۔ جب اس کی تصویریں مکمل ہو جاتیں تو دہلی یا کسی دوسرے شہر میں جا کر ان کی نمائش کرتا۔ایسے میں ہی وہ جموں کے اس دور افتادہ پہاڑی گاؤں میں آجاتا ہے اور چندن کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ وہ اسے اپنا لیتا ہے اور اس سے شادی کر کے دہلی لے آتا ہے لیکن شادی کے بعد وہ شوہر کے منصب کو سنبھال نہیں پاتا اور اپنی بیوی کا استحصال اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا رہتا۔ایک پل کے لئے بھی اس کا خون نہیں کھولتا۔ناول میں کئی ایسے مواقع آتے ہیں جہاں پر چندن صرف اور صرف اس کی بیوی بن کر رہنا چاہتی ہے مگر راجن اس کو اس سارے گندے ماحول سے بچانے کی کوشش نہیں کرتا کیونکہ اسے اس بات کا اندازہ ہے کہ اگر اس نے مذاحمت کی تو اس کا باپ اسے گھر سے بے گھر کر دے گا۔ جس کے سارے کام چندن کی وجہ سے آسانی سے ہو جاتے ہیں۔

ناول میں اور کئی کردار ہیں جو ناول کی کہانی کو آگے بڑھانے میں مدد کرتے ہیں اور ہر کردار اپنی انفرادیت لئے ہوئے ہیں۔ ناول میں منظر نگاری کے بھی عمدہ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں اور مکالمہ نگاری بھی اپنے کمال پر دکھائی دیتی ہے۔ مجموعی طور پر جیوتیشور پتھک کا ناول ''میلی عورت'' فنی اور تکنیکی اعتبار سے ایک عمدہ اور کامیاب ناول ہے۔

ترنم ریاض

ترنم ریاض کا نام ہندوستان کی خواتین قلم کاروں میں بالعموم اور جموں وکشمیر میں بالخصوص کافی اہمیت کا حامل ہے۔وہ ریاست جموں وکشمیر سے تعلق رکھتی ہیں۔وہ ان فکشن نگاروں میں سے ایک ہیں جن کے افسانے اور ناول نے قاری کو کافی متاثر کیا ہے۔ان کے ناول اور افسانے فکری اور فنی لحاظ سے غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔

ترنم ریاض کی ولادت ۹/اگست ۱۹۶۳ء کو سری نگر میں ہوئی۔ان کے والد کا نام چودھری محمد اختر ہے۔وہ پیشے کے اعتبار سے ایک پائلٹ تھے۔ان کی والدہ کا نام ثریا بیگم ہے۔وہ ایک کشمیری خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ترنم ریاض کے یہاں کشمیریت اور پنجابیت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ترنم ریاض کا اصلی نام فریدہ ترنم تھا لیکن ۱۹۸۳ میں پروفیسر ریاض پنجابی سے شادی کے بعد وہ ترنم ریاض ہوگئیں۔

انھوں نے ابتدائی تعلیم گرلز ہائی اسکول کرن نگر، سری نگر سے حاصل کی ہے۔اس کے بعد وومنز کالج سری نگر سے گریجویشن مکمل کی اور اس کے بعد کشمیر یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔بعد میں بی۔ایڈ اور ایم۔ایڈ کی ڈگری بھی یہیں سے حاصل کی۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ریڈیو اور ٹی۔وی سے منسلک ہوگئیں۔

ترنم ریاض کی ادبی زندگی کا آغاز بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں ہوا۔انھوں نے ادبی مضامین اور مختصر افسانے کے ذریعے ادب کے میدان میں قدم رکھا۔ان کی اب تک بارہ سے زائد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ان میں دو ناول ''مورتی'' اور ''برف آشنا پرندے'' بھی شامل ہیں۔اس کے علاوہ اب تک ان کے چار افسانوی مجموعے بھی منظرِ عام پر آچکے ہیں اور ان کا تخلیقی سفر ابھی جاری

ہے۔ترنم ریاض کو ان ادبی خدمات کے عوض کئی ملکی و ریاستی اعزازات و انعامات سے بھی نوازا گیا ہے۔

ترنم ریاض نے افسانہ نگاری اور شاعری کے علاوہ ناول نگاری میں بھی طبع آزمائی کی۔ان کا شمار دورِ جدید کے مشہور و معروف ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کے دو ناول شائع ہو چکے ہیں۔ان کا پہلا ناول ''مورتی'' کے نام سے ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا جس کو ناولٹ کہنا زیادہ مناسب رہے گا اور دوسرا ناول ''برف آشنا پرندے'' کے نام سے ۲۰۰۹ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔

''مورتی'' ترنم ریاض کی تخلیقی پیش رفت کا اعلامیہ ہے۔نثر میں وہ ابھی تک افسانے کی دنیا میں اپنے چار مجموعے پیش کر چکی ہے۔افسانہ نگاری کے ساتھ ہی ناول کی طرف پیش قدمی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فکشن کی دنیا میں داخل ہونے کی پوری تمنا رکھتی ہے۔ناول ''مورتی'' ناول نگاری کی دنیا میں ان کا پہلا قدم تھا اور ظاہر سی بات ہے ایسے میں ناول میں کچھ خامیاں رہ جانا تعجب کی بات نہیں۔ اس ناول کا موضوع کچھ اچھوتا یا انوکھا نہیں ہے لیکن پھر بھی ناول نگار نے ایک عورت پر روا رکھے جانے والے سلوک کو بے باک انداز میں پیش کیا ہے اور یوں یہ ناول ازدواجی زندگی کی ناکامی اور اس ناکامی کے اسباب پر مبنی ہے۔لیکن سپاٹ پلاٹ اور مرکزی کرداروں کی محدود دنیا کے سبب یہ ناول اپنے موضوع کو بھی عمدگی سے پیش نہیں کر سکا۔

''مورتی'' کی مختصر کہانی یہ ہے مسقط کا ایک نوجوان فیصل دہلی آتا ہے۔وہ یہاں اپنا کاروبار کرنا چاہتا ہے۔مسقط سے اس کی بھابی عافیہ نے اسے اپنی ایک پرانی سہیلی ملیحہ کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ آرٹسٹ کا ذہن رکھتی ہے اور وہ بہت خوبصورت بھی ہے۔ملیحہ کی شادی ل ایک بدصورت مالدار تاجر کے ساتھ کر دی جاتی ہے۔ عافیہ نے فیصل کو کہا کہ اگر ملیحہ کی کوئی بیٹی ہوئی اور وہ اپنی

ماں جیسی ہوئی تو فیصل سے اس کی شادی کی جائے گی۔اسی ارادے سے فیصل دہلی پہنچتا ہے۔وہاں وہ ملیحہ کے گھر جاتا ہے اور ملیحہ کو ان کی بیٹی سمجھ لیتا ہے۔لیکن اسے بعد میں پتہ چلتا ہے کہ جس سے اس کی ملاقات ہوئی وہ تو خود ملیحہ ہے اور یہ بھی کہ اس کی کوئی اولاد نہیں ہے۔

ملیحہ مجسمہ ساز آرٹسٹ ہے اور جتنی خوبصورت آرٹسٹ ہے اتنی ہی خوبصورت خاتون ہے۔اس کے شوہر اکبر علی خان کاروباری آدمی ہے۔انہیں آرٹ سے برائے نام بھی دلچسپی نہیں۔ملیحہ نے شادی کے بعد مجسمہ سازی کا شوق جاری رکھنا چاہا۔ان کے شوہر نے اس حد تک برداشت کرلیا کہ گھر کے تہہ خانے میں وہ اپنے مجسمہ سازی کے شوق کو پورا کریں لیکن بحیثیت فنکاران کی نمائش وغیرہ کرانے اور پبلک میں آنے کی اسے اجازت نہیں ملتی۔فیصل ملنے کے بعد اسے محبت اور شادی کے ارادے کا اظہار کردیتا ہے۔لیکن ملیحہ شادی شدہ ہونے کی وجہ سے اور عمروں کے فرق کے باعث اس معاملہ میں اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی۔غالباً کوئی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ملیحہ ایک ماں اور بچے کا مجسمہ بناتی ہے۔یہ مجسمہ ملیحہ کے فن کی معراج ہوتا ہے۔اسی دوران اکبر علی کا پروگرام بنتا ہے کہ وہ گھر کے تہہ خانے میں ایک آفس بنانا چاہتا ہے۔اسی سلسلے میں سامان کی اکھاڑ پچھاڑ ہوتی ہے۔ملیحہ کی زندگی بھر کی کمائی اس کے بنائے ہوئے مجسمے مزدوروں کے ہاتھوں ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔اس کا آخری شہ پارہ جو انہوں کافی محنت اور لگن سے بنایا تھا وہ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔فیصل ملیحہ سے اصرار کر کے سارے ٹوٹے ہوئے مجسموں کی نمائش کا اہتمام کرتا ہے۔ادھر ملیحہ کی مجسموں کی نمایش ''ٹوٹے ہوئے ستارے'' کے عنوان سے چل رہی ہے اور ادھر اپنے آخری شہ پارے کے ٹوٹنے پر اولاد سے محروم ملیحہ کو ایسا لگتا ہے کہ اس کا بچہ مار دیا گیا ہے۔یہیں ملیحہ کی حالت بگڑتی ہے اور وہ دیوانگی کا مظاہر کرنے لگتی ہے۔تب اکبر علی مجبور ہو کر ملیحہ کو پاگل خانے بھیجنے کا فیصلہ کرتا ہے۔یہاں پر فیصل پہنچ جاتا ہے اور کہتا

ہے کہ اگر ملیحہ کو پاگل خانہ بھیجنے کے بجائے اسے دے دیں تو وہ خود اس کا علاج کرائے گا۔اس طرح ناول اختتام کو پہنچتا ہے۔

بظاہر یہ پیار کی سیدھی سادھی کہانی لگتی ہے لیکن اس کے پردہ میں کئی اہم مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ناول بیانیہ کے جدید انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔اس میں واقعاتی صورتِ حال اور خیال کی رو کے ساتھ ہی کسی واقعہ کے سامنے آنے سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ اس ناول کی امتیازی خصوصیت کہی جاسکتی ہے۔

ناول کی کہانی دہلی تک محدود ہے لیکن بھابی عافیہ اور ملیحہ کی زندگی کے حوالے سے مسقط اور کشمیر بھی اس میں نظر آتے ہیں۔خصوصاً کشمیر کے بعض ثقافتی حوالے اور وہاں کے مسیحی قبرستان اور اسرائیلی حوالے کا ذکر اہمیت کے حامل ہیں۔معلومات فراہم کرتے ہوئے بھی ناول کا پیرائے بیان متاثر نہیں ہوتا۔ایک مثال ملاحظہ کیجیے:

> ''عافیہ وہ دیکھوتو.....وہ کلس..'ملیحہ نے ندی کی دوسری طرف کوہِ سلیمان کی چوٹی پر ایستادہ شنکر آچاریہ کے مندر کی طرف اشارہ کیا۔اگلے روز اونتی پور اور پٹن کے کھنڈرات دیکھنے کے بعد کارواں ابرار وانی کی نگرانی میں اندرون شہر کی جانب روانہ ہوا جہاں خانیار کے مقام پر روزہ بل کہلانے والا ایک قدیم مقبرہ تھا۔ زیارت پر حضرت یوز آصف کنندہ تھا منیجر نے یہ بھی بتایا کہ ایک روایت یہ بھی چلی آرہی ہے کہ یہ تربت یسوع مسیح کی ہوسکتی ہے جس پر سولی کے نشان لئے دو پاؤں بھی تراشے گئے ہیں۔'' ۶

ایک اور مثال دیکھئے:

> ''صدیوں تک یہودی بھی کشمیر آتے رہتے تھے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کشمیر میں قبریں یہودیوں کے انداز میں یعنی مشرق سے مغرب کی جانب بنائی گئی ہیں بلکہ

ان پر عبرانی بھی تحریر ہے۔ کشمیر کے گوجر خود کو اسرائیل کی اولاد بتاتے ہیں۔ اشیاء جیسے لباس، ٹوپی، ناؤ کھینچنے کا چپو وغیرہ اب بھی اسرائیل میں مستعمل چیزوں سے مطابقت لئے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کشمیر کی پرانی عمارات میں یہودیوں کی تعمیر کی طرز پر ہی یعنی زینے مغرب کی طرف سے تعمیر کئے گئے ہیں۔ پڑھتے پڑھتے ملیحہ کی دلچسپی بڑھنے لگتی مگر کچھ پل کے علاوہ وہ اپنا دھیان مورتی سے ہٹا نہیں سکی۔'' ے

ناول میں کئی کردار ہیں۔ فیصل کا کردار خیالی دنیا میں رہنے والے نوجوان کا ہے۔ ترنم ریاض نے اپنے خوابوں میں گم رہنے والے اس کردار کو اس کی تمام تر جذباتیت کے ساتھ عمدگی سے پیش کیا ہے۔ فیصل کے برعکس ملیحہ ایک پیچیدہ شخصیت ہے۔ تاہم اپنے فن کے ساتھ اس کی وابستگی اس کی اپنی زندگی سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اپنے فن کے ساتھ اتنی گہری وابستگی رکھنے والی ملیحہ کو جس قسم کا گھر ملتا ہے اس سے اس کے دکھوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت کی ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے۔ اس کہانی کا اختتام ملیحہ کے ٹوٹے ہوئے مجسموں کی نمائش پر ہوتا ہے۔ ایک طرف ملیحہ کے فن پاروں کی نمائش ہوتی ہے اور دوسری طرف وہ پاگل ہو جاتی ہے اور اس کے گھر والے اسے پاگل خانے لے جاتے ہیں۔ نمائش کے موقع پر چند مجسموں کی جس طرح سے تصویر کشی کی گئی ہے وہ دلکش ہے۔ منظر کشی کی ایک مثال دیکھئے:

''ٹوٹے ہوئے ایک پنکھ والی فاختہ کی مجسمہ کی چونچ ٹوٹ گئی تھی اور آنکھ کی پتلی کی سیاہی غالباً بارش سے دھل گئی تھی۔...... مرد کے مجسمے کا کندھا باقی حصے کے ساتھ لگا کر رکھا گیا تھا۔ جسم اور شانے کے درمیانی حصے کی دراڑ واضح تھی۔ پاس ہی ایک اور مجسمہ تھا۔ ہرن کے بچے کا۔ اُس نے کان کھڑے کر کے چوکنّے انداز میں اپنی ننھی سی تھوتھنی ذراسی اوپر اٹھا رکھی تھی۔ اُس کے برابر چھوٹا سا ایک لڑکا کُتے کے

ساتھ کھڑا تھا،ان دونوں کا مجسمہ ایک گول پتھر پر رکھا تھا۔ کُتّے کی آدھی دم بھی ٹوٹ گئی تھی اور اسی پتھر پر پڑی ہوئی تھی۔..... گملے کے برابر سادھو کا مجسمہ تھا جس کی نیم وا آنکھوں کے اوپر ابروؤں کے عین درمیان سے پیشانی تک جاتی ہوئی چار آڑھی لکیریں اُبھریں ہوئی تھیں۔فن کی یہ باریکی دیدنی تھی۔ سادھو کے سر کے اوپر تراشا گیا جوڑا ٹوٹ چکا تھا اور پدم آسن میں مُڑی ہوئی اُس کی ٹانگوں کے قریب گود میں پڑا تھا۔..... برابر میں رقّاصہ کا مجسمہ تھا جس کے ہوا میں اُٹھے ہوئے پاؤں کا پنجہ ٹوٹ گیا تھا۔ جانے پنجے کا ٹوٹا ہوا حصہ کہاں تھا۔اُس کے قریب زمین میں مدھو مالتی کی بیل اُگی تھی جو دیوار کی طرف جھکتی ہوئی پیپل سے لپٹ گئی تھی اور اُس کے سرخ و گلابی پھولوں کی پتیاں نیچے رکھے ماں اور بچّے کے مجسّمے پر گری ہوئی تھیں۔ بچّے کا مجسمے جہاں ماں کے مجسّمے سے جڑ تا تھا وہاں ایک بڑی سی درار میں سے ڈھلتے سورج کی پیلی روشنی آر پار ہو رہی تھی حالانکہ اُس کے ایک کونے کے نیچے مجسّمے کا توازن برقرار رکھنے کے لیے ایک اینٹ بھی رکھی گئی تھی۔'' ۸

فیصل کی کہانی اس مقام پر اپنے ادھورے پن کی ساتھ انجام کو پہنچتی ہے لیکن ناول کی ابتدا اسی نمائش سے ہوتی ہے اور پھر فلیش بیک سے گذرتے ہوئے ناول اختتام پذیر ہوتا ہے۔ یوں تکنیکی اعتبار سے ترنم ریاض نے اس ناول کو عمدگی سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں کافی حد تک وہ کامیاب بھی رہی ہیں۔فنِ مجسمہ سازی سے ان کی گہری دلچسپی کا احساس دلانا والا ناول ''مورتی'' ادبی طور پر ناول کی دنیا میں ان کی پہلی کوشش تھی اور ایسے میں ناول کے تمام پہلوؤں کو اس میں تلاش کر پانا مشکل ہے۔

''برف آشنا پرندے'' ترنم ریاض کا دوسرا ناول ہے۔ یہ ایک ضخیم ناول ہے۔اس ناول سے انہیں کافی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ ناول کشمیر کے سیاسی و سماجی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔

اس ناول میں زمانی و مکانی تناظر کی حد تک خطہ کشمیر کے لازوال حسن، اس کی زخم خوردہ روح، قوتِ تحمل، ماضی کی خوابیدہ گزرگاہوں اور حال میں زندگی کے افق پر نئی تاب وتپش اور معنویت پر مبنی ایک کبھی نہ ختم ہونے والی کہانی ہے۔ ناول پڑھ کی کشمیر کی تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی زندگی کے بہت سارے پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس ناول میں کشمیر کی زندگی اور یہاں کے لوگوں کا دود و کرب نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ معاشرتی زندگی کی جھلکیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ وہ کشمیر بھی دکھائی دیتا ہے جو ہم نے کبھی اپنے خوابوں میں سجایا اور بسایا تھا۔ ترنم ریاض کے اس ناول میں کشمیر کے رومانی تخیل کی فضا آفرینی بھی ملتی ہے۔

''برف آشنا پرندے'' میں کشمیر کی روزمرہ کی زندگی کی جھلک کو مصنفہ نے بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے۔ کشمیر کی قدرتی خوبصورتی کی جہاں تصویر کشی کی گئی ہے وہیں پر کشمیر کے پکوان اور طرزِ زندگی کو بھی نمایاں طور پر پیش کیا ہے۔ اگرچہ ناول کشمیر کی سماجی تاریخ پر مبنی ہے لیکن کشمیر کا سیاسی مسئلہ اس ناول کا موضوع نہیں ہے بلکہ کشمیر کی صدیوں کی تاریخ کئی صفحات پر بیان کی گئی ہے۔ یہ تاریخ ایک آئینہ ہے جس میں کشمیر کی شناخت، کشمیری افراد کے مصائب، کشمیر کے تہذیبی احیا کو دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ناول براہِ راست مسئلہ کشمیر پر نہیں ہے پھر بھی مندرجہ ذیل اقتباسات سے اس کو موضوع پر پڑتی ہے۔ مثلاً:

> ''سن رسیدہ کشمیریوں کو یاد ہے پنڈت جی نے آدھ صدی قبل اس بات کو لال چوک میں دہرایا تھا کہ کشمیری اپنے کا فیصلہ خود کریں گے۔ صوبہ جموں میں ایک لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کو تہہ وتیغ کیا گیا ہے۔ اس سے دوگنی تعداد کو جموں وکشمیر سے پاکستانی کنٹرول والے علاقے میں دھکیل دیا گیا ہے۔ ......صوبہ جموں جو ایک مسلم اکثریت والا صوبہ تھا اب ایک مسلم اقلیتی صوبے میں تبدیل ہوگیا تھا۔

یہ واحد مسلم اکثریت والی ریاست تھی جس نے اپنی مرضی سے وفاقِ ہند میں شمولیت کی تھی۔ پوری فیڈریشن میں اسے خصوصی درجہ حاصل تھا۔اس کا پنا وزیر اعظم اور صدرِ ریاست تھا۔ ہند و پاک میں یہ تنہا ریاست تھی جس سے اندرونی آئین مرتب کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔اس ریاست کا اپنا ایک جھنڈا تھا جو ملک کے ترنگے کے ساتھ ساتھ لہراتا تھا۔'' 9

ناول میں کشمیر کی تہذیبی تاریخ کا پس منظر بھی خوب صورتی سے استعمال کیا گیا ہے۔لیکن ناول کا مرکزی کردار شیبا ایک غیر دلچسپ کردار ہے۔ چونکہ ناول کا سارا منظر نامہ شیبا کے ارد گرد پیش کیس گیا ہے اس لیے شیبا کی زندگی کی یکسانیت اور اکتاہٹ پورے منظر نامے کو بے رس کر دیتی ہے۔ شیبا کی زندگی بہت سپاٹ، بے رنگ اور بے اثر ہے۔ غالباً اسی لیے ناول کو پڑھنا مشقت سے کم نہیں۔ ناول وہ چمن نہیں بن سکا جس کی سیر کر کے دل شاداں ہو یا انسانی المیہ کی سنگینی سے دل کے ریشے لرزاں ہو۔ دوسری طرف جن سیاسی حالات اور واقعات کا ذکر مصنفہ نے کیا ہے وہ بھی لوگوں کی یاداشت میں محفوظ ہیں اور مختلف مما لک کے اخبارات میں روزانہ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ تاریخی حوالے لوگوں کی زندگیوں کے احوال سے محروم ہوتے ہیں اور ناول کو بوجھل کر دیتے ہیں۔کشمیر میں پنڈت جی کا بیان علی امام نقوی نے بھی اپنے ناول میں بیان کیا ہے۔ان دونوں ناول نگاروں نے کشمیر کے مسئلے پر ایک جیسے خیالات پیش کیے ہیں لیکن دونوں آرٹ کی سحر کاری اور جادوگری سے یکساں محروم ہیں۔

ناول کا قصہ جن افراد و اشخاص کے گرد گھومتا ہے ان کا تعلق کشمیر کے متمول، زمیندار، ذی علم اور با اثر خاندان سے ہے لیکن یہ کہانی ناول کی فنی ضرورتوں اور تقاضوں کے طفیل کشمیر کی رنگا رنگ تکثیری ثقافت، درخشندہ تہذیبی و روحانی اقتدار و میراث، تاریخی مد و جزر، فطری اور معصوم زندگی کے لازوال

حسن، نایاب دستہ کاری کی روایت اورفنی ریاضت وکسب وکمال کی تابندی تاریخ کے تذکرے تک ہی محدود ہو جانے کے بجائے اپنے مرکزی اورذیلی وضمنی کرداروں کی پیچیدہ نفسیات اوران کے دائرہ عمل کی بے پناہ وسعتوں کے باعث ایک علمی اورآفاقی جہت بھی حاصل کر لیتی ہے۔جس کی کوئی دوسری مثال ہم عصراردو فکشن میں سردست نظرنہیں آتی۔

''برف آشنا پرندے'' ایک مسلم کشمیری خاندان کے تہذیبی زوال کی دلسوز ومعنی خیز داستان ہے۔خاندان کے کئی گوشوں، پشتوں سے ہوتی ہوئی کشمیری زبان وتہذیب کی راہوں سے گزرتی ہوئی کہانی پہلے ذہن الدین اورنذہت پرآٹکتی ہے۔شوہراور بیوی کے درمیان روایتی اختلافات شوہر کی برہمی اورزیادتی، بیوی کا صبراورمظلومی۔ان سب کا اثراولادوں پرہوتا ہے خاص طور پرعاصم کا بھٹک جانا۔ایک لمحہ کے لئے ایسامحسوس ہوتا ہے کہ ناول عاصم کے بھٹکے ہوئے کردارکورخ دے گااورموجودہ سماجی بھٹکاؤاوردہشت گردی وغیرہ سے رشتے استوارکرے گالیکن ناول شیبا کے حالات چل پڑتا ہے جوآگے بڑھ کرمرکزی رخ اختیارکرلیتی ہے۔لیکن درمیان میں آنے والے تمام کرداروں کے ساتھ بھرپورانصاف کیا گیا ہے۔خصوصاً ماں ثریابیگم، باپ نجم خان،بہنیں، بھانجے، بھانجیاں، دوست احباب،خصوصا میوری، پروفیسردانش، ملازم سلیم میاں، پروفیسرشیروانی ان سب کا ذکرتفصیل کے ساتھ ہے۔آہستہ آہستہ تقریباً سارے کرداراپنا کام کرکےفیڈآوٹ ہوجاتے ہیں۔

شیبا کا کرداربچپن سے جوانی تک ایک نارمل وجودکی کہانی ہے۔جس میں جذبات کی گرمی ضرور ہےلیکن وہ کبھی بھی اضطراری نظرنہیں آتی۔شیبا موجودہ زمانے کی لڑکی ہے جوتعلیم اورملازمت کے لئے اپنے گھرسے باہردوسرے شہر میں رہتی ہے۔دوستوں کے ساتھ وقت گزارتی ہے۔اکیلے سمیناروں میں حصہ لیتی ہےاوروہ اپنے فیصلے لینے کے لئے تقریباً خودمختار ہے۔اس کے اوپرصرف

ایک پابندی ہے کہ وہ اپنے دل اور روایتوں کی پابندی۔ وہ اپنی زندگی کے بارے میں ایک کٹھن فیصلہ لیتی ہے کہ وہ تمام زندگی ایک تنہا فرد کی صورت میں گزارنا چاہتی ہے۔

پروفیسر دانش کا کردار ایک خاموش معذور و دانشور کا کردار ہے لیکن اس کردار کی مدد سے مصنفہ نے اپنی ہیروین کا کردار عمدگی سے پیش کیا ہے۔ بہت فطری انداز سے دکھایا گیا ہے کہ شیبا اپنے استاد کو ایک استاد کی طرح چاہتی ہے۔ یہاں تک اپنا محبوب اور اس کے ساتھ گزاری جانے والی زندگی کو بھی قربان کر دیتی ہے۔

اس ناول میں خاصے طویل پیراگراف میں کشمیر کی تاریخ وتہذیب کو پیش کیا گیا ہے جو قدرے غیر ضروری لگتا ہے۔ ناول کا اصل موضوع تو کچھ اور ہی ہے تاہم بڑے اور ضخیم ناولوں میں تاریخی واقعات داخل ہو ہی جاتے ہیں۔ ناول کی وسیع القلبی بڑی بڑی چیزیں ہضم کر لیتی ہے۔ اس ناول میں ترنم ریاض نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ صرف کشمیر ہی دنیا کی بربادی کا ذمہ دار کیوں ہے؟ ایک طرف گھریلو معاملات، جذباتی حادثات، حکومت کی زیادتی، دہشت گردی، درمیان میں شیبا کا احساس اور سوچتا ہوا کردار۔ کبھی کبھی تو شیبا میں ترنم ریاض اور ترنم ریاض میں شیبا مدغم نظر آتی ہیں۔ کہیں کہیں جذباتی اور کہیں معروضی انداز میں سوچتا ہوا ذہن اس ملی جلی کیفیت کو مصنفہ نے بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔

ترنم ریاض کا یہ ناول اصلاحی معنوں میں ان تمام لوازمین، فنی عناصر اور اجزائے کے باہم ربط و اتصال سے عبارت ہے جس کی تشکیل وتعمیر میں دل آویز بیانیہ، عنصر نظم وضبط، کردار، ڈرامائی قدرت حال، زماں و مکاں، زبان و بیان، مکالمہ وعمل اور نقطہ نظر سبھی کچھ شامل ہے۔ تاہم جو فنی و تخلیقی عناصر اس ناول کو ایک سماجی دستاویز اور ہنگامی صحافتی کارنامہ کی سطح سے بلند کر کے اس میں ایک لازمانی

سرمدی آہنگ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ان میں اس کا بیانیہ، منظر کشی، زبان دانی، کردار نگاری اور مصنفہ کی مختلف تہذیبی، ثقافتی، علمی، فنی، فکری و تاریخی سلسلوں سے باخبری کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

ترنم ریاض کا یہ ناول کہیں کہیں بے جا قسم کی نسائیت اور عورت کی مظلومیت پر منحصر نظر آتا ہے۔ کشمیر یا بعض دوسرے مقامات کا تعارف اور طوالت بھی گراں گزرتی ہے۔ حالانکہ ایک بڑے اور ضخیم ناول میں ایسے مقامات آتے ہیں۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ معاشرتی زندگی کے حقائق پر مرتکز بیانیہ کو فکشن کے آداب اور رسوم کی پابندی سے ساتھ معاشرتی دستاویز بننے کے پوری طرح محفوظ کر پانے کی جتن میں معروض سے ہمہ وقت ایک جمالیاتی بُعد برقرار رکھتے ہوئے توازن قائم رکھ پانا بہت بڑا چیلنج ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر ناول 'برف آشنا پرندے' اپنے موضوع، پلاٹ، کرداروں، مکالمات، پرندوں، نباتات، مقامات اور مختلف جذبوں کی کیفیات کے باوصف ایک اہم ناول نظر آتا ہے۔ ہم عصر جواں سال ادیبوں کے ناولوں میں یہ ناول اپنی انہیں خصوصیات کی وجہ سے اہمیت رکھتا ہے۔ الغرض ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انیسویں صدی کے جن فنکاروں کے ذریعے ناول کی روایت کو وقار حاصل ہوا ان میں ترنم ریاض کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔

نعیمہ احمد مہجور

نعیمہ احمد مہجور کی ولادت سری نگر ایک علمی و ادبی خاندان میں ہوئی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کشمیر یونیورسٹی سے حاصل کی۔ انھوں نے لندن یونیورسٹی سے بھی سیاسیات میں ایم۔ اے

کی ڈگری حاصل کی ۔ ریاست جموں وکشمیر کی خواتین ناول نگاروں میں ان کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے اپنا ادبی سفر افسانہ نگاری سے شروع کیا اور کئی بہترین افسانے لکھے۔ کئی اہم افسانے لکھنے کے بعد انہوں نے ناول نگاری کی طرف توجہ کی۔

''دہشت زادی'' نعیمہ احمد مہجور کا پہلا ناول ہے۔ یہ ناول ۲۰۱۲ء میں منظر عام پر آیا اور اور ادبی حلقوں میں اس کی کافی پذیرآرائی ہوئی۔ نعیمہ احمد مہجور دراصل معروف بی بی سی براڈ کاسٹر ہیں جو کئی برسوں تک بی بی سی اردو سروس کے ساتھ منسلک رہی ہیں۔ اس سے قبل وہ ریڈیو کشمیر سے بھی کئی برسوں تک منسلک رہی۔ انہیں بین الاقوامی سطح پر کئی اعزازات سے نوازا گیا ہے۔

چونکہ جیسا پہلے ہی بیان کیا جاچکا ہے کہ وہ وطن سے دور لندن میں بی۔ بی۔ سی۔ اردو میں اپنی خدمات انجام دے رہی ہیں لیکن کشمیر سے دور رہ کر بھی کشمیر ان کی نظروں سے اوجھل نہیں رہا بلکہ ان کے ذہن اور ان کی سوچوں میں بسا ہوا ہے اور انہوں نے یہاں کی سیاسی وسماجی زندگی کے مسائل کو اس ناول میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یوں ایک ناول نگار بن کر وہ ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے۔

ان کے ناول ''دہشت زادی'' جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے کشمیر کے پسِ منظر میں لکھا گیا اہم ناول ہے۔ اس ناول میں نعیمہ نے کشمیر کے گذشتہ بیس بائیس برسوں میں ہو رہے حالات و واقعات کو سچ اور سچائی کی روشنی میں اپنے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنی ذات، اپنی شخصیت، اپنے خیالات اور اپنے احساسات کو کہانی کے اندر اس طرح سمیٹ لیا ہے کہ ناول پڑھ کر احساس ہونے لگتا ہے کہ حقائق کی پیش کشی کے ذریعہ انھوں نے ایک مشکل ترین راستے کو اختیار کیا ہے۔ چنانچہ وہ خود ناول کے بارے میں لکھتی ہے:

''دہشت زادی اس کشمیری خاتون کی داستان ہے جو اپنے کیریر کے آغاز پر اس وقت پُر تشدد حالات کے شکنجے میں پھنس گئی جب وادی کشمیر میں سن اسی کے اواخر میں حصولِ آزادی کی خاطر عسکری تحریک شروع ہوگئی اور ہر طرف قتل و غارت گری، تباہی اور بربادی کے نتیجے میں اسے اپنے گھر نوکری اور شوہر پر اختیار نہیں رہا۔ عسکر تحریک نے مسلم آبادی میں بھارت سے آزادی حاصل کرنے کے جذبے کو دوبارہ اجاگر کیا اور وہ بھی اس جذبے سے سرشار ہو کر آزاد مملکت کا خواب دیکھنے لگی مگر تحریک کے ساتھ اس کے شوہر کی جنونی حد تک وابستگی سے اس کی ازدواجی زندگی بری طرح متاثر ہوئی۔۔۔۔ جب حالات اس کے قابو سے باہر ہو گئے تو وہ روایتی معاشرے میں رہ کر زندگی کے ہر پہلو سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہوگئی حتیٰ کہ آزادی کے خواب کو دل کے کسی کونے میں پھر دفن کرنا پڑا۔'' [۱۰]

ناول کے آغاز میں حرفِ اول کے عنوان سے گوپی چند نارنگ کی رائے سے ناول کی اہمیت اور موضوع کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''مجھے یقین ہے کہ کتاب کو فقط ایک نیم سوانحی کے طور پر نہیں بلکہ عورت کی پسماندگی کے خلاف ایک پرسوز احتجاجی دستاویز اور وادی کی انسانیت پسند روحانی میراث 'ریشیت' کی درد میں ڈوبی فریاد کے طور پر بھی پڑھا جائے گا۔'' [۱۱]

اسی طرح پیش گفتار میں کشور ناہید ناول کے بارے میں لکھتی ہیں:

''نعیمہ احمد مہجور نے نہ صرف موجودہ صورت حال کو ناول کے قالب میں ڈالا ہے بلکہ مجھے وہ ساری حکایتیں اور داستانیں یاد کرا رہی ہیں جو فلسطین، جنوبی افریقہ اور جنوبی امریکہ میں سامراجیت کے خلاف ناول اور نظمیں لکھی گئیں ہیں۔ ۔۔۔ نعیمہ احمد مہجور کا اندازِ تحریر بہت سادہ مگر پرکار اور پروقار ہے۔ یہ لڑائی مستحسن نہیں مگر اس کا جواز صرف ہندوستان اور پاکستان کے حکمران ہی دے سکتے ہیں۔ شاید نعیمہ کے ناول کو پڑھ کر حکمرانوں کی ذہنیت بدل جائے اور پردے

کے پیچھے جو کچھ ہو رہا ہے اس پر مزید تحریروں کی صورت میں پردہ اٹھ جائے۔''

۱۲؎

ناول ''دہشت زادی'' کا موضوع ناول نگار نے اپنی زندگی سے لیا ہے۔ایسے میں یہ ناول ان کا سوانح ناول قرار دیا جا سکتا ہے لیکن ناول نگار نے اپنی زندگی کے واقعات کو کشمیر کی عام خواتین کے تناظر میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ایسے میں یہ ناول ایک ناول نگار کی زندگی ہی نہیں بلکہ پورے معاشرے کی خواتین کی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ناول نگار نے کشمیر کی مسلح تحریکِ آزادی کے آغاز سے ہی یہاں خواتین پر ہو رہے مظالم اور دکھ و درد کو خود بھی جھیلا اور دوسروں کو بھی اس حالت میں تڑپتا ہوا دیکھا اور ان ہی مظام کی داستاں ناول میں بیان کی گئی ہے۔کیونکہ مسلح تحریک کے ساتھ ہی یہاں خاندانی مظالم کے علاوہ سیاسی اور سماجی طور پر خواتین براہِ راست متاثر ہوئیں۔

ناول کی کہانی متکلم کردار کے گرد گھومتی ہے جو کوئی اور نہیں بلکہ ناول نگار خود ہے۔ جو کئی رکاوٹوں کے باوجود ریڈیو میں کام کرتی ہے۔ریڈیو میں کام کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ اس کا اپنا شوہر اور خاندان کے دوسرے افراد شامل ہیں۔ریڈیو میں کام کرنا اس لئے معیوب سمجھا جاتا ہے کہ یہ بھارتی حکومت کا ترجمان ہے اور یہاں سے وہی پروگرام نشر ہوتے ہیں جو کشمیر کی آزادی کو زخ پہچاتے ہیں اور کشمیر کی تحریک آزادی کو دبانے میں اس ادارے کا کافی اہم کردار ہے۔ یہاں سے جو بھی پروگرام نشر ہوتے ہیں وہ دہلی سے منظور شدہ ہی ہوتے ہیں۔ناول کا یہ کردار کئی ایک اہم باتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔اس نوکری میں اگر کوئی اس کا ساتھ دیتا ہے تو وہ ان کے والد ہیں جو کافی روشن خیال ہوتے ہیں۔ناول کا موضوع ۱۹۹۰ء کے بعد سیاسی اور سماجی سطح پر ہونی والی غیر یقینی صورتِ کا آئینہ دار ہے۔۱۹۹۰ء کے بعد کشمیر میں کریک ڈاؤن، کرفیو، ہڑتال، تلاشی وغیرہ روز کا

معمول بن گیا اور ناول میں جا بجا ایسے حالات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ ناول تاریخی واقعات سے بھرا پڑا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے لے کر ۱۹۹۰ء تک ہندوستان کی حکومت نے ریاست کے لوگوں کے ساتھ کئے گئے رائے شماری کے وعدے کو کبھی بھی پورا نہیں کیا۔ ۱۹۴۷ء میں شیخ محمد عبداللہ نے جواہر لال نہرو سے یہ عہد و پیماں لیا تھا کہ کشمیر کا الحاق ہندوستان کے ساتھ عارضی ہوگا اور حالات میں بہتری کے ساتھ ہی یہاں کے لوگوں کو رائے شماری کا موقع دیا جائے گا لیکن جب یہ ہی وعدہ شیخ محمد عبداللہ نے ہندوستان کو یاد دلایا تو پنڈت نہرو نے اسے جیل میں بند کر دیا اور اس کے بعد سے آج تک پیدا ہونے والی صورتِ حال کا نقشہ ناول نگار نے بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔

ناول میں کئی کردار ہمارے سامنے آتے ہیں جو کشمیر کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار اہم واقعات پر موجود نظر آتا ہے۔ ناول کے باقی تمام کردار کسی نہ کسی طرح اسی مرکزی کردار سے منسلک ہے۔ یہ کردار ریڈیو میں ملازم ہے لیکن ہمیشہ سے لوگوں کے طعنوں کا شکار رہے۔ ازدواجی زندگی میں بھی اسے وہ مقام نہیں ملتا جس کی وہ مستحق ہے۔ شوہر اسے ہمیشہ طعنہ دیتا ہے اور نظر انداز کرتا ہے۔ سسرال کے دوسرے لوگ بھی اسے نوکری چھوڑنے کی ضد کرتے ہیں لیکن یہ سب رکاوٹوں کے باوجود اپنا کام انہماک سے انجام دیتی ہے۔ آخر میں کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔ سب سے پہلے شادی کے پانچ سال بعد ایک بچہ پیدا ہوتا ہے اور اس کی کوکھ بھر جاتی ہے۔ اس کے بعد سسرال والوں کے رویہ میں تبدیلی آتی ہے اور شوہر سے بھی اس کے تعلقات استوار ہو جاتے ہیں۔ آخر میں اسے لندن میں ایک نوکری مل جاتی ہے جس سے سب گھر والے اور رشتہ داران پر ناز کرتے ہیں وہ سب لوگ مل کر اسے لندن روانہ ہونے کے لئے نم آنکھوں

سے روانہ کرتے ہیں۔

ناول کے دوسرے کرراروں میں شائستہ کا کردار بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ کردار ان کشمیر کی ان خواتین کی ترجمانی کرتا ہے جو بے گناہ مسلح تحریک کے دوران نامعلوم بندوق برداروں کے ہاتھوں قتل کی گئیں۔ وہ کس جرم میں قتل کی گئیں اس کا علم انہیں خود بھی نہ ہوسکا۔اس کے علاوہ سعدیہ کا کردار ان ماؤں کی ترجمانی کرتا ہے جن کی اولاد انہیں چھوڑ کر سرحد پار چلی جاتی ہیں تا کہ واپس آ کر وہ اپنے وطنِ عزیز کشمیر کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرسکیں۔اس طرح سعدیہ کے اولاد کے باہر جانے کے بعد وہ اولاد کے غم میں اپنا گھر بار چھوڑ کر کسی دور دراز گاؤں میں چلی جاتی ہے اور اپنا ذہنی توزان بھی کھو دیتی ہے۔فریدہ کا کردار بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ کردار ان کشمیری خواتین کی ترجمانی کرتا ہے جن کے شوہران کی آنکھوں کے سامنے قتل کئے گئے۔ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ آزادی کی حامی تھے لیکن ہندوستان کی فوج نے ایسے ہزاروں افراد کو موت کی ابدی نیند سلا کر بیواؤں کی تعداد میں اضافہ کیا۔

اس کے علاوہ ناول میں کشمیر کے لوگوں کی سماجی زندگی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔لیکن ناول کا پلاٹ کافی چست ہے۔ کہیں کہیں پہ ایسے واقعات بیان کئے گئے ہیں جنہیں ناول کے فن میں عیب مانا جاتا ہے لیکن یہ نعیمہ احمد کی پہلی کاوش ہے اور ایسے میں کچھ خامیوں کا رہ جانا کوئی عیب نہیں۔

شبنم قیوم

گزشتہ باب میں شبنم قیوم کے تین اہم ناولوں کا ذکر آ چکا ہے۔انہوں نے ریاست جموں و کشمیر کے سیاسی حالات اور غیر یقینی کو اپنے ناولوں میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔وہ ایک

ناول نگار کے علاوہ بہترین تاریخ داں بھی ہیں۔انہوں نے ریاست جموں وکشمیر کے سیاسی و تاریخی حالات پر کئی ایک تاریخی کتابیں لکھی ہیں۔شبنم قیوم ۱۹۶۰ء سے مسلسل لکھ رہے ہیں۔۲۰۰۵ء میں انہوں نے ایک اور ناول **'پچھتاوا'** لکھا۔۱۸۰ صفحات پر مشتمل یہ ناول میزان پبلیشرز اینڈ ڈسٹر بیوٹرس سے شائع ہوا۔یہ ناول اپنی ایک انفرادیت اور پہچان لیے ہوئے ہے۔

اس ناول کا پس منظر کشمیر کے نامساعدہ حالات ہیں۔اس کے ساتھ ہی ناول نگار نے ترقی یافتہ مشینی دور کے ان عوامل سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے جن کی وجہ سے انسانی سوچ اور سوسائٹی میں بدلاؤ آرہا ہے۔

شبنم قیوم کے اکثر ناول حقیقی واقعات پر مبنی ہوتے ہیں۔ان کا یہ ناول ''پچھتاوا'' بھی حقیقت پر مبنی ہے۔ اس بات کا اعتراف شبنم قیوم نے خود ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''اپنی ایک تصنیف 'سیکس پولیوشن' کی تیاری کے دوران ہندوستان کے دو نامور انگریزی میگزین 'انڈیا ٹوڈے' اور 'فرنٹ لائن' کی جانب سے کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر طالبات کے بارے میں ان کے سیکس پر سروے کی رپورٹ میں ۳۳ فیصد لڑکیوں کی طرف سے سیکس میں ملوث ہونے اور سیفٹی کے لیے اپنے پرس میں چھتری یعنی کنڈوم اور مانع حمل گولیاں رکھنے کا اعتراف اور وہ بھی بغیر کسی ہچکچاہٹ اور شرم کے گویا ڈگری حاصل کرنے کا انکشاف کیا جارہا ہو، اپنے اندر بڑا معنی رکھتا ہے۔یعنی موجودہ ترقی یافتہ دور میں ۳۳ فیصد طالبات کا مباشرت کا اعتراف ہمارے لیے ششدر ہوکر پریشانی کا باعث بن گیا۔اسی دوران روز نامہ 'ہندسماچار' میں ایک کم سن نابالغ لڑکی کے ناجائز حمل ٹھہرنے کا انکشاف ہوا تو اسے اس دور کے انسان کی جارحیت اور تہذیب کا زوال قرار دیا جاسکتا ہے۔یہ دونوں واقعات گذشتہ چند سال سے میرے سینے پر ایک بوجھ بن کر رہے۔اس

بوجھ سے نجات پانے کے لیے مجھے قلم اٹھانا پڑا۔ میرے آج کے اس ناول
''پچھتاوا'' کا موضوع لگ بھگ حقیقت پر مبنی ہے۔'' ۱۳

اس ناول کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم کشمیر میں رہ کر یہاں کے چشم دید حالات پڑھ رہے ہیں۔ مطالعے کے دوران ہم بھول جاتے ہیں کہ ہم کسی ناول کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس ناول میں شبنم قیوم نے کشمیر کے نامساعدہ حالات، ترقی یافتہ سائنسی دور اور موجودہ زمانے میں ایجادات کا بارک بینی سے مشاہدہ کر کے اس کے مضر اثرات کا اعادہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ ناول موضوع اور فن کے لحاظ سے کامیاب نظر آتا ہے۔ پچھتاوا ناول پڑھنے کے بعد قاری کو اس ماحول اور اس سائنسی دور سے نفرت ہونے لگتی ہے جس نے ہماری نئی پود کے اذہان کو روشن کرنے کے بجائے مفلوج کر دیا ہے۔

۱۹۹۰ء میں کشمیر کے حالات نہایت ہی خراب ہو گئے۔ نوجوان نسل اپنے حقوق کو منوانے کے لیے اپنے ہاتھوں میں بندوق اٹھانے پر مجبور ہو گئی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے جب ہندوستان کی فوج مسلسل کشمیری قوم پر ظلم برپا کر رہی ہے۔ سارے جمہوری طریقے ناکام ہو گئے۔ کسی بھی سیاسی رہنما نے نیک نیتی سے کشمیر کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ ایسے میں یہاں کے نوجوان بڑی تعداد میں پاکستان چلے گئے اور وہاں سے اسلحہ چلانے کی تربیت پا کر کشمیر میں ہندوستان کی فوج سے برسرِ پیکار ہوئے۔ یہ دور کشمیر کی تاریخ کا ایک بھیانک دور تھا۔ کشمیر دیکھتے ہی دیکھتے میدانِ جنگ میں تبدیل ہوا۔ ایسے میں یہاں کی پنڈت آبادی اپنے آپ کو غیر محفوظ پا کر وادی سے ہجرت کرتی ہے۔ پنڈت آبادی جموں اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں منتقل ہو گئی۔ ان حالات نے ان کا سب کچھ چھین لیا۔ ناول نگار شبنم قیوم نے انہیں تمام حالات کو اپنے اس ناول میں پیش کیا ہے۔ ناول سے

ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس سے اس کے موضوع پر روشنی پڑتی ہے:

''کشمیر میں جب عسکری تحریک کا آغاز ہوا اور کشمیری پنڈتوں نے وادی سے عارضی ہجرت کا فیصلہ کرلیا۔ میر اسلم اوران کے بھائی میر عالم نے انیل رینہ کو جانے نہیں دیا اوران کی حفاظت کے لیے سیکورٹی مہیا کی گئی۔ چنانچہ جب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کشمیری پنڈتوں کی ہجرت عارضی کے بجائے مستقل ہوگئی اور وادی چھوڑ کے صوبہ جموں کے ساتھ ملک کی دوسری ریاستوں اور بیرونی ممالک جا کر بس گئے تو یہ پنڈت برادری وادی چھوڑنے پر مایوس ہوگئے۔ یہ جان کر بھی انہوں نے اپنی مرضی سے ہجرت نہیں کی تھی بلکہ وقت کے حکمراں نے انہیں ہدایت دی تھی کہ وہ عارضی طور پر وادی سے شفٹ کریں کیونکہ یہاں صفائی کرنی ہے۔ علیحدگی پسند تحریک کا قلع قمع کرنا ہے۔ وادی کی نو جوان پود کو نیست و نابود کرنا ہے۔ اس کاروائی میں آپ کو کوئی گزند نہ پہنچے لہذا یہاں سے عارضی طور پر شفٹ کریں۔ آپ کو بحفاظت یہاں سے روانہ کیا جائے گا اور حالات نارمل ہونے کے بعد بحفاظت واپس لایا جائے گا۔'' [۱۴]

ریاست سے پنڈت لوگ ہجرت کرتے ہیں ان کی مشکلات اور مسائل کا احاطہ بھی ناول نگار نے کرنے کی کوشش کی ہے۔ ناول کا ایک کردار میش جب ہجرت کر کے جموں پہنچتا ہے تو اس کی بیٹی کو اغواہ کیا جاتا ہے:

''بھائی اسلم، وہ کھو نہیں گئی، بلکہ اسے جموں پہنچتے ہی اغوا کیا گیا۔ اس وقت ننسی بیٹی بارہ سال کی تھی۔ جب ہم مائیگرنٹ ہو کر جموں پہنچے شام کے وقت جموں پہنچ کر ہم رہائش کے لیے ٹھکانہ تلاش کر رہے تھے۔ میں نے اپنی والدہ، بیوی اور دونوں بچیوں کو شہیدی چوک میں پٹری پر رکھا اور بیٹے راجیش کو لے کر رات بھر کے لیے ہوٹل میں کمرہ لینے گیا۔ کمرہ بک کر کے واپس آیا تو مجھے ماتا جی اور بیوی نے بتایا کہ آٹو میں چند غنڈے آ گئے۔ انہوں نے ہمارے سامنے ننسی کا منہ بند

کر کے اسے گود میں اٹھا کر آٹو میں بھر دیا اور پھر۔۔۔'' ۱۵

یہاں سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ناول نگار کی نظر نہ صرف کشمیر کے اندرونی حالات پر ہے بلکہ ہجرت کرنے والے پنڈتوں کے مسائل سے بھی وہ اچھی طرف واقف ہیں اور اسے بیان کرنے میں وہ ذرا بھی نہیں ہچکچاتے ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر کے سیاسی حالات اور افراتفری کے علاوہ اس ناول میں جنس اور سیکس پولیوشن کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔انیل جو ناول کا مرکزی کردار ہے سیکس اور جرائم کی کہانیوں میں بڑی دلچسپی لیتا ہے۔ان کی بیوی کا نام آشا بھان ہے۔ان اپنے دو بچوں نرملا اور نریش کے ساتھ ہنسی خوشی رہتے ہیں کہ ہجرت کا سانحہ پیش آتا ہے۔ان کا ہمسایہ اور دوست میر اسلم کو ہجرت کرنے سے منع کرتا ہے۔ایسے میں انیل رینہ وادی میں رہنے کا فیصلہ کرتا ہے۔آگے چل کر اسے اپنے اس فیصلہ پر فخر محسوس ہوتا ہے۔

انیل اور اسلم گہرے دوست ہے۔لیکن انیل کی لڑکی میر اسلم کے بیٹے جنید کے درمیان جنسی تعلقات قائم ہوتے ہیں۔دونوں دسویں جماعت پڑھتے ہیں لیکن کم عمری میں ہی جنسی تعلقات قائم کرنے کے پیچھے ناول نگار فحش اور عریاں فلموں اور جدید ٹیکنالوجی کو گردانتے ہیں۔انیل رینہ کی بیٹی کو جب پتہ چل جاتا ہے کہ وہ حاملہ ہے تو وہ خودکشی کر لیتی ہے۔لیکن خودکشی کی وجوہات کا کسی کو بھی پتہ نہیں چلتا۔

بیٹی کے صدمہ سے نکل کر انیل رینہ کو جموں میں پولیس جیل میں ڈال دیتی ہے۔ان پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ جوانی میں جس عورت کے ساتھ محبت کرتا تھا۔اس کے شوہر کا قاتل ہے۔لیکن آگے چل کر یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ وہ قتل میں ملوث نہیں۔اس سے پہلے کہ اس سے جیل رہا سے کیا

جاتا وہ بھی خودکشی کر لیتا ہے۔

یوں یہ ناول ایک المیہ ناول ہے جو کرداروں کی ناکامی پر ختم ہوتا ہے۔ ناول کی کہانی اول سے آ کر تک قاری کو اپنی پکڑ میں رکھتی ہے۔ ناول میں تجسس کی کارفرمائی نہاہت عمدہ ہے۔ ناول کی کہانی دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقی واقعات پر مبنی ہے۔ موجودہ زمانے میں جنس کی لعنت میں گرفتار مرد اور عورت سماج کے لیے ناسور بنتے جا رہے ہیں۔ انٹرنٹ اور ٹی۔ وی کیا انسانی زندگی پر برے اثرات کے نتائج کو ناول نگار نے بڑی خوبصورتی سے بیان کرنے کو کوشش کی ہے اور وہ اس کوشش میں کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ ناول کے انتساب سے بھی اچھی طرح ہوتا ہے۔ ناول کے انتساب میں شبنم قیوم لکھتے ہیں:

> ''ان اداروں اور احباب کے نام جو دولت کمانے کے نشے میں عورت کو عریاں کر رہے ہیں۔ ان خواتین کے نام جو دولت اور شہرت کے لیے ننگی ہو رہی ہے۔ عزت اور عصمت لٹانے کو ضرورت سمجھتی ہیں۔ ان والدین کے نام جو اپنی اولاد کے بارے میں لاپرواہ کر ان کے بھٹکنے کا موقعہ فراہم کرتے ہیں۔'' [۱۶]

اس ناول میں ناول نگار شبنم قیوم نے شعور کی رو کی تکنیک کا بھرپور اور خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ ناول کے کئی کردار اپنے ماضی کی بازیافت کرتے ہوئے باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار انیل رینہ کئی بار اپنے ماضی کو یاد کرتا ہے۔ ناول نگار نے یہاں انیل کے ماضی کی بازیافت کی خاطر شعور کی رو کا سہارا لیا ہے جو قابل ستائش ہے۔

گو ہم کہہ سکتے ہیں کہ شبنم قیوم کا یہ ناول سیاسی اور معاشرتی مسائل کا احاطہ کرتا ہے۔ کشمیر میں سیاسی حالات کو تاریخی تناظر میں دیکھنے کو کوشش ہے۔ اس کے ساتھ ہی کشمیریوں کے ساتھ جو دھوکہ دہی ۱۹۴۷ء سے ہو رہی ہے اس کو بھی منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ۱۹۹۰ء کے بعد سے

کشمیری پنڈتوں کی ہجرت کا بھی احاطہ کرتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس ناول میں موجودہ حالات میں ٹکنالوجی کے برے اثرات کا بھی بڑی خوبصورتی سے احاطہ کیا گیا ہے۔

فاروق رینزو

فاروق رینزو یکم اپریل ۱۹۵۵ءکوسری نگر میں پیدا ہوئے۔انہوں نے ۱۹۷۵ء میں ایس۔ پی کالج سری نگر سے گریجویشن کی۔ان کا ادبی سفر یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ایس۔پی کالج سے پرتاب میگزین نکلتا ہے۔ فاروق رینزو اس میگزین کے ایڈیٹر رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اسٹوڈنٹ پولیٹکس میں کافی سرگرم تھے۔۱۹۷۶ء میں انہوں نے کشمیر یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کے لیے قدم رکھا۔ یہاں انہوں نے اپنا ادبی سفر جاری رکھتے ہوئے ایک ڈرامہ'رات ایک دور' کے عنوان سے تحریر کیا۔ یہ ڈراما کافی پسند کیا گیا اور فاروق رینزو کی حوصلہ افزائی میں اس ڈرامے نے خاص رول ادا کیا۔

یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد فاروق رینزو نے سرکاری ملازمت اختیار کی۔انہوں نے ملازمت کے دوران ترقی کے کئی زینے بڑی تیزی سے طئے کئے۔وہ کشمیر کی ایڈمنسٹریٹو سروس میں آنے کے بعد اہم عہدوں پر تعینات رہے۔انہوں نے اردو زبان وادب کے ساتھ ساتھ اپنی مادری زبان کشمیری میں طبع آزمائی کی۔لیکن اردو زبان وادب سے انہیں خاصی دلچسپی اور لگاؤ تھا۔ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کی ترقی کے لیے وہ ہمیشہ آگے رہتے ہیں۔

باضابطہ طور پر فاروق رینزو نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانے سے کیا۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''ڈوبتے کنارے'' ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔اس کے بعد انہوں نے اردو ناول کی دنیا میں قدم رکھا۔ان کا پہلا ناول ''زخموں کی سالگرہ'' ہے۔یہ ناول ۱۹۸۲ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ان کا دوسرا اہم

ناول ''کشمیر جھیل جلتی ہے'' ہے۔ یہ ناول ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ اگلے صفحات میں فاروق رینزو کی ناول نگاری کا تجزیہ ان ہی دو ناولوں کے تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

''زخموں کی سالگرہ'' فاروق رینزو کا پہلا ناول ہے۔ ۱۸۸ صفحات پر مشتمل یہ ناول ایمنٹی انٹرنیشنل کلب برانچ سرینگر کی وساطت سے ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ ناول کے آغاز میں شیخ عبداللہ اور بیگم شیخ عبداللہ کے تاثرات ''پیغام'' کے عنوان سے درج ہے۔ دونوں نے فاروق رینزو کی فنی صلاحیتوں اور اردو ادب سے ان کی دلچسپی کو سراہا ہے۔ ''حرف اول'' کے عنوان سے مظہر امام کے تاثرات درج ہیں۔ مظہر امام اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''زخموں کی سالگرہ' فاروق رینزو کا پہلا ناول ہے۔ لیکن اس کے وسیع کینوا س کو انہوں نے جس طرح اپنے دائرہ اظہار میں سمیٹا ہے، اس کے لیے وہ ہر طرح داد وتوصیف کے مستحق ہیں۔ ناول کا عنوان خوبصورت ہی نہیں معنی خیز بھی ہے اور ناول کے موضوع سے پوری مطابقت بھی رکھتا ہے۔'' [۱۷]

اس ناول کا موضوع طلبہ کی بے چینی اور اضطراب ہے جو موجودہ دور کا اہم مسئلہ بن گیا ہے۔ طالب علموں میں انتشار، اضطراب اور اضطرار کی لے تیز ہوتی جارہی ہے۔ طالب علم دن بہ دن مایوسی کا شکار ہوتے جارہے ہیں۔ اس انتشار، مایوسی اور ناامیدی کی کئی وجوہات ہیں۔ موجودہ زمانے میں ٹوٹتی ہوئی انسانی قدریں اور ہماری زندگی کی پیچیدگیاں ایک وجہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک دوسرے پر بازی اور سبقت لے جانے کے جائز و ناجائز طریقہ کار بھی اس مایوسی اور افراتفری کی وجوہات میں شامل ہیں۔ فاروق رینزو نے اس ناول میں معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں اور بدعنوانیوں کو حدفِ تنقید بنایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جہاں کہیں پر بھی روشن پہلو آتے ہیں تو ان کا ذکر بھی بڑی خوبصورتی اور بے باکی سے کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ تعلیم و تدریس کے اداروں میں افراتفری کا

ماحول پیدا کرنے میں سیاست کی عملداری کا پہلو بھی اس ناول میں ملتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ رومان کی جولانیاں بھی اس ناول میں دیکھی جا سکتی ہے۔کئی رومان پروان چڑھتے اور بکھر جاتے ہیں۔رومانی مناظر کو ابھارنا اوران سے لذت حاصل کرنا ناول نگار کا مدعا نہیں ہے بلکہ قصے کے لوازمات کے طرز پرانھیں پیش کیا ہے۔

فاروق رینزو نے کشمیر یونیورسٹی میں پڑھائی کے دوران ان حالات کا مقابلہ خود کیا تھا۔وہ اسٹوڈنٹ پولیٹکس میں کافی دلچسپی لیتے تھے۔انہوں نے کشمیر یونیورسٹی میں رہ کر خود اس بات کا مشاہدہ کیا کہ کس طرح ریاست کی سیاسی جماعتیں یہاں کے معاملات میں دخل دیتی ہے۔اس کے ساتھ ہی وہ یونیورسٹی میں زیرِتعلیم طلبا کی ذہنی تربیت بھی کرتے ہیں۔بقول مظہر امام کہ انہوں نے ناول میں طالب علموں کے اضطراب کو ایک تعمیری سمت عطا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ہر چند کہ ناول پر اصلاحی پہلو غالب ہے۔اس کے ساتھ ہی مصنف نے فنی لوازمات کا دامن کہیں نہیں چھوڑا۔

جیسا کہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ ناول میں طلبہ وطالبات کے استحصال کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ناول کے اکثر واقعات ناول نگار کی زندگی سے مطابقت رکھتے ہیں۔ناول کا تعارف اردو زبان وادب کے اہم جمالیاتی ناقد پروفیسر شکیل الرحمان نے لکھا ہے۔شکیل الرحمان لکھتے ہیں کہ ''زخموں کی سالگرہ'' کشمیر کے ایک نوجوان فن کار کا کافی عمدہ ناول ہے۔فاورق رینزو نے اس ناول میں تعلیمی اداروں میں طلبہ وطالبات کے استحصال کی نقاب کشائی کی ہے۔موضوع بہت حد تک نیا اور تازہ ہے اور اکثر واقعات خود فاروق رینزو کے تجربوں کا حصہ ہے۔

تعلیمی اداروں میں ایسے بہت سارے اساتذہ اور طلبا ہر وقت موجود رہتے ہیں جو اپنی اعلی

اقدار کو عزیز رکھتے ہیں۔ ان کے سامنے بادِمخالف بھی ہو تب وہ اپنی اقدار کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ کبھی کبھار سیاسی مقاصد کے لیے تعلیمی اداروں اور طلبا کو استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ حالات آج بھی جاری و ساری ہے۔ ملک کی مختلف یونیورسٹیوں کے طلبا کو فسادات اور تشدد کے لیے اکسایا جاتا ہے تاکہ کچھ سیاسی مقاصد کی حصول یابی ممکن ہو سکے۔

فاروق ریزو نے یونیورسٹی کے ماحول کو خود بھی دیکھا اور اس کا مشاہدہ کیا۔ یہ ناول ان کے ان ہی تجربات پر مبنی ہے۔ اگرچہ کہانی میں کہیں کہیں اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔ کئی واقعات فلمی دنیا سے مستعار لیے گئے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر ناول کے کہانی اور واقعات حقیقت پر مبنی ہے۔

ناول کی کہانی کشمیر یونیورسٹی کے پس منظر میں بیان کی گئی ہے۔ احمد اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ اس کردار میں ہمیں وہ سب کچھ نظر آتا ہے جو اسے اس ناول کا ہیرو بنانے کے لیے کافی ہے۔ وہ کافی ذہین ہے۔ سیاست اور دوسرے معاملات میں کافی دلچسپی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ پہلے پہل وہ محبت کو فضول اور لغو سمجھتا ہے لیکن ناول کے آخر تک آتے آتے محبت کی چنگاری اس کے دل کو بھسم کر دیتی ہے۔ اس کی کردار نگاری سے متعلق ایک اقتباس دیکھئے:

> ''وہ ایک خوبصورت صحت مند نوجوان تھا۔ اس کا قد لمبا اور چھاتی چوڑی تھی۔ اس کے روشن ماتھے پر کالے بکھرے حسین بالوں نے اس کی شخصیت کو پرکشش بنا دیا تھا۔ یونیورسٹی کے اکثر لڑکے احمد کو رشک بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اس کے مضبوط کردار اور اس کی غیر معمولی قابلیت نے اس کو یونیورسٹی کے مباحثے ہوں، کھیل ہوں یا امتحانات، پہلی پوزیشن احمد کی ہی ہوتی ہے۔ ایک بہترین طالب علم ہونے کے علاوہ احمد ایک بہترین اسٹوڈنٹ لیڈر بھی تھا۔'' ۱۸

ناول کی شروعات ایک ہنگامے سے ہوتی ہے۔ یہ ہنگامہ حمید، خورشید اور پیارے لال کی شہہ

پر وی۔سی آفس کے سامنے اس بات کا مطالبہ کرر ہے ہیں کہ انہیں امتحانات میں نقل کرنے کی اجازت دی جائے۔امتحانات میں کوئی زوراور زبردستی نہ ہو۔ان طلبا کے اندر کہیں نہ کہیں یہ ڈر بھی ہے کہ ڈگریاں لینے کے باوجود بھی آج کے زمانے میں نوکری نہیں ملتی۔یہاں پر ناول نگار یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ زمانے میں طلبا کے اندر یہ ڈر بھی موجود ہے کہ کہیں وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بھی بے کار نہ رہیں۔ناول سے ایک اقتباس:

''احمد۔تم آج ہمیں الفاظ کی جادوگری سے چپ نہیں کرا سکتے۔ہم نقل کر کے نہایت ہی آسانی کے ساتھ ڈگریاں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ہم ڈگریاں حاصل کرنے لے لیے محنت کیوں کریں۔کیا ملتا ہے کسی کو ڈگری حاصل کر کے۔کون پوچھتا ہے آج ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگریوں کو۔ڈگری حاصل کر کے کونسی نوکری ملتی ہے۔ہم جانتے ہیں کہ بازار میں یہ کھوٹی ڈگریاں نہیں بکتی۔اس لیے ان کو حاصل کرنے کے لیے ہم خوامخواہ آنکھوں کی روشنی کیوں جلائیں۔'' 19

طلبا کے اندر کے ڈر اور مایوسی کا فائدہ سیاسی لوگ بھر پور طریقے سے اٹھاتے ہیں۔وہ ان کے ہاتھوں کا آلا بن جاتے ہیں۔خورشید،حمید اور پیارے لال کا اصل میں سیاسی رہنماؤں کی شہہ پر یہاں کے امن پسند ماحول کو خراب کرنا چاہتے ہیں تا کہ یہاں سے یہ چنگاری پوری ریاست کو اپنی میں لپیٹ میں لے کر حکومت گر سکے۔تا کہ پھر سے انتخابات کرا کرا پنی حکومت بنا سکیں۔اس ساری کاروائی کو انجام دینے کے لیے سیاسی لوگ پانی کی طرح پیسا خرچ کرر ہے ہیں۔

لیکن احمد،الفت اور شبنم کی دانش مندی سے یہ ساری چالیں ناکام ہو جاتی ہیں۔ناول میں جو سیاسی ورکر ہیں وہ اس ساری کاروائی کو انجام دیتے ہیں ان میں شبنم کا باپ مبشر ریاض سب سے آگے ہے۔شبنم پولیس کے سامنے اس بات کا انکشاف کرتی ہے کہ اس ساری کاروائی میں ان کے والد کا

ہاتھ ہے۔ وہ غریب طالبِ علموں کو بہلا پھسلا کر یونیورسٹی کے حالات خراب کرنے کے اصل ذمہ دار ہے۔

> ''ہاں ڈیڈی۔ میں تمہاری سازشیں برداشت نہ کرسکی۔ میں یہ برداشت نہ کرسکی کہ میرا باپ شہر کے ہزاروں لوگوں کا خون بہائے اور میں تماشہ دیکھتی رہوں۔ ڈیڈی میں یونیورسٹی میں ان نیچ اور غنڈوں کی مذمت کر کے تھکتی بھی نہ تھی جو وہاں کا امن درہم برہم کرتے تھے۔ لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ میرا ہی باپ ان لڑکوں کو ایسا کرنے کے لیے پیسے دیتا ہے تو میرا سر شرم سے جھک گیا۔ میں نے تمہیں گرفتار کروایا ڈیڈی۔'' ۲۰

ناول میں احمد کے علاوہ الفت کافی اہمیت کا حامل نسوانی کردار ہے۔ الفت میں بھی وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک ناول کی ہیروین میں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ وہ یونیورسٹی میں قانون میں ایم۔اے کر رہی ہے۔ وہ اپنے والد دلاور خان کی چہتی بیٹی ہے۔ دلاور خان کا شمار کسی زمانے میں شہر کے رئیس لوگوں میں ہوتا تھا۔ ملک بھر میں ابھی بھی لڑکیوں کی پیدائش کو منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ ناول نگار نے اس مسئلے کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ دلاور خان کی یہاں جب اس کی دوسری بیٹی جنم لیتی ہے تو اس کے ماتھے پر شکن پڑھ جاتی ہے۔ ناول سے ایک اقتباس:

> ''اسی دوران اس کی شادی بھی ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ ہوگئی۔ دلاور خان کو اپنی بیوی کے ساتھ حقیقی پیار ہوگیا۔ وہ اس دن بہت خوش ہوا۔ جب اس کی بیوی پہلی بار حاملہ ہوگئی۔ اسے یقین تھا کہ وہ ایک لڑکے کا باپ بن جائے گا۔ لیکن اس وقت اسے بہت تکلیف ہوئی جب اس کی بیوی نے ایک لڑکی کو جنم دیا۔ ولاور خان کو لگا جیسے کسی نے اس کو گالی دی ہو۔ دلاور خان نے اگرچہ اپنی بیوی سے کچھ نہ کہا پھر بھی اس کی پیشانی کی لکیریں اس کے غصے کا اظہار کر رہی

تھیں۔''۲۱

لیکن جب دلاور خان کی بیوی کا انتقال ہو جاتی ہے تو وہ بے سہارا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ساری توجہ اپنی بیٹی پر مرکوز کرتا ہے۔ ان کی بیٹی بھی آگے چل کر ایسے کام کرتی ہے کہ دلاور خان کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے۔

الفت اور احمد اس ناول کے مرکزی کردار ہے۔ الفت کا والد دلاور خان ان کے رشتہ یار محمد سے طئے کرا چکا ہے۔ لاور خان پر یاور محمد کے اتنے احسانات ہیں کہ وہ یہ رشتہ ہنسی خوشی قبول کر لیتا ہے۔ لیکن یونیورسٹی میں جب احمد اور الفت کی ملاقات ہو جاتی ہے تو دونوں ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہنے لگتے ہیں۔ لیکن الفت اپنے خاندان اور مذہب کا لحاظ رکھتے ہوئے احمد کو سمجھاتی ہے کہ وہ سماج اور مذہب کے بنائے ہوئے قوانین توڑ نہیں سکتے۔ اسی طرح احمد بھی سماجی اقدار کا پاس ولحاظ کا حیال رکھنے والا ہے۔ ناول میں کئی بار ایسے مواقع آتے ہیں جہاں پر ان کے بھٹکنے کے واقع آتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں ہر آزمائش میں کھرے اترتے ہیں۔ احمد کی ان باتوں کا الفت پر کافی اثر ہوتا ہے:

> ''محبت کا انجام صرف شادی نہیں بلکہ شادی تو محبت کے سینے میں زہریلا خنجر گھونپنے کے مترادف ہے۔ شادی تو محبت کی ہار ہے۔ جو ہارتے ہیں وہ محبت نہیں کرتے۔ ہیر رانجھا سوہنی مہیوال، لیلیٰ مجنون اور وامقؔ عذرا کے قصے محبت کی سچی داستانیں ہیں کیونکہ اس دنیا میں ان میں سے کسی کا ملن نہ ہو سکا۔'' ۲۲

مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فاروق ریزو کا ناول 'زخموں کی سالگرہ' ایک کامیاب ناول ہے۔ اس میں وہ ساری چیزیں پائی جاتی ہے جو ایک ناول کے لیے ضروری خیال کی جاتی ہے۔ یہ ناول اگر چہ اصلاحی رنگ میں ڈوبی ہے لیکن پھر بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہمارے نوجوانوں کے لیے نہ صرف مفید بلکہ ایک رہنما بھی ہے۔

''کشمیر جھیل جلتی ہے'' فاروق رینزو ایک دوسرا ناول ہے۔اس ناول میں مصنف نے اپنے قلم اور وسیع مشاہدے کا لوہا منوایا ہے۔اس ناول میں کئی ایک موضوعات اور کہانیاں ایک ساتھ چلتی ہے۔ بہت ساری چھوٹی اور بڑی کہانیوں کو ناول میں پرونا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ فاروق رینزو کے اندر ایک اچھے اور بہترین ناول نگار کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہے اس لیے وہ یہاں بھی کامیاب نظر آتے ہیں۔

''کشمیر جھیل جلتی ہے'' فاروق رینزو کا تعمیری اور سماجی ناول ہے۔۱۶۵ صفحات اور چودہ ابواب پر پھیلا ہوا یہ ناول ویلی بک ہاؤس، سری نگر سے ۱۹۹۶ء میں پہلی بار چھپ کر شائع ہوا۔مصنف نے اس ناول کے ذریعے سرزمینِ کشمیر میں پروان چڑھ رہی بدعنوانیوں، لاقانونیت اور بدحالی کی تصویر دکھانے کی کوشش کی ہے۔ پولیس اور سیاست دانوں کی ملی بھگت سے جرائم پیشے لوگوں کے بڑھتے ہوئے دھندے کو بھی اس ناول میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں ۱۹۸۰ء کے بعد سے برابر حالات خراب ہے۔ یہاں پر سیاست اور پولیس کی پشت پنہائی سے شریف لوگ بھی کمینے پن کو گلے لگانا چاہتے ہیں۔ یہ سماج کے لیے ایک ناسور بنتا جارہا ہے اور ان ہی مسائل کو ناول نگار نے ناول میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ناول میں کئی کردار ایسے ہیں جو حالات کو دیکھ کر شرافت کا لباس اتار کر کمینے اور ڈاکو بن جاتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی ناول نگار نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ایک عام آدمی دولت کے نشے آ کر سماج کو تباہ و برباد کرتا ہے۔اس ناول کے بارے میں منصور احمد منصور اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کشمیر جھیل جلتی ہے' ان (فاروق رینزو) کا تازہ ترین ناول ہے۔ یہ ایک سماجی

اور اصلاحی ناول ہے جس میں مصنف نے فریب، ریا، لالچ اور بے چہرگی کے
مکروہ پہلو خاص طور سے ابھارے ہیں۔اس ناول میں مصنف کے لب و لہجے
میں زبردست تلخی گھلی ہوئی ہے۔'' ۲۳؎

''کشمیر جھیل جلتی ہے'' کے تمام کردار سرِ زمین کشمیر سے تعلق رکھتے ہیں۔ جنہیں مصنف نے کمالِ فن کاری سے ابھارا ہے اور اپنے گرد وپیش کے ماحول میں اس خطہ ارض کے المیوں کو اپنے حقیقی روپ میں پیش کیا ہے۔ یہ ناول ایک تہذیب کا مطالعہ ہے۔ مصنف نے اپنے قلم کی نوک سے فریب اور ریا کاری کی دبیز تہوں کے نیچے پنہاں معاشرے کے گھناونے چہرے سے نقاب اتارنے کی کوشش کی ہے۔

ناول نے نگار نے زوال آمادہ معاشرے کے اعمالیوں اور سیاہ کاریوں کا مختلف جہتوں اور کیفیتوں سے محاسبہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ پیشکش کے انداز میں وہی بغاوت کا بانکپن ہے جو ''زخموں کی سالگرہ'' میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ لیکن اس ناول میں ترسیل و ابلاغ کا بیاں قدرے تلخ ہے۔ تیر ونشتر کی طرح کاٹتا ہوا لہجہ معاشرے کی مصوری کرتا ہے۔ اس ناول میں بعض اونچے محل کہیں کہیں بہت نیچے نظر آتے ہیں۔ نیچی جھونپڑیاں کہیں کہیں بہت بلند نظر آتی ہیں۔ یہاں زندگی اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ برہنہ نظر آتی ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو ناول لکھنے والوں کو جہاں فن کی کسوٹی پر کھرا اترنا پڑتا ہے وہاں انہیں اپنی زبان سے بھی لوہا منوالینا پڑتا ہے۔ یہ بات اطمینان بخش ہے کہ فاروق ریزو نے اپنے ناولوں میں زبان میں مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ خاص کر اس ناول کی زبان سلیس اور رواں ہے۔ انہوں نے نہایت مہارت اور مشاقی سے نثر کی شگفتگی کو برقرار رکھا ہے۔

ناول کی کہانی جمال کے اردگرد گھومتی ہے۔ جمال جو ایک جوشیلا لیکن ذہین نوجوان ہے۔ جس کے اندر وہ تمام خصوصیات موجود ہے جو ایک ناول کے ہیرو لے لیے لازمی تصور کی جاتی ہے۔ جمال، ثریا کی محبت میں گرفتار ہے۔ جمال اور ثریا بچپن سے ایک ساتھ پلے بڑے ہیں۔ دونوں کے حالات ایک جیسے تھے۔ مثال کے طور پر ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''جمال اور ثریا ایک ساتھ پلے بڑے تھے۔ دونوں بچپن میں مولوی صاحب کے پاس قرآن شریف کی تلاوت سیکھنے جاتے تھے۔ دونوں کو ایک ہی سرکاری اسکول میں داخل کیا گیا۔ دونوں کی کہانی ایک جیسی تھی۔ جمال کا باپ اس کے پیدا ہونے سے صرف ایک مہینے پہلے ایک حادثے میں مر گیا تھا جبکہ ثریا بالکل یتیم لڑکی تھی۔ اس کی پرورش اس کا چچا خضر کھانڈے کر رہا تھا۔ جمال کی ماں جمال کی پرورش کرتے کرتے لاغر اور کمزور ہوگئی تھی۔ اس نے جمال کی خوشیوں کے لیے اپنی جوانی داؤ پر لگائی۔ جبکہ ثریا کی پرورش پر اس کا چچا زیادہ دھیان نہیں دیتا تھا۔'' ۲۴

جمال اگرچہ غریب ہے لیکن اس کے اندر محبت کے جذبات پاک ہے۔ وہ ثریا کو دل و جان سے چاہتا ہے۔ ثریا کے لیے دنیا کی کسی بھی طاقت سے لڑنے لے لیے تیار ہے۔ لیکن دوسری طرف ثریا مال و دولت کو ہی اصل شئے سمجھتی ہے۔ وہ اس مال و دولت اور جاہ وحشمت کی خاطر پچاس سالہ بوڑھے سلام سے شادی کر لیتی ہے۔ ثریا سچی محبت کو ٹھکرا دیتی ہے۔ وہ سلام کی بیوی بن کر عالیشان بنگلے میں تو رہنے لگتی ہے لیکن محبت کے لیے وہ ہمیشہ ترستی رہتی ہے۔ ثریا جاہ وحشمت کی خاطر اپنے دل کی آواز پر کبھی غور نہیں کرتی۔ اس کردار سے متعلق ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''ثریا۔ سلام کے تحفے قبول کر کے تم جمال کی محبت کے ساتھ دھوکہ کر رہی ہو۔ سلام کا مقصد کچھ اور ہے۔ ثریا کا ضمیر کئی بار چیخ اٹھا تھا لیکن ثریا نے ہر بار ضمیر کی

آواز کا گلا گھونٹ دیا۔ثریا کوسلام کی دولت میں اس کی شان وشوکت میں اپنے
حسین خواب دکھائی دے رہے تھے۔'' ۲۵

جمال محبت میں ناکامی کے ساتھ ہی شرافت کا لبادہ پھینک دیتا ہے۔ وہ دولت حاصل کرنے کے لیے جائز و ناجائز طریقے استعمال کرتا ہے۔جلد ہی اس کا شمار شہر کے اثر ورسوخ لوگوں میں ہوتا ہے۔ ہرکوئی جمال کے نام سے ڈرتا ہے۔لیکن جمال کے اندر ابھی بھی انسانیت باقی ہے۔ وہ دولت صرف اس لیے حاصل کرتا ہے تا کہ ثریا کو اپنی غلطی کا احساس ہو کہ دنیا میں دولت جمع کرنا کوئی بڑی بات نہیں لیکن سچی محبت بہت کم ہی ملتی ہے۔ جمال کی کہانی کے ساتھ ساتھ اس ناول میں اور بھی کئی کہانیاں چلتی ہے۔رشید کون تھا اس بارے میں ناول سے ایک اقتباس:

''ہاں بیٹے آج سے بالکل چودہ سال پہلے کی بات ہے کہ میرے مالک ڈاکٹر جیلانی کی کنواری بیٹی شبنم اچانک حاملہ ہوگئی۔ یہ بات اس کے ماں باپ کو اس وقت معلوم ہوئی جب وہ تمہیں شبنم کی کوکھ میں مارنہیں سکتے تھے۔ کیونکہ وہ وقت گذر چکا تھا۔۔۔ میں اور میری بیوی اولاد کے لیے ترس رہے تھے۔ جب شبنم نے تم کو جنم دیا میری بیوی اس کی آیا تھی۔ اسی نے تمہیں نہلا کر تولیہ میں لپیٹ لیا۔میری بیوی تمہیں نیم مردہ حالت میں چپ کے سے اپنے گھر لے آئی۔شبنم کو اور اس کے ماں باپ کو اب تک یہی معلوم ہے کہ ہم نے تمہاری لاش دریا میں پھینک دی۔'' ۲۶

رشید اور سلیمہ کی کہانی بھی اس ناول کی جان ہے۔ یہاں پر ناول نگار نے ایک عورت کا دوسرا روپ دکھانے کی کوشش ہے۔سلیمہ کافی خوبصورت اور امیر خاندان سے تعلق رکھتی ہے جبکہ رشید ناجائز باپ کی اولاد ہے۔ یہ سب جاننے کے باوجود سلیمہ رشید کو دل و جان سے چاہتی ہے۔ وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر رشید کی ہونا چاہتی ہے۔لیکن یہاں پر دولت اور عزت درمیان میں آجاتی ہے۔سلیمہ کا باپ

اس رشتے کے خلاف ہے کیونکہ وہ سلیمہ کی شادی اپنی برابری کے کسی خاندان میں کرانا چاہتا ہے۔

ناول میں کئی اور واقعات ہیں جو بڑی بے باکی اور خوبصورتی سے پیش کیے گئے ہیں۔ناول نگار کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان مختلف واقعات کو ایک دوسرے کے ساتھ بڑی مہارت سے پیوست کرنے کی کوشش کی ہے۔گو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناول کا پلاٹ کافی مضبوط ہے مگر واقعات کی پیچیدگی کی وجہ سے کہیں کہیں جھول پیدا ہو گیا ہے۔ساتھ ہی ناول کی زبان کافی رواں اور ناول کے واقعات اور کرداروں سے مناسبت رکھتی ہے۔مکالمے زیادہ طویل ہیں۔ناول نگار نے کرداروں کی نفسیات کو سامنے لانے کے لیے شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال بھی کیا ہے۔

کردار نگاری کے اصولوں پر بھی یہ ناول کامیاب نظر آتا ہے۔اہم اور غیر اہم کردار اپنی اپنی انفرادیت لیے ہوئے ہیں۔جمال ناول کا مرکزی کردار ہے۔وہ آج کے جوشیلے نوجوان کی تصویر ہے جس نے بغاوت اور انتقام کی آگ میں خود کو مٹا دیا ہے۔جمال نے قتل وخون کے ساتھ کچھ نیک کام بھی کئے ہیں۔اس طرح ناول نگار نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ بری سیرت سب کے لیے بری نہیں ہوتی۔انسان وقت اور حالات کے تقاضے کے تحت بنتا اور بگڑتا ہے۔ناول کا اختتام جمال کی موت اور رشید اور سلیمہ کی شادی پر ہوتا ہے۔ناول سے ایک اقتباس:

> ''عدالت نے ثریا کو بری کر دیا۔ جمال کے ثبوتوں نے تہلکہ مچایا۔شہر کے اہم لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔ جمال کو باضابطہ سلام کے قتل میں ملوث پایا گیا۔ اسے سزائے موت دی گئی۔ جمال نے محبت کو امر کر دیا۔ رشید اور سلیمہ ہر صبح جمال کی قبر پر حاضری دے کر محبت اور عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں۔'' ۲۷

جمال کے ساتھ ہی رشید اور نسوانی کرداروں میں ثریا اور سلیمہ بھی اہمیت کے حامل ہے۔مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس ناول کو لکھنے میں ناول نگار نے فنی بصیرت سے کام لیا ہے۔زبان و بیان

کی سادگی، مناسب مکالموں کی پیش کشی اور مناظر کی دلکش تصویر کشی کی بدولت یہ ناول عصر حاضر کے ناولوں میں اہمیت رکھتا ہے۔

غرض ۱۹۸۰ء سے تاحال جتنے ناول لکھے گئے ہیں ان کے مطالعے سے یہی اندازہ ہے کہ یہاں کے ناول نگاروں نے کشمیر کی معاشرتی زندگی کے بعض اہم اور سلگتے ہوئے مسائل کو موضوع بنا کر کئی ایک ناول لکھے گئے ہیں۔

آج کی نسل جس راہ روی کا شکار ہو رہی ہے اس کی بڑی اچھی تصویر اس عہد کے ناول نگاروں کے یہاں ملتی ہے۔ مناظر کی پیش کشی، واقعات کی دلکش تصویر کشی کی بدولت بھی اس عہد کے ناول اہمیت رکھتے ہیں۔ کردار نگاری، مکالمہ نگاری اور اسلوب پر بھی اس عہد کے ناولوں میں توجہ دی گئی ہے۔ خصوصاً تکنیک کے تجربے میں ہمیں اس عہد کے ناولوں میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً فلش بیک کی تکنیک، خود کلامی کی تکنیک اور شعور کی رو کی تکنیک کے ذریعے واقعات کو پر اثر بنانے کی کوشش اس عہد کے بعض اہم قلم کاروں نے کی ہے۔

غرض جموں و کشمیر میں اردو ناول نے عہد بہ عہد ہو رہی تبدیلیوں کے اثرات قبول کئے۔ موضوعات کے اعتبار سے بھی اور زبان و بیان اور تکنیک کے اعتبار سے بھی ان کے یہاں ترقی نظر آتی ہے۔

حوالے:

۱: جیوتیشور پتھک، ہجوم، ص ۱۶۵
۲: ایضاً، ص ۱۵۸
۳: جیوتیشور پتھک، میلی عورت، ص ۵۷
۴: ایضاً، ص ۱۱۰
۵: ایضاً، ص ۵
۶: ترنم ریاض، مورتی، ص ۲۹
۷: ایضاً، ص ۳۲
۸: ایضاً، ص ۸
۹: ترنم ریاض، برف آشنا پرندے، ص ۲۷۳
۱۰: نعیمہ احمد مہجور، دہشت زادی، سرورق
۱۱: ایضاً، ص ۳
۱۲: ایضاً، ص ۱۲
۱۳: شبنم قیوم، پچھتاوا، ص ۴
۱۴: ایضاً، ص ۲۷
۱۵: ایضاً، ص ۸۹
۱۶: ایضاً، ص ۱۶
۱۷: فاروق رینزو، زخموں کی سالگرہ، حرفِ اول
۱۸: ایضاً، ص ۱۸
۱۹: ایضاً، ص ۱۸
۲۰: ایضاً، ص ۱۵۷
۲۱: ایضاً، ص ۳۷
۲۲: ایضاً، ص ۱۷۲
۲۳: شیرازہ، ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب کے پچاس سال، ص ۱۸۵
۲۴: فاروق رینزو، کشمیر جھیل جلتی ہے، ص ۴۱
۲۵: ایضاً، ص ۵۴
۲۶: ایضاً، ص ۲۳
۲۷: ایضاً، ص ۱۶۵

مجموعی جائزہ

ریاست جموں وکشمیر کا قیام مہاراجہ گلاب سنگھ کے دورِحکومت میں اس وقت عمل میں آیا جب ۱۶/مارچ ۱۸۴۶ء میں امرتسر معاہدے کے تحت انہوں نے انگریزوں سے جموں اور کشمیر کے صوبوں پر ۷۵ لاکھ نانک شاہی ٹکوں کے عوض حکومت کرنے کا اختیار حاصل کرلیا۔کشمیر میں سنسکرت زبان قدیم زمانے میں علمی وادبی اغراض کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہے۔ چودھویں صدی سے کشمیر میں مسلمانوں کی آمد شروع ہوتی ہے۔۔ابتدا میں یہاں آنے والے مسلمان ایران سے تعلق رکھتے تھے اوران کی زبان فارسی تھی۔اس وجہ سے یہاں سنسکرت کی جگہ فارسی نے لے لی اور بڑی تیزی سے پھیلنے لگی۔آگے چل کر فارسی زبان کی مقبولیت کے پیش نظر اسے سرکاری زبان کا درجہ ملا۔مغل اور افغان دور میں بھی فارسی زبان برابر ترقی کرتی رہی۔سکھ دور میں اگرچہ سرکاری زبان فارسی ہی رہی لیکن یہ زبان بے سہارہ ہوگئی تھی۔اس وجہ سے فارسی زبان اپنے معیار سے گرنے لگی۔

ڈوگرہ دورِحکومت کے ابتدائی سالوں میں یہاں کی سرکاری زبان فارسی ہی رہی۔انیسویں صدی میں شمالی ہندوستان میں اردو کے عروج اور فارسی کی انحطاط پذیر صورت حال کا اثر ڈوگروں کی لسانی حکمتِ عملی پر بھی پڑا۔ پرتاب سنگھ نے اردو زبان کی مقبولیت کے پیش نظر اسے سرکاری زبان کا درجہ دیا۔۱۹۵۶ء میں ریاست کا آئین منظور کیا گیا تو ریاستی قانون ساز اسمبلی نے اردو کی غیر معمولی عوامی مقبولیت کے پیش نظر اسے سرکاری زبان کا درجہ دینے کی توثیق کی۔

اردو زبان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور سرکاری زبان کا درجہ ملنے کے بعد ریاست جموں وکشمیر کے ادباءاور شعراءاردو ادب کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ جہاں تک ریاست جموں و کشمیر میں اردو ناول کا تعلق ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہاں پر اس کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ یہاں پر ناول کی با قاعدہ ابتدا ۱۹۴۷ء کے بعد ہوئی۔

ریاست جموں وکشمیر ۱۹۴۷ء کے اردو ناولوں کے اس جامع اور تفصیلی جائزے اور مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں اس صنفِ نثر نے ترقی کی کئی منزلیں طئے کی ہے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء کے درمیان لکھے جانے والے ناول تقسیم کے سانحے سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں۔اس دور کے ناول برصغیر کی تقسیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔اس دور کے ناول نگاروں راما نند ساغر، ٹھاکر پونچھی اور حامدی کاشمیری نے فن سے زیادہ موضوع پر توجہ دی ہے۔جس کے نتیجے میں اس دور کے ناول فنی اعتبار سے کسی حد تک کمزور نظر آتے ہیں۔لیکن موضوع کے اعتبار سے یہ ناول کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ چونکہ یہ عہد قتل وخون اور فسادات کا تھا اس لیے اس دور کے ناول نگاروں نے فن سے زیادہ موضوع کو اہمیت دی۔اس لیے اس عہد میں ہندو مسلم فسادات، اغواہ، عصمت ریزی، لوٹ مار اور قتل وغارت وغیرہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس دور کا سب سے اہم ناول راما نند ساگر کا ''اور انسان مر گیا ہے'' ہے۔جس میں انسان کے وحشانہ انداز اور بے مروتی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس دور کے ناول کردار نگاری کے اعتبار سے بھی اہم ہے۔خصوصاً آنند، آشا، سیٹھ کشوری لال، اوشا، کنور صاحب جیسے کرداروں میں اخلاقی اعتبار سے تبدیلی اور ترقی بھی نظر آتی ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء کے درمیان لکھے جانے والے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔اس دور میں ملک کی دیگر ریاستوں کی طرح یہاں پر بھی اس صنف نے کافی شہرت حاصل

کی اور جس کے نتیجے میں کئی اہم ناول منظر عام پر آئے۔اس دور میں لکھے جانے والے ناول ترقی پسند نظریات کی ترجمانی کرتے ہیں۔اگرچہ یہ دور ترقی پسند تحریک کے انحطاط کا زمانہ ہےلیکن کشمیر میں اس کی گونج اس دور میں بھی سنائی دیتی ہے۔فرد اور سماج کی کشمکش اور ان سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کو فنکارانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس کے علاوہ اس دور کے ناول نگاروں نے نہایت خلوص اور دیانت داری سے معاشرتی کرب و انبساط اور دکھ سکھ کو پیش کیا۔ ریاست کی بدلی ہوئی سماجی،سیاسی اور تہذیبی زندگی کی خوبصورت اور موثر آئینہ داری کی گئی ہے۔اس کے ساتھ ہی فرد کی داخلی کیفیتوں،جذباتی ردِعمل اور فطری تقاضوں کو بھی اس دور کے ناولوں میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔موضوع کے علاوہ اس عہد کے ناول نگاروں نے تکنیک میں نئے نئے تجربے کئے جیسے شعور کی رو،خود کلامی،خطوط اور ڈائری کی تکنیک۔کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کے لحاظ سے بھی اس عہد کے ناول کامیاب نظر آتے ہیں۔اس عہد کے ناولوں میں علی محمد لون کا ''شاید ہے تیری آرزو'' وجے سوری کا ''ایک ناؤ کاغذ کی'' غلام رسول سنتوش کا ''سمندر پیاسا ہے'' جان محمد آزاد کا ''کشمیر جاگ اٹھا'' اور شبنم قیوم کا ''یہ کس کا لہو،کون مرا'' شامل ہیں۔ان ناولوں میں سماجی اور معاشی مسائل کی عکاسی نمایاں طور پر ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ اس عہد کے ناولوں میں مختلف طبقات کے سماجی مسائل کو ناول نگاورں نے الگ الگ زاویہ نظر سے دیکھا اور پیش کیا۔اس دور کے ناولوں میں طبقۂ اشرفیہ اور جاگیردارانہ ماحول و معاشرت کی تصویر بھی ہے اس معاشرت میں زندگی گزارنے والے نچلے طبقے اور دیہاتوں کی سماجی اور معاشی حیثیت کی عکاسی بھی۔اس کے علاوہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام میں غریب عوام کے استحصال کی تصویر بھی ملتی ہے۔اس ضمن میں علی محمد لون کا ناول ''شاید ہے تیری آرزو''،وجے سوری کا

ناول ''ایک ناؤ کاغذ کی'' اور عمر مجید کا ناول ''یہ بستی یہ لوگ'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر کی سیاسی و سماجی تاریخ میں ۱۹۸۰ء کے بعد کا زمانہ کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس دور میں سیاسی حالات نے کروٹ بدلی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ وادی خون میں رنگ گئی۔ ۱۹۹۰ء میں مسلح تحریک شروع ہونے کے ساتھ ہی یہاں کی زندگی جغرافیائی، سیاسی، مذہبی، علاقائی، لسانی اور نفسیاتی ااعتبار سے متاثر ہوئی۔ اجتماعی اور انفرادی رشتوں کے نئے پہلو ظاہر ہوئے۔ ادیب اور فن کار بھی ذاتی طور پر متاثر ہوئے۔ پنڈتوں نے ہجرت کی۔ کشمیر کے لوگوں کا دائرہ حیات تنگ ہوگیا۔ عورتوں کی عصمت لوٹی گئی۔ بچے یتیم ہوگئے۔ عورتیں بیوہ ہوگئیں۔ گو ایک پرآشوب دور نے اس وادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ معاشی طور پر یہاں کے لوگ بے روزگاری کے دلدل میں پھنس گئے۔ ایسے میں یہاں کی زندگی اجیرن بنادی گئی۔ اس صورت حال کے نتیجے میں اس دور میں لکھے جانے والے ناولوں میں ان ہی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس عہد کے اہم ناول نگاروں میں ترنم ریاض، شبنم قیوم، نعیمہ احمد مہجور، فاروق رینز و اہمیت کے حامل ہیں۔ ان ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں کشمیری عوام پر روا رکھے جانے والے ظلم اور استحصال کو ناولوں میں پیش کرنے کی کامیاب کوششیں کی گئی ہیں۔ اس دور میں کئی اہم ناول لکھے گئے جن میں ''ہجوم''، ''برف آشنا پرندے''، ''مورتی'' اور ''کشمیر جھیل جلتی ہے'' شامل ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد ریاست جموں و کشمیر میں جتنے ناول لکھے گئے انھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ناول یہاں کے ادب کی مقبول صنفِ نثر ہے۔ یہاں کے لکھنے والوں میں سے بہت کم نے اس طرف سنجیدگی اور انہماک سے توجہ دی ہے جس کی وجہ سے یہاں کے اکثر ناولوں میں کوئی نہ کوئی فنی کمزوری پائی جاتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے کچھ ناول نگاروں کو اپنے فکر و فن کی وجہ سے بہت مقبولیت حاصل

ہوئی جن میں راما نند ساغر، علی محمد لون، غلام رسول سنتوش، نور شاہ، شبنم قیوم، ترنم ریاض اور نعیمہ احمد خصوصیت سے لیا جا سکتا ہے۔

غرض ریاست جموں وکشمیر میں لکھے جانے والے ناولوں کے تجزیئے اور مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد یہاں کے ناول نگاروں نے اپنے اپنے انداز میں ناول کے موضوع اور فن پر بھی توجہ صرف کی اور اس صنف کو زندگی کے مطالبات، مسائل اور تقاضوں کو پیش کرنے کی قوت بخشی ہے۔

اس کے علاوہ یہاں کے ناول نگاروں نے عصری میلانات اور اپنے عہد کے مسائل کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے اور نفسیاتی عوامل کو بھی بڑی فنکاری کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان ناولوں میں خارجی زندگی کے ساتھ باطنی محرکات کو بھی کرداروں کے نفسیاتی عوامل کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی۔ تخیل وتصور کی دلکشی ورنگینی اور اسلوبی کمالات سے زیادہ یہاں کے ناولوں میں عصری بصیرت، سیاسی حالات کا شعور اور سماجی معنویت نظر آتی ہے۔ غرض ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں کے ناول نگاروں نے ناول کے فن کو زندگی سے قریب کر دیا ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

ترنم ریاض	مورتی	نرالی پبلی کیشنز، نئی دہلی	۲۰۰۴ء
ترنم ریاض	برف آشنا پرندے	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی	۲۰۰۹ء
ٹھاکر پونچھی	شمع ہر رنگ میں جلتی ہے	رسالہ بیسویں صدی، دہلی	۱۹۵۶ء
ٹھاکر پونچھی	رات کے گھونگھٹ	رسالہ بیسویں صدی، دہلی	۱۹۶۰ء
ٹھاکر پونچھی	خزاں کی خوشبو	مکتبہ آشیانہ، نئی دہلی	۱۹۶۴ء
ٹھاکر پونچھی	قفس اداس ہے	مشورہ بک ڈپو، رام نگر، دہلی	
ٹھاکر پونچھی	چاندنی کے سائے	ماہنامہ بیسویں صدی، دہلی	
جان محمد آزاد	برفیلے لمحوں کا جنگل	سنگم آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	۱۹۹۵ء
جان محمد آزاد	کشمیر جاگ اٹھا	اردو مرکز، مجاہد منزل، سری نگر	
جان محمد آزاد	وادیاں بلا رہی ہے		
جیوتیشور پتھک	ہجوم	جے۔کے۔ پبلیکیشنز، سری نگر	۱۹۸۵ء
جیوتیشور پتھک	میلی عورت	جے۔کے۔ بک ہاؤس، جموں	
حامدی کاشمیری، ڈاکٹر	بہاروں میں شعلے	شاہین بکسٹال اینڈ پبلشرز، سری نگر	۱۹۵۴ء
حامدی کاشمیری، ڈاکٹر	بلندیوں کے خواب	ادارہ ادب، بہوری کدل سری نگر	۱۹۵۸ء
حامدی کاشمیری، ڈاکٹر	اجنبی راستے	شاہین بکسٹال اینڈ پبلشرز، سری نگر	۱۹۶۳ء
رامانند ساگر	اور انسان مر گیا	نو ہند پبلیشر لمیٹڈ، بمبئی	۱۹۴۸ء
زینت فردوس	نئی سحر	زمرد حسین، مگھرمل باغ، سری نگر	۱۹۷۷ء
عبدالغنی شیخ	دل ہی تو ہے		۱۹۷۸ء
عبدالغنی شیخ	وہ زمانہ		
شبنم قیوم	چراغ کا اندھیرا	کاشیانہ ادب، سری نگر	۱۹۶۹ء
شبنم قیوم	یہ کس کا لہو ہے، کون مرا	کاشیانہ ادب، سری نگر	۱۹۷۵ء
شبنم قیوم	پچھتاوا	میزان پبلشرز، سری نگر	۲۰۱۵ء
علی محمد لون	شاید ہے تیری آرزو	جے۔کے۔ بک ہاؤس، جموں توی	۱۹۶۲ء
عمر مجید	یہ بستی یہ لوگ	شاہین بک سٹال امیرا کدل، سری نگر	۱۹۷۰ء
غلام رسول سنتوش	سمندر پیاسا ہے	سنتوش، کمار گیلری نئی دہلی	۱۹۶۴ء

فاروق رینزو	زخموں کی سالگرہ	ایمنٹی انٹرنیشنل کلب،سری نگر	۱۹۸۲ء
فاروق رینزو	کشمیر جھیل جلتی ہے	ویلی بک ہاؤس،حضرت بل،سری نگر	۱۹۹۶ء
نورشاہ	پائل کے زخم	پنجابی پستک بازر، دہلی	۱۹۶۳ء
نعیمہ احمد مہجور	دہشت زادی	میزان پبلشرز،سری نگر	۲۰۱۲ء
وجے۔سوری	ایک ناؤ کاغذ کی	ہائی وجے پبلی کیشنز	۱۹۶۵ء

ثانوی ماخذ:

اشفاق محمد خان،ڈاکٹر	نذیر احمد کے ناول	ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ	۲۰۰۰ء
انور پاشا،ڈاکٹر	ترقی پسند اردو ناول	شاہین کالج،نئی دہلی	۱۹۹۰ء
انور پاشا،ڈاکٹر	ہند پاک میں اردو ناول، تقابلی مطالعہ	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس،نئی دہلی	۱۹۹۲ء
ایم۔اے۔خان	آئینہ تاریخ کشمیر	گلشن پبلیشرز،سری نگر،کشمیر	۲۰۰۲ء
برج پریمی،ڈاکٹر	جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشوونما، رچنا پبلیکیشنز،جموں		۱۹۹۲ء
پیر حسن کیھو ہامی	تاریخ کشمیر	ریسرچ ڈپارٹمنٹ لائبریری کشمیر یونیورسٹی،سری نگر	۱۹۸۵ء
پی۔جی۔رسول	مسئلہ کشمیر کی تاریخی اصلیت	علی محمد اینڈ سنز،سری نگر،کشمیر	۲۰۱۲ء
جان محمد آزاد	جموں وکشمیر کے اردو مصنفین،	جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز،سری نگر	۲۰۰۴ء
جی۔ایم۔میر	جموں وکشمیر کیم جغرافیائی حقیقتیں	مکتبہ رضوان،میرپور،آزاد کشمیر	۔
جی۔آر۔حسرت گڈہ	غلام رسول سنتوش (کشمیری)	فنکار کلچر آرگنائزیشن،سری نگر،کشمیر	۲۰۰۰ء
چمن لال،ڈاکٹر	برج بھگت پریمی کی ادبی خدمات	میزان پبلشرز،سری نگر،کشمیر	۲۰۰۸ء
حامدی کاشمیری،ڈاکٹر	ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب	شیخ محمد عثمان اینڈ سنز،سری نگر،کشمیر	۲۰۱۰ء
خالد اشرف،ڈاکٹر	برصغیر میں اردو ناول	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،	۱۹۹۴ء
		کلچر اینڈ لینگویجز،سری نگر	۲۰۰۴ء
خواجہ ثناؤاللہ بٹ	عہد نامہ کشمیر	علی محمد اینڈ سنز،سری نگر،کشمیر	۱۹۹۶ء
رؤف راحت	نورشاہ کے تین ناولٹ	میزان پبلشرز، سری نگر،کشمیر	۲۰۰۹ء
سلام سندیلوی،ڈاکٹر	ادب کا تنقیدی مطالعہ	نسیم بک ڈپو،لکھنو	۱۹۶۰ء

سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر	عزیز احمد کی ناول نگاری	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، دہلی	۱۹۸۶ء
سہیل بخاری	اردو ناول نگاری	ایس این لینگویج اکیڈمی، نئی دہلی	۲۰۰۱ء
سید علی حیدر، ڈاکٹر	اردو ناول سمت و رفتار	-	-
شاداب ظفر اعظمی	اردو ناول کے اسالیب	تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، دہلی	۲۰۰۵ء
شبنم قیوم	کشمیر کا سیاسی انقلاب	کشمیر بک ڈپو پبلشرز، سری نگر، کشمیر	۱۹۸۹ء
شہاب عنایت ملک، پروفیسر	جموں و کشمیر میں اردو زبان (ماضی، حال اور مستقبل)	سنٹر فار پروفیشنل اسٹڈیز ان اردو جموں یونیورسٹی، جموں	۲۰۱۰ء
عظیم الشان	اردو ناول: آغاز و ارتقاء ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء	دہلی ایجوکیشنل ہاؤس، نئی دہلی	۲۰۰۸ء
علی عباس حسینی	ناول کی تاریخ و تنقید	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۸۷ء
عبدالقادر سروری، پروفیسر	کشمیر میں اردو (تین جلدیں)	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر	۱۹۸۲ء
عبدالقادر سروری، پروفیسر	کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ	مجلس تحقیقات اردو، کشمیر	۱۹۶۸ء
عبدالسلام، پروفیسر	مرزا سوا اور تہذیبی ناول	اعجاز پبلیشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۸۲ء
علی احمد فاطمی، ڈاکٹر	تاریخی ناول فن و اصول	تہذیب نو پبلیشنگ الہ آباد	۱۹۸۰ء
عظیم الشان صدیقی	اردو ناول آغاز و ارتقا	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی	۲۰۰۸ء
فخر الدین صدیقی	اردو ناول میں خاندانی زندگی		
قمر رئیس، ڈاکٹر	ہم عصر اردو ناول، ایک مطالعہ	ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، نئی دہلی	۲۰۰۷ء
کے۔ کے۔ کھلر	اردو ناول کا نگار خانہ	سیمانت پرکاش، نئی دہلی،	۱۹۸۳ء
مالک رام	تذکرہ معاصرین۔ جلد۳	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۱۹۷۸ء
محی الدین قادری زور، ڈاکٹر	روداد اردو	فراش گنڈ، بڈ گام کشمیر	-
محی الدین قادر زور، کشمیری	ناول کا فن اور ارتقا	میزان پبلیشرز، سری نگر، کشمیر	۲۰۰۳ء
محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر	ادبی تخلیق اور ناول	مکتبہ اسلوب، کراچی	۱۹۶۳ء
محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر	ناول کیا ہے؟	نسیم بک ڈپو، لکھنو	۱۹۸۳ء
محمد الدین فوق	تاریخ کشمیر	کشمیر بک ڈپو، کشمیر	۱۹۱۰ء
مجید بیدار، ڈاکٹر	ناول اور متعلقاتِ ناول	نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدر آباد	۱۹۸۹ء
محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر	اردو ناول کی تنقیدی تاریخ	ادارہ فروغِ اردو، لکھنو	۱۹۵۱ء
	ماضی، حال اور مستقبل	جموں یونیورسٹی، جموں	۲۰۱۰ء
مشتاق احمد وانی، ڈاکٹر	تقسیم کے بعد اردو ناول	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۰۲ء
نگینہ جبین	اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ		

	۱۹۴۷ءاوراس کے بعد	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، دہلی	۲۰۰۰ء
وقارعظیم، ڈاکٹر	داستان سے افسانے تک	پرویز بک ڈپو، نئی دہلی	۱۹۸۰ء
وقارعظیم، ڈاکٹر	ہماری داستانیں	اعتقاد پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی	۱۹۸۰ء
ہارون ایوب	مرزا عظیم بیگ چغتائی	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی	۱۹۹۰ء
ہرگوپال خستہ	گلدستہ کشمیر	-	-
یوسف سرمست، ڈاکٹر	بیسویں صدی میں اردو ناول	نیشنل بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد	۱۹۷۳ء

رسائل و جرائد

بازیافت،سالانہ، شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی، ۲۰۰۶ء

شیرازہ، ماہنامہ، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر، کشمیر، جولائی ۱۹۹۸/ء

شیرازہ، ماہنامہ، غلام رسول سنتوش خصوصی نمبر جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر، کشمیر، اگست ۲۰۱۰/ء

شیرازہ، علی محمد لون خصوصی نمبر جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر، کشمیر، جولائی ۲۰۰۹/ء

شیرازہ، ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب کے پچاس سال، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر، کشمیر، جولائی ۱۹۹۸/ء

شیرازہ، ماہنامہ صوفیانہ موسیقی اور کشمیر، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر، کشمیر، مارچ ۱۹۹۷/ء

شیرازہ، ماہنامہ، حامدی کاشمیری خصوصی نمبر، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر، کشمیر

فکر و تحقیق، سہ ماہی، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۳

میراث، سہ ماہی، کاشیر فونڈیشن، ستمبر ۲۰۱۰/ء